دنیا بھر سے منتخب معیاری ناول

عمران ڈائجسٹ

مارچ 2020

Pakistanipoint

امتحان لیتی ہے محبت
8
ایم الیاس

محبت میں کوئی شرط نہیں ہوتی، محبت صرف کی جاتی ہے چاہے دوسرا کرے نہ کرے۔ محبت ایک ہاتھ کی تالی ہوتی ہے اس میں نہ شکوے کی گنجائش ہوتی، نہ شکایت کی، نہ وفا کی شرط، نہ بے وفائی کی۔ محبت لین دین نہیں ہوتی صرف دین دین ہوتی ہے۔ محبت ایک فطری جذبہ ہے جو قسمت والوں کو ملتا ہے۔ محبت دلوں کو گرماتی ہے۔ زندگی دیتی ہے محبت کسی کو پالینے کا نام نہیں۔ محبت امتحان لیتی ہے۔

جرم کی سیاہی
36
جاوید راہی

آج کا انسان کتنا ظالم..... کیسا جابر ہے کہ ظلم کے کوہ گراں توڑتے ہوئے یہ بھی بھول جاتا ہے کہ بے آواز کی لاٹھی چلتی ضرور ہے خواہ کسی اور رخ سے ہی سہی۔ اس ظالم و سفاک لڑکی پر بھی لاٹھی چلی ایسے انداز سے کہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔

کالے چور
62
ایم اے راحت

ایک حسینہ کا قصہ جو اپنے گروپ کے ساتھ تفریح کی غرض سے اس پہاڑی مقام پر آئی تھی۔ ایک حادثے میں ان کی گروپ لیڈر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ اس نے ایک رات اپنی ایک ساتھی کی جان بچائی تو اس پر انکشاف ہوا کہ وہ خفیہ محکمے سے تعلق رکھتی ہے اور ایک راز اپنے ہیڈ کوارٹر تک پہنچانے کے لیے اس کی مدد کی طالب ہے۔

تریاق
93
شہباز احمد

زندگی میں بعض موڑ ایسے بھی آتے ہیں کہ انسان کچھ سوچے، کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ ایک نوجوان کا قصہ جو وہ اپنی بہن سے شدید محبت کرتا تھا کیونکہ ماں باپ کے انتقال کے بعد اب وہی دونوں رہ گئے تھے۔ کالج میں اس نے اپنی کلاس فیلو سے محبت کرنے کے باوجود بہت سی باتیں پوشیدہ رکھی تھیں۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسا راز اس پر آشکار ہوا کہ وہ چونک اٹھا اور پھر اس نے ایک فیصلہ کرلیا .....!

شامت جاں
106
صدف راشد

کامیابی ذہانت سے حاصل ہوتی ہے یا نصیب سے۔ ہیروں کا ہار ایک ہی تھا لیکن اس کے دعوے دار تین لوگ تھے۔ تینوں کی کہانی مختلف تھی اور تینوں ہی جھوٹے تھے۔ ان میں سے ایک کامیاب ہوا یہ آپ فیصلہ کریں گے کہ قسمت سے ہوا یا ذہانت سے.....

سال نو
116
جمیل احمد

ایک معصوم شخص کا احوال جو ایک اسپتال میں سرجن کے طور پر کام کرتا تھا۔ وہ درحقیقت ایک سرجن تھا لیکن کسی بھی قسم کے آپریشن کے دوران اس کے ہاتھوں میں لرزش آجاتی تھی۔ نئے سال کی آمد کے جشن پر اسپتال میں اسے ایک بچی کو سنبھالنا پڑا جو زخمی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی پر اس کی کمزوری ظاہر ہو، مگر حالات کے تحت وہ مجبور تھا کہ اس کام کو انجام دے..... پھر جب اس نے ہمت باندھی تو.....؟

Pakistanipoint

زندگی ہزار رنگ
129
عاصمہ زیدی

ایک شخص کی کتھا جو خطاکار تھا۔ اس سے غلطی ہوتی تھی، وہ اپنی غلطی کی تلافی کے لیے کوشاں تھا۔ کیا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا؟ ایک لڑکی جو ایک شخص کی چکنی چپڑی باتوں کے جال میں پھنس گئی تھی۔ اب وہ اس شکاری کے جال سے نکلنا چاہتی تھی کیا وہ اس جال کو توڑ سکی؟ ایک شخص جو اپنی بربادی کا بدلہ اس شخص کی بیٹی سے لے رہا تھا جو اس کی تباہی کا ذمہ دار تھا۔ کیا وہ بدلہ لے پایا؟

گدھ
142
صادق ہدایت

ہمارے اردگرد کی کہانی۔ ایران کے معروف ادیب صادق ہدایت نے اس تحریر میں انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ انہوں نے ایک ایسے گھر کی روداد بیان کی ہے جہاں ایک شخص کے مرنے پر گھر میں کہرام بپا ہے اور اس سے تعلق رکھنے والا ہر شخص اس کے ترکے کو ہڑپ کرنے کے چکر میں ہے۔

اپنی گرفتاری
160
عابد علی

ایک پولیس والا ہر شخص سے کسی کے بارے میں دریافت کررہا تھا مگر سب ہی لاعلمی کا اظہار کررہے تھے۔ آخرکار وہ ایک گھر میں زبردستی گھس گیا اور پھر پولیس آگئی مگر... ذہنوں کو منجمد کرنے والوں کے لیے ایک ہوشمند کہانی۔

شکر اللہ کا
148
خواجہ احمد عباس

خواجہ احمد عباس کے یہاں عشق کا تصور دوسرے افسانہ نگاروں سے قدرے مختلف یا یوں کہیے کہ زیادہ حقیقت پسندانہ ہے۔ ان کے اس نوع کی بیشتر افسانوں میں عشق کی بنیاد مساوی معیار زندگی پر قائم ہوتی ہے۔ اگر عاشق و معشوق کی زندگی معاشی اعتبار سے ایک جیسی نہیں ہے، ایک امیر دوسرا غریب ہے تو محبت استوار نہیں رہتی۔ گویا زندگی کا ایک جیسا معیار اور معاشی یکسانیت محبت کی پہلی شرط ہے۔

آسیب
164
منظر امام

ایک معصوم فطرت دوشیزہ کا احوال، اسے کئی ممالک سے ہوتے ہوئے پاکستان پہنچنا تھا۔ جہاں وہ اپنی کمپنی کی جانب سے نمائندے کی حیثیت سے کام کرنے والی تھی۔ جس وقت وہ جاپان پہنچی تو اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس نے اسے ناکام بنادیا۔ یہاں اسے ایک ایسا شخص مل گیا جس پر وہ اعتماد کرنے لگی تھی، پھر کچھ عرصے کی رفاقت کے بعد اس سے محبت بھی کرنے لگی۔

عائزہ کی کہانی
34

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37-اردو بازار، کراچی

امتحان لیتی ہے محبت

ایم الیاس

محبت میں کوئی شرط نہیں ہوتی، محبت صرف کی جاتی ہے چاہے دوسرا کرے نہ کرے۔ محبت ایک ہاتھ کی تالی ہوتی ہے اس میں نہ شکوے کی گنجائش ہوتی، نہ شکایت کی، نہ وفا کی شرط، نہ بے وفائی کی۔ محبت لین دین نہیں ہوتی۔ صرف دین دین ہوتی ہے۔ محبت ایک فطری جذبہ ہے جو قسمت والوں کو ملتا ہے۔ محبت دلوں کو گرماتی ہے۔ زندگی دیتی ہے۔ محبت کسی کو پالینے کا نام نہیں۔ محبت امتحان لیتی ہے۔ محبت میں جو قربانی دیتا ہے وہی عظیم کہلاتا ہے۔ دو دوستوں نے محبت کی خاطر ایثار کیا، محبت کا امتحان دیا۔ ان میں کون عظیم رہا یہ فیصلہ قارئین کو کرنا ہے۔

(ایک ہی لڑکی سے محبت کرنے والے دو نوجوان کا ایثار)

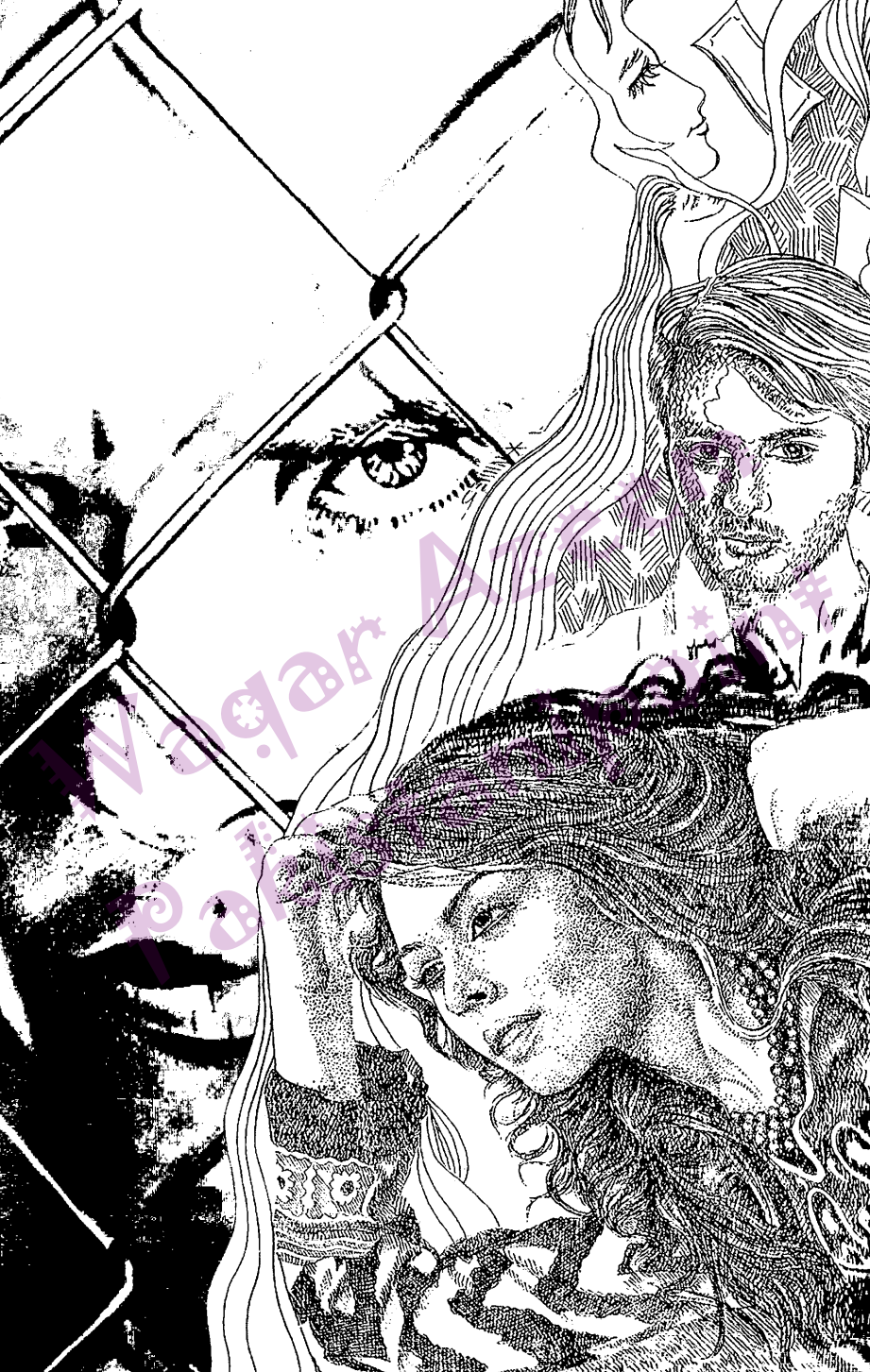

شام رات کی گھنی تاریکی میں مدغم ہو رہی تھی۔ اس تاریکی کی عفریت نے در و دیوار کو ہی نہیں بلکہ میرے وجود کو اپنے اندر سمیٹ لیا تھا۔ مجھے ہر سمت تاریکی ہی تاریکی بڑی بھیانک نظر آ رہی تھی۔ روشنی کی کوئی کرن کسی سمت نہیں تھی جس سے میرے دل کو ڈھارس سی بندھتی۔

میری زندگی کے ان گھپ اندھیاروں میں امید کی کوئی کرن کیسے پھوٹ سکتی تھی۔ اتنی بڑی دنیا میں جو میں اکیلی رہ گئی تھی۔ ایک لاوارث اور بے سہارا کی طرح ......ایک غریب کا دنیا میں ویسے بھی کوئی نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے بھی تو رہ جاتے ہیں اور اس کی طرف دیکھنا تک گوارا نہیں کرتے ہیں۔ وہ جیسے کوڑھ زدہ ہو اور اس کے وجود سے تعفن اٹھ رہا ہو۔

جب تک میری ماں حیات رہی اور اس کی ممتا کا گھنا سایہ رہا میرا وجود ایک عجیب سی فرحت اور ٹھنڈک محسوس کرتا رہا۔ مجھے کبھی بھی اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ میں اتنی بڑی دنیا میں اکیلی ہوں۔ میری ماں میرے لیے سب کچھ ہی تھی۔ وہ میرے لیے نہ صرف باپ بھی تھی اور بہن بھائی بلکہ پیار و محبت کا اثاثہ جس کی ممتا میں اپنا وجود بھگوتی رہتی تھی۔ اس نے میری خالی جھولی میں پیار کا اتنا امرت ڈال دیا تھا کبھی بھی کسی بات کی محرومی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ دوسری لڑکیاں مجھ پر رشک کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ ماں ہو تو تمہاری جیسی ......کاش! ہماری ماں بھی ایسی ہوتی کہ ممتا کی ٹھنڈی چھاؤں ہمیں سیراب کرتی رہتی۔ تم بڑی خوش نصیب ہی نہیں خوش بخت بھی ہو۔

میری ماں کو چار دن پہلے موت نے مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھین کر نہ صرف مجھے اس دنیا میں اکیلا کر دیا بلکہ میری محبت سے بھری جھولی بھی بے رحمی سے خالی کر دی تھی۔ پڑوس میں رہنے والی شازیہ خالہ نے مجھے اپنے پاس بلا کر رکھ لیا تھا اور مجھ سے بڑے پیار سے کہا تھا۔

تمہاری ماں نے مجھے ساری زندگی بھرپور محبت دی تھی۔ اس محبت کے ناتے مجھ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ تمہارے لیے وہ کچھ کروں جو مجھ سے ہو سکتا ہے۔ مگر بیٹی! میں ایک غریب عورت ہوں لیکن ہر ممکن کوشش کروں گی کہ تم اس دنیا میں خود کو بے سہارا نہ سمجھو......تم اپنی ماں کے چہلم تک میرے پاس رہو۔ میں اس دوران تمہاری زندگی کے لیے کچھ سوچوں گی کہ تمہارے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔ شاید تمہارے کام آ جاؤں۔“

میں شازیہ خالہ کے ہاں آ گئی تھی۔ اس لیے بھی صرف ایک نوجوان لڑکی ہی نہیں بلکہ نہایت حسین و جمیل بھی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ناگ یہ جان کر کہ میں اکیلی ہوں ڈس نہ لے۔

میں ایک موہوم سے امید لے کر شازیہ خالہ کے ہاں آ گئی تھی۔ اس لیے کہ اس کے سوا کوئی چارہ اور راستہ نہ رہا تھا شازیہ خالہ نے مجھے بچپن ہی سے گود دوں کھلایا تھا۔ میں نے ہر لمحہ ان کی محبت کی گھنی چھاؤں محسوس کی تھی۔ مگر معلوم نہیں کیوں ......رات کے آتے ہی میرے سینے میں ایک عجیب سی وحشت بھر جاتی تھی۔ دل کے نہاں خانوں میں درد کی لہریں پھیل جاتی تھیں۔ میں خاموش، تنہا، زہریلے ناگوں کی طرح پھنکارتے خیالوں میں گھری دہشت زدہ سی ہو کر باہر نکلنے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر میری ہر کوشش ناکام ہو جاتی اور رات کو کسی خیال میں کھوئے رہنے کا سلسلہ جاری رہتا اور میں بھیانک مستقبل کے خیال سے سہم کر رونے لگتی تھی۔ رونے سے صرف اتنا ہوتا کہ دل کی بھڑاس نکل جاتی تھی۔ جی قدرے ہلکا ہو جاتا۔ میں ایک ان جانا سا سکون محسوس کرتی مگر یہ آنسو میرے زخموں کا مرہم تو نہیں تھے اور نہ ہی میرے دکھوں کا مداوا۔ چھٹے دن ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار کا جھونکا آیا ہو۔ میں نے بڑی فرحت سی محسوس کی تھی۔ میں لمحے کے لیے سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ کہیں یہ جاگتے میں سندر سا سپنا نہ دیکھ رہی ہوں۔ خود فریبی ہو، میری سماعت دھوکا کھا رہی ہو۔ رنج والم میں آدمی یہ سب کچھ دیکھنے اور سمجھنے اور خواب دیکھنے لگتا ہے۔ میرے دور کے کسی رشتے

دار سے حمیدہ آنٹی کو میری امی کی موت کی منحوس خبر ملی تھی وہ سن کر آئی تھیں۔ ان کے شوہر شاہد انکل بھی آئے تھے۔ میں نے ان دونوں کو سات آٹھ برس پہلے شادی کی ایک تقریب میں دیکھا تھا۔ ان آٹھ برسوں کے بعد آج دیکھا تھا۔ دیکھ رہی تھی۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ تقریب کے اختتام تک میاں بیوی ہمارے ساتھ رہے تھے۔ میری ماں نے کسی وجہ سے ان سے تعلقات منقطع کر لیے تھے وہ کیا وجہ تھی۔ مجھے یاد نہیں رہا لیکن یہ تو یاد رہا تھا کہ اس تقریب میں وہ مجھ سے بڑی محبت اور لگاوٹ سے پیش آئی رہیں اور رخصت ہوتے وقت بہت پیار کیا تھا۔ حمیدہ آنٹی نے مجھے دیکھا تو ان کی آنکھوں میں حیرت منجمد ہوگئی اور وہ اپنی پلکیں جھپکانا تک بھول گئیں۔

انہیں جیسے یقین نہیں آیا کہ میں دردانہ ہوں۔ دوسرے لمحے ان کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا اور ان کی آنکھوں سے دکھ جھانکنے لگا۔

''دردانہ.....! میری بچی دردانہ .....تم کتنی بدنصیب ہو..... ماں کی ممتا اور سائے سے اس عمر میں محروم ہوگئی ہو۔''

جب انہوں نے میرے مرتعش وجود کو اپنی مرمریں سڈول بانہوں میں سمیٹا تو مجھے بڑی محبت اور راحت کا ہوا تھا جیسے میری ماں نے سینے سے لگایا ہو۔ میں ان کے سینے پر سر رکھ کر سسک پڑی ہو۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا بہتا ہوا سیلاب ان کے گریبان کو بھگونے لگا۔ میں اتنی محبت اور ماں کا سا جذبہ پا کر جذباتی ہوئی تو آنٹی بھی جذباتی ہوگئیں۔ بڑی دیر مجھے سینے سے لگائے کھڑی رہیں۔

شاہد انکل جو میرے پاس ہی کھڑے اور یہ جذباتی منظر دیکھ رہے تھے انہوں نے میرا سر شفقت سے سہلاتے ہوئے رندھی آواز میں بولے:

نہ رو میری بچی دردانہ..... مشیت ایزدی میں انسان کو کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔ آج اب ابھی سے تم ہماری بیٹی ہو۔''

جب میں کسی قدر اپنا جی ہلکا کر چکی تو آنٹی نے اپنی ساڑھی کے پلو سے میرے آنسو پونچھے۔ پھر وہ مجھے سینے سے لگا کر بولیں۔

''اب تم دنیا میں اکیلی نہیں رہی ہو..... آج سے میں تمہاری ماں ہوں۔ تم آج ابھی اور اس وقت ہمارے ساتھ چلو..... چل کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرو۔ ہمارے پاس کسی بھی چیز کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اب تمہارے غم، تنگ دستی اور دکھوں کے دن ختم ہوگئے ہیں۔''

جب میں نے شازیہ خالہ کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ میرا مطلب سمجھ گئیں۔ محبت بھرے لہجے میں بولیں۔

''چلی جاؤ بیٹی.....! اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں۔ پھر میں ایک غریب عورت ہوں۔ کاش! تمہارے لیے کچھ کر سکتی۔ اگر ہوتا تو تمہیں سگی بیٹی سے بڑھ کے رکھتی۔''

میں نے انکل اور آنٹی کی طرف ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ ان کی ظاہری حالات اور وضع قطع اور لباس سے آسودگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ معاً باہر نگاہ پڑی تو ان کی گاڑی دکھائی دی۔ وہ ہنڈا اکارڈ تھی۔ جو کسی نویلی دلہن کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ وہ کافی خوش حال معلوم ہوتے تھے جب کہ شازیہ خالہ ایک غریب عورت تھیں۔ ان کے پاس خلوص اور محبت کی دولت تھی۔ وہ اور ان کی بیوہ بیٹی سلائی کڑھائی کر کے گھر چلا رہی تھیں۔ اس کمرے کے کرائے سے بیٹی اور ان کی بیٹی کی گزر ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ بیٹی اور ماں کوٹھیوں میں ماسی کا کام بھی کرتی تھیں۔ بیٹی کے دو بچے تھے جو مدرسے میں پڑھتے تھے۔ اس لیے میرا حمیدہ آنٹی اور شاہد انکل کے ساتھ چلے جانا ہی بہتر تھا۔ میں غریب بیوہ ماں بیٹی پر بوجھ بننا نہیں چاہتی تھی۔ کیوں کہ اس گرانی میں گزر بسر آسان نہ تھی۔ وہ دونوں جہاں کام کرتی تھیں واپسی میں بچا کھچا کھانا لے آتی تھیں جس سے اپنا پیٹ بھرتی تھیں۔ شازیہ خالہ اور ان کی بیٹی رخشندہ نے مجھے بڑے پیار اور دعاؤں سے رخصت کیا اور یہ وعدہ بھی لیا کہ میں ان

سے ملنے آتی رہوں گی۔ میں ان کے ہاں سے رخصت ہو کر آنٹی کے ہاں پہنچی تو میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ ان کا گھر کسی شاہی محل کی طرح ہے۔ یہ ایک ایسا گھر تھا جو ہر لڑکی کی خوابوں میں بھی دیکھتی ہے۔ یہاں کیا کچھ نہیں تھا۔ میرے سائز کے عمدہ تراش کے عمدہ سوٹی اور ریشمی ملبوسات، سینڈلز اتنے تھے کہ ایک دکان کھولی جا سکتی تھی۔ مجھے جو کمرا دیا گیا تھا وہ ہر طرح سے نہایت آراستہ و پیراستہ تھا۔ ایک بڑی سنگار میز بھی تھی جس میں پورے کمرے کی ایک ایک چیز دکھائی دیتی تھی۔ اس میز پر نہ صرف قیمتی خوشبو کھٹیاں تھیں بلکہ میک اپ کے غیر ملکی لوشنز اور لوازمات تھے۔

میری امی نے اپنی زندگی میں کبھی بھولے سے میک اپ نہیں کیا تھا۔ کیوں کہ وہ نہایت حسین اور پرکشش عورت تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ عورت کا حسن کسی میک اپ کا محتاج نہیں ہوتا۔ میں نے بھی کبھی میک اپ نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی خوشبو کا استعمال..... اس لیے بھی کبھی زندگی میں کبھی دو وقت پیٹ بھر کے کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ بچتا ہی کیا جو میرے لیے لپ اسٹک اور میک اپ کی لوازمات خریدی جاتیں۔ میری امی جب صابن سے منہ دھوتی تھیں تو ان کا حسن نکھر جاتا اور چہرے پر ایسی جاذبیت، دل کشی اور روپ آ جاتا تھا جو سولہ سنگار سے بھی نہیں آتا تھا۔

میری زندگی کی یہ پہلی حسین اور خواب ناک رات تھی جو میں نے شان دار اور لمبے چوڑے پلنگ کے نرم اور گداز بستر پر گزاری تھی۔ اس میں احساس بھی تھا جس کی آغوش میں رات خوب نیند آئی تھی۔ دن چڑھتے تک سوتی رہی۔ جب آنٹی نے آ کر جگایا تو بارہ بج رہے تھے۔ اگر وہ مجھے بیدار نہ کرتیں تو شاید سہ پہر تک گھوڑے بیچ کر سوتی رہتی۔

''دردانہ بیٹی.....! کیا ناشتا نہیں کرو گی؟ کیا سارا دن سوتی رہو گی؟ دیکھو تو سہی دن کس قدر نکل آیا ہے۔''

میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی تو وہ بولیں۔ ''جلدی سے نہا کر آ جاؤ۔ ناشتے کی میز پر ناشتا تمہارے ساتھ کروں گی۔''

پھر میں ملحق غسل خانے میں گھس گئی۔ غسل خانے میں شاور، باتھ ٹب، واش بیسن میں بہت بڑا آئینہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک دیوار پر قد آدم آئینہ نصب تھا۔ شیمپو اور طرح طرح کے لوشنز بھی تھے۔ بڑے صابن کی ٹکیہ بھی..... ہمارے گھر میں جو غسل خانہ تھا وہ ایک ڈربا تھا۔ کھڑے ہو کر نہانا بھی بڑا مشکل تھا۔ میرے دل کے کسی کونے میں آزادی سے نہانے کی خواہش ہوئی۔ گھر کے کارخانے میں تاریکی سی ہوتی تھی۔ پھر میں نے اپنے کپڑے ہینگر میں لگا دیے۔ آزادی سے جلدی جلدی نہائی۔ کیوں کہ آنٹی ناشتے کی میز پر میری منتظر تھیں۔ شاور کی رم جھم نے میرے سارے بدن میں فرحت اور تازگی دوڑا دی۔ کبھی ایسی لذت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ سارے جسم پر چستی اور راحت دوڑنے لگی۔

انکل اور آنٹی نے میرا اس قدر خیال رکھا تھا کہ میری ماں نے بھی نہ رکھا ہوگا۔ گھر میں نہ صرف انواع و اقسام کے کھانے کھلائے جاتے تھے۔ بلکہ ہر شام سیر و تفریح کے لیے لے جایا جاتا تھا۔ رات کا کھانا اکثر اعلا قسم کے ہوٹلوں اور باربی کیو میں ہوتا تھا۔ میں اس نئی خواب ناک زندگی سے بہت خوش اور مسرور تھی۔ یقین نہیں آتا تھا۔ ہر لمحہ پر خواب کا گمان ہوتا۔ واقعی یہاں کسی چیز کی کوئی کمی نہ تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ کس لیے اپنا سارا پیار مجھ پر نچھاور کر رہی ہیں اور محبت کا خزانہ بڑی فراخ دلی سے لٹا رہی ہیں اس لیے کہ ان کی کوئی بیٹی نہیں ہے۔ جو بیٹی تھی وہ عین عالم شباب میں داغ مفارقت دے گئی تھی۔ وہ مجھے اپنی سگی بیٹی سے بڑھ کر چاہنے اور محبت کرنے لگے ہیں۔ ان کی زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا اسے میں نے پر کر دیا ہے۔

ایک مہینہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ اس گھر میں آ کر نئی زندگی کی رنگینیوں اور آسودگی کی فرحت میں کچھ

ایسی کھوئی کہ ماں کی یاد ہی دل سے نکل گئی نہ تو ان کی موت کا کوئی غم رہا تھا اور نہ ہی یہ خیال تھا کہ میری بھی ماں تھی۔ چالیس واں کب آیا کب گیا یاد ہی نہیں رہا۔ اس میں مجھ سے زیادہ آنٹی اور انکل کا قصور تھا۔ انہوں نے مجھے سیر و تفریحات، شاپنگ اور ملبوسات کی دل فریبی میں ایسا الجھا دیا تھا کہ میں بے حس اور ماں کی یاد سے بے نیاز ہو کر رہ گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ دنیا میں اس قدر رنگینیاں اور دلچسپیاں ہیں کہ آدمی خود غرض ہو جاتا ہے اور اپنی اوقات تک بھول جاتا ہے۔ میں دوپہر تک سوتی رہتی..... ناشتا اور دوپہر کا کھانا کھا کر میں ٹی وی دیکھتی تھی۔ آنٹی نے کیبل لے رکھا تھا جس میں سو سے زیادہ چینلز دکھائی دیتے تھے۔ اس کے علاوہ انڈین اور انگریزی فلموں کے کیسٹ اور ڈی وی ڈی بھی تھیں۔ انڈین اور انگریزی فلمیں بھی بڑی بولڈ اور نامناسب مناظر کی ہوتی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں بند ہو کر انہیں دیکھنے لگی تھی جو میرے جذبات کو بھڑکا دیتی تھیں۔ یقین نہیں آتا تھا ایسی بے ہودہ واہیات اور فحش فلمیں بھی بنتی ہیں۔ لیکن میں انہیں دیکھے بغیر نہیں رہتی تھی۔ میں ان کی عادی ہونے لگی تھی۔

میں ایک نوجوان لڑکی تھی۔ مجھے ایسی فلمیں دیکھنا زیب نہیں دیتا تھا جو جذبات کو بھڑکا دیں۔ بہکنے پر مجبور کر دیں۔ ایسا لگتا تھا کہ آنٹی دانستہ ایسی سی ڈیز مجھے دیتی ہیں تاکہ میں ان سے محظوظ ہوتی رہوں۔ اگر اس گھر میں کوئی جوان لڑکا یا مرد ہوتا تو شاید میں بہک جاتی اور میرے وجود پر آنچ آ جاتی۔ اگر کوئی لڑکی ہوتی تو بھی شاید ہمارے درمیان کوئی دیوار اور فاصلہ نہ رہتا۔

مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ آنٹی کیوں ایسی فلموں کی سی ڈیز مجھے دیکھنے کے لیے دیتی ہیں۔ اگر ان کی بیٹی ہوتی تو شاید ایسا نہ کرتیں۔ یہ سب کچھ خواب ناک ہو گیا تھا۔ یہ زندگی مجھے اس قدر پسند آئی تھی کہ اب میں پیچھے مڑ کے دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ دن بھی یاد آتے تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ بھیانک خواب تھا۔ ان کا تصور ہی مجھے لرزہ براندام کیے دیتا تھا۔ ایسی پرتعیش زندگی خواب میں بھی میسر نہیں تھی۔

یوں تو میں روز ہی آئینہ دیکھتی تھی اور بہت دیر تک اس کے سامنے کھڑی رہتی۔ معلوم نہیں دن میں کتنی بار ناقدانہ نظروں سے ہر زاویے سے دیکھتی رہتی تھی۔ مگر اس روز آنکھ کھلی تو علی الصباح کا وقت تھا دیر تک نیند نہیں آئی حالاں کہ رات کے تین بجے تک فلمیں دیکھتی رہی تھی۔ عجیب سی بات تھی۔ اس لیے کہ دن چڑھے تک سوتی رہتی تھی۔ نیند کوسوں دور تھی۔ کروٹیں بدلتی رہی تھی۔ جب لیٹے لیٹے بیزار ہو گئی تو نہانے کے لیے غسل خانے میں گھس گئی۔ پھر باتھ ٹب میں بیٹھ کے دیر تک نہاتی رہی۔ آزادی سے نہانے میں ایک عجیب سا لطف اور لذت محسوس ہوتی ہے۔ جب کپڑے پہن کر کمرے میں آئی تو سنگار میز کے سامنے کھڑی ہو کر بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ میرا چہرہ ایسا دل کش اور سراپا ایسا پرکشش نظر آ رہا تھا کہ میری نظریں ٹھہر نہیں رہی تھیں۔ میں خود کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ میرا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا تھا کیا میں واقعی اتنی حسین اور پرکشش ہوں۔ کہیں یہ میری خود فریبی تو نہیں.....؟

جب میں دوسرے کمرے میں ناشتے کی میز پر آئی تو انکل اور آنٹی کو اپنا منتظر پایا۔ یہ خلاف معمول تھا۔ بڑی حیرت ہوئی اور خوشی بھی کہ وہ مجھے کتنا چاہتے اور مجھ سے پیار بھی کرتے ہیں۔ میاں بیوی نے بڑے پیار سے مسکرا کے دیکھا۔ آنٹی نے مجھے اپنے پاس بٹھا کے مجھے بے تحاشا پیار کیا۔ اس میں پہلے سے زیادہ گرم جوشی اور والہانہ پن تھا جس نے مجھے مسرور کر دیا محبت پاش لہجے میں مسکرا کے بولی۔

''دردانہ بیٹی.....! خدا تمہیں نظر بد سے بچائے تمہاری ماں بھی جوانی میں ہو بہو تمہارا عکس تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ تمہاری جڑواں تھی۔ کاش! وہ ہمارا کہا مان لیتی تو ایک شہزادی کی طرح بسر کرتی مگر اس نے محبت میں اندھی ہو کر اپنا حسن و شباب اور مستقبل تباہ و

برباد کرلیا۔ ہم اس کی نظروں میں بہت برے بن گئے۔ چھوڑو اب ان پرانی باتوں کو..... ان کے ذکر سے کلیجہ منہ کو آتا ہے..... چلو آؤ ناشتا کرلو..... جو نہیں ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب رونے دھونے اور پچھتاوے سے کیا حاصل..... اب آگے کی طرف دیکھو۔''

پرتکلف ناشتے سے فراغت پانے کے بعد چائے کے دور کے بعد اس دوران آنٹی میری طرف دیکھتی ہوئی کہنے لگیں۔

''دردانہ بیٹی.....! ہر لڑکی پرائی امانت ہوتی ہے۔ ماں باپ اسے زیادہ دنوں گھر میں بٹھا کے نہیں رکھ سکتے اور نہ رکھتے ہیں۔ یہ زمانے کی ریت ہے جو صدیوں سے چلی آرہی ہے کہ بیٹی کے سیانی ہوتے ہی اسے اس کے گھر رخصت کردیا جائے۔ اب چوں کہ تم ایک نوجوان لڑکی ہو اور ہر لحاظ سے شادی کے قابل..... ایک لڑکی کی شادی کے لیے یہ سب سے اچھی عمر ہوتی ہے۔ لڑکیاں بھری جوانی میں شادی کر لیتی ہیں اور کردی جاتی ہیں۔ اس لیے کہ ان کا حسن سدا بہار اور زندگی خواب ناک بن جاتی ہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی کردیں تاکہ اپنا گھر بسا کر ایک پرسکون زندگی گزار سکو۔''

''شادی.....؟'' میرے کانوں میں شادی کے گیت گونجنے لگے۔ میرے سینے میں سانسوں کا تلاطم ہچکولے کھانے لگا۔ میں نے چشم تصور میں اپنے آپ کو دلہن بنا دیکھا اور ایک بہت ہی خوب صورت، وجیہہ اور دراز قد مرد کو منہ دکھائی میں انگوٹھی پہناتے دیکھا..... میں نے اپنا سر جھکالیا۔ میں نے اس طرح سے اپنی رضامندی ظاہر کردی تھی۔

''دیکھو بیٹی.....!'' انکل نے کھنکار کر حلق صاف کیا۔ ''تمہارے لیے ایک بہت ہی اچھا رشتہ آیا ہے۔ لڑکا کروڑ پتی ہے۔ اس کا اپنا کاروبار دبئی، سنگاپور اور یورپ کے کئی شہروں تک پھیلا ہوا ہے، اس کا پاکستان کے ہر شہر، پرفضا مقامات اور صدیوں میں اس کے بنگلے ہیں۔ شان دار قسم کی نئے ماڈل کی کاریں ہیں۔ وہ تم سے شادی کرنے کے بعد ایک شان دار بنگلے میں رکھے گا۔ تمہیں اپنی پسند کی نئے ماڈل کی گاڑی بھی لے کر دے گا۔ جیب خرچ ہر ماہ پچاس ہزار کی رقم دے گا اور اس کے علاوہ شاپنگ کے لیے منہ مانگی رقم بھی..... تمہاری خدمت کے لیے ہر وقت ایک فوج جو مردوں عورتوں پر مشتمل ہوگی مستعد پاؤ گی۔ آج اس سے اچھا رشتہ ملنا ناممکن ہے۔ نصیب سے ایسے رشتے ملتے ہیں۔ تم بڑی خوش بخت ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ بتاؤ تمہیں یہ رشتہ منظور ہے..... پسند ہے۔''

میں جواب کیا دیتی۔ انکل نے تو مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان کی وسعتوں میں پہنچا دیا تھا۔ ذرے کو آفتاب بنا دیا تھا۔ میری نظروں کے سامنے دھنک کے سارے رنگ بکھر گئے تھے۔ وہ دنیا کی بدبخت لڑکی ہوگی جو ایسا رشتہ ٹھکرا دے۔ کفران نعمت کرے..... میرا سینہ بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں نے اثبات میں آہستہ سے سر ہلا دیا۔

''میں تو آپ کی بیٹی کی طرح ہوں۔ آپ مجھ سے پوچھے بغیر بھی جہاں چاہیں جس سے چاہیں شادی کردیں۔ میں اف نہیں کروں گا۔''

''شاباش بیٹی.....؟'' انکل میرے پاس آکر بیٹھ گئے۔ وہ میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''یہ شادی انتہائی سادگی اور باوقار انداز سے ہوگی جس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتی ہو۔ شادی جتنی سادگی سے ہوتی ہے اتنی ہی اچھی ہوتی ہے۔''

انکل نے یہ بات کچھ ایسے پراسرار لہجے میں کہی تھی میں نے چونک کر سر اٹھایا۔ مجھے شاید یہ غلط فہمی ہوئی ہے ان کے لہجے سے..... پھر میں نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا تاکہ اپنی غلط فہمی ان کے چہرے کے تاثرات سے دور کرسکوں۔ وہ میری نگاہوں کی زبان کا مفہوم سمجھ گئے تھے۔ یک لخت ان کے ہر قسم کے جذبات سے عاری سپاٹ چہرے پر گہری سنجیدگی طاری ہوگئی تھی۔ آنٹی خاموش بیٹھی ہوئیں ہم دونوں کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہی

تھیں اور گفتگو بھی بڑے غور اور دھیان سے سن رہی تھیں۔

''بات یہ ہے بیٹی.....!'' انہوں نے ایک گہرا سانس لینے کے لیے توقف کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں تمہیں اس کی وجہ بتا دوں تاکہ کسی شک و شبہے اور غلط فہمی میں نہ پڑو۔ اندھیرے میں نہ رہو۔ چوں کہ تمہیں اس کے ساتھ زندگی گزارنی ہے اس لیے تم تمام حالات سے باخبر رہو اور خود کو ذہنی طور پر تیار رکھو..... لڑکا دوسری شادی کر رہا ہے۔ اس کی پہلی شادی اس کی ماں نے اپنی پسند کی عورت سے زبردستی کر دی۔ وہ عورت عمر میں اس سے پندرہ بیس برس بڑی تھی۔ اس عورت نے ایک اچھی عورت بننے کی بجائے ایک آوارہ مزاج عورت کا روپ دھار لیا۔ پہلے تو اس نے اپنی بیوی کو راہ راست لانے اور سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی۔ پھر لڑکے کے علم میں یہ بات آئی وہ نہ صرف بدچلن بلکہ فاحشہ بھی ہے۔ اس لیے اس نے اسے طلاق دے دی۔ اب وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ اپنی خوشی اور پسند سے..... وہ نہیں چاہتا ہے کہ اس شادی کی تقریب میں اس کے گھر کا کوئی فرد شامل ہو۔ اپنی ماں کو تک ہوا لگنے دینا نہیں چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے ماں کو بڑی خالہ کے ہاں بھیج دیا ہے۔ جو بہاول پور میں رہتی ہے۔ اس نے اپنی شادی کا کچھ اس طرح پروگرام بنایا ہے کہ جمعرات کو تم سے نکاح پڑھوانے کے بعد سیدھا تمہیں ایئرپورٹ لے جائے گا۔ تم دونوں اس رات ہنی مون منانے کے لیے یورپ چلے جاؤ گے۔ کل تمہارا پاسپورٹ بنوا لیا جائے گا۔ پیسہ ہو تو ہر کام پلک جھپکتے ہو جاتا ہے۔ پیسے میں ایٹم بم جیسی قوت ہوتی ہے۔''

میں نے دھڑکتے دل سے سوچا..... تو کیا میری شادی میں ڈھول نہیں بجیں گے۔ ان کی تھاپ پر لڑکیاں رقص نہیں کریں گی؟ گیت نہیں گائے جائیں گے؟ مہندی کی رسم بھی نہیں ہوگی؟ مایوں بھی نہیں ہو گا؟ کیا میری شادی کسی لاوارث لڑکی یا گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کی طرح ہوگی۔! کسی غریب سے غریب لڑکی کی شادی بھی ایسی نہیں ہوتی.....؟

دوسرے لمحے میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ ان رسموں کے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کیا یہ میری سب سے بڑی خوش نصیبی ہے کہ مجھے ایک امیر ترین شوہر مل رہا ہے..... میرا رفیق زندگی مجھے ایک خواب ناک زندگی دے رہا ہے۔ ایسے رشتے تو بڑے گھرانے کی لڑکیوں کو نصیب نہیں ہیں۔ قسمت مجھ پر مہربان ہو رہی ہے بڑی فیاضی سے..... اس سے بڑی خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ میں ہنی مون منانے یورپ جاؤں گی۔ اس طرح یورپ کی سیر و سیاحت کا سنہرا موقع مل جائے جس کا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں اور نہ ہی میرے وہم و گمان میں تھا۔ میں خوب گھوموں گی۔ ایک سے ایک بڑے فائیو اسٹارز ہوٹل میں قیام کروں گی۔ زندگی کا خواب ناک لطف اٹھاؤں گی۔

میں نے چند لمحوں کے تذبذب کے بعد نگاہیں اٹھا کے باری باری آنٹی اور انکل کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہیں بھی مجھ ہی پر مرکوز تھیں۔ میں نے قدرے جھجکتے ہوئے کسی نہ کسی طرح ہمت کر کے کہا۔

''جو آپ کی خوشی وہ میری خوشی..... آپ لوگ جس طرح کہیں گے میں اس پر عمل کروں گی۔ آپ فکرمند اور پریشان نہ ہوں۔''

چھ سات دن مجھے چھ سات برس نہیں بلکہ چھ سات صدیوں کی طرح بھاری ہوئے تھے۔ ایک ایک لمحہ کس طرح میں نے کاٹا یہ میرا دل جانتا ہے۔ رات جب میں سونے کے لیے بستر پر دراز ہوتی تو میرے ہونے والے شوہر کا تصور ہوتا۔ میرا بھی یہی ارمان تھا۔ میری ماں کا بھی بڑا ارمان تھا کہ میری شادی جتنی جلد ہو سکے کر دے..... مگر حالات نے ساتھ دیا اور پھر میری ماں کے پاس تھا۔ کیا۔ عزت اور شرافت کی دولت جو آج دو کوڑی کی بھی نہیں تھی۔ لڑکے والے اپنی معیار اور پسند کی شادی کرنے کے لیے جو لڑکی پسند کرتے تھے۔ وہ دراصل لڑکی سے نہیں

بلکہ جوڑے کی رقم، لین دین اور جہیز سے کرتے تھے۔ میں جو پرگندہ خیالات میں کھو کے ان جانے راستے پر جاتی تھی اس میں میرا نہیں بلکہ ان فلموں کا قصور تھا جو آنٹی ین ے دی تھیں اور میں انہیں راگ گئے تک دیکھتی تھی۔ م یں نہ صرف سوچتی اور حیران ہوتی تھی کہ آنٹی مجھے کیوں ایسی شرمناک مناظر کی سی ڈیز دیکھنے کے لیے دیتی ہیں۔ کیا انہیں احساس نہیں کہ ایسی فلمیں اور مناظر ایک نوجوان لڑکی کو غلط راستے پر ڈال سکتی ہیں۔ نوجوانی بے لگام گھوڑی کی طرح ہوتی ہے۔ جو قابو میں نہیں آتی ہے۔ اندھے جذبات کا جنون اسے پستی میں گرادے سکتا ہے۔ کیا اگر ان کی بیٹی ہوتی تو اسے بھی ایسی فلموں کے دیکھنے کی اجازت ہوتی؟ خدا خدا کر کے جمعرات کا دن آ گیا جس کے انتظار میں ماہی آب کی طرح کاٹ رہی تھی۔ جس کا ہر لمحہ اور ساری رات خواب دیکھتی تھی۔ اس روز میں بہت خوش تھی کہ آج میں ایک نئی زندگی میں قدم رکھ رہی ہوں۔ اور میرا خواب بھی مجھے آج ملنے والا ہے۔ نہ جانے کیوں یقین نہیں آیا۔ اس بات سے مسرور ہو رہی تھی کہ کل سے میرا اپنا گھر ہوگا۔ میرا چاہنے والا میرے ساتھ ہوگا۔ آج میری شادی کا دن ہے۔ شادی کی ناقابل بیان خوشی کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی حیرت تھی کہ لڑکے نے مجھے دیکھا اور نہ ہی میری تصویر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ مجھے دیکھے بغیر ہی شادی کر رہا ہے۔ آج کل لڑکے شادی سے قبل لڑکی کو ضرور دیکھتے ہیں لیکن اس نے ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ یہ بڑی عجیب سی بات تھی۔ کیوں کہ آج کل لڑکے شادی سے قبل لڑکی کو ضرور دیکھتے ہیں لیکن اس نے ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ یہ بڑی عجیب سی بات تھی۔ کیوں کہ آج کل لڑکے شادی لڑکی یا اس کی تصویر دیکھے بغیر نہیں کرتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آنٹی نے میرے حسن و شباب کی ایسی زبردست تعریف کی ہو کہ وہ مجھے دیکھے بغیر ہی مجھ پر ریشہ خطمی ہو گیا ہو۔ آنٹی نے موبائل فون پر میری تصویر اس کے موبائل فون پر بھیج دی۔ انہوں نے کبھی اور کسی وقت موبائل پر میری تصویر نہیں لی تھی۔ لڑکے کی بات میرے لیے معمہ بن گئی تھی۔ میرے دل کے کسی کونے میں یہ خیال بار بار آیا تھا کہ..... آنٹی سے یہ سوال پوچھوں۔ شرم و حیا مانع ہوئی تو میں چپ ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ مجھے آم کھانے سے مطلب ہونا چاہیے۔ پیڑ گن کے کیا کروں؟ آنٹی کہیں برا نہ مان جائیں۔

''جیسے دن ڈوبا آنٹی مجھے اپنے ساتھ بیوٹی پارلر لے کر گئیں۔ میرا سنگار بڑے اہتمام اور شان دار طریقے سے کرایا۔ اس سنگار کے انہوں نے دس ہزار روپے دیے تھے۔ گھر آ کر انہوں نے مجھے انتہائی قیمتی اور گہرے سرخ رنگ کی بنارسی ساڑی اور بلاؤز پہنایا۔ بلاؤز زیر جامہ سا لگ رہا تھا۔ انتہائی مختصر، بے حد کھلے گریبان اور بازوؤں کا تھا۔ میرے بدن پر میری ماں کے شادی کے زیورات تھے جو میری ماں نے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ میں شازیہ خالہ کے ہاں سے چلتے وقت تمام زیورات لے آئی تھی۔ آنٹی نے اپنے زیورات میں سے ایک سونے کا جڑاؤ نیکلس میرے گلے میں پہنایا۔''

جب آنٹی نے مجھے پوری طرح آئینے کے روبرو لا کر کھڑا کیا تو میری آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئیں۔ میں اپنے آپ کو بالکل بھی پہچان نہ سکی تھی۔ اس لباس اور سنگھار میں بالکل بدل کر رہ گئی تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں آئینے کھڑی اپنے آپ کو دیکھتی رہوں۔ لمحے کے لیے بھی سامنے سے نہ ہٹوں۔ آئینہ جھوٹ نہیں بولتا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آئینہ خود میرے حسن و شباب اور دل کشی سے متاثر ہو گیا ہے کیوں کہ اس میں میری صورت کے ان گنت روپ نظر آ رہے ہیں۔ ہر روپ اتنا حسین اور کشش سے قیامت ڈھا رہا تھا کہ میں دل ہی دل میں اپنے آپ پر اش اش کر رہی تھی۔ میرے بالوں کے نئے انداز اور تاروں بھری رات ایسی ساڑھی میں چمکنے والے بدن کا حسن اور گداز ہو رہا تھا میں کسی بھی ملکہ حسن سے کہیں حسین دکھائی دے رہی تھی۔ میں لباس میں بھی بے لباس سی

ہو رہی تھی کہ کوئی دیکھے تو دل تھام کر دیکھتا رہ جائے اور پل بھر کے لیے بھی میرے سراپا سے نگاہ نہ ہٹے۔ میں اپنے حسن پر بڑی نازاں اور مغرور سی ہو رہی تھی۔ مجھ میں پندار حسن پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ رات دس بج چکے تھے۔ وہ ابھی تک نہیں آیا تھا جس کا مجھے بے چینی ،اذیت اور دھڑکتے دل سے انتظار تھا۔ آنٹی اور انکل بھی فکر مند اور پریشان تھے کہ وہ اب تک کیوں نہیں آیا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا ویسے ویسے مجھے اندیشے اور وسوسے ڈس رہے تھے۔ ان کا زہر جیسے نس نس میں سرایت کرنے لگا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا میرے سپنوں کا رنگ اترتا اور بے رنگ ہوتا جا رہا ہے۔ میری حالت ایک مردے سے بھی بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ دل میں آ رہا تھا کہ لباس اور زیورات تن سے اتار کے پھینک دوں۔

ٹھیک گیارہ بجے گھر کے باہر گاڑی کا ہارن بجا تو میرا دل خوشی سے اچھل کر دھک دھک کرنے لگا۔ انگ انگ میں لہو رقصاں ہو گیا تھا یا اللہ! تیرا شکر ہے۔ میں نے دل میں کہا۔ تو نے میرے دل کی سن لی۔ اگر یہ نہ آتا تو جانے پھر میرے دل کا کیا ہوتا۔

ہارن کی آواز سنتے ہی فوراً ہی دروازہ کھول کے لپک گئیں اور نشست گاہ میں گھس گئیں۔ سامنے ہی نشست گاہ تھی جس کا دروازہ قدرے کھلا ہوا تھا۔ لیکن اس میں کون ہے وہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میرے کمرے کا دروازہ بھی قدرے کھلا رہ گیا تھا۔ میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنے اٹھی۔ اپنا لباس اور سراپا سمیٹ لیا۔ اس لیے دروازہ بند کرنا چاہتی تھی کہ آنٹی کو عجلت میں دروازہ بند کرنا یاد نہیں رہا تھا۔ میرے کمرے میں آنٹی کی آواز اس طرح سنائی دی جیسے وہ میرے پاس کھڑی ہوئی ہیں۔ میرے کان ان کی سانسیں تک سن رہی تھیں۔ ان کی دبی دبی ہوئی آواز سنی تو ٹھٹک کے رک گئی۔

''دیکھیے سیٹھ صاحب! بے ایمانی مت کیجیے۔ ڈنڈی مت ماریئے۔ آپ سے پانچ لاکھ روپے پر سودا طے ہوا تھا۔ باقی زیور ملبوسات اور شادی کے دیگر اخراجات کے لیے دو لاکھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ہم نے لڑکی آپ کو ساحل سمندر پر دکھا دی تھی۔ آپ نے غیر محسوس انداز سے اسے قریب سے دیکھا تھا۔ ہر زاویے سے..... اور ناقدانہ نظروں سے کتنی ہی دیر تک ایک جوہری کی طرح پرکھا تھا اور دوسرے معاملات طے کیے تھے۔ آپ نے خود دیکھ لیا تھا کہ لڑکی کتنی حسین ہے؟ انمول، بے داغ اور تراشیدہ ہیرا جس پر ایک خراش تک نہیں ہے۔

''اگر آپ اپنے وعدے اور سودے کے مطابق پوری رقم دے رہے ہیں تو ٹھیک ہے۔ ورنہ چلتے پھرتے نظر آئیں۔ ہم اسے دبئی لے جائیں گے۔ وہ کنواری لڑکیوں..... کلیوں اور اس ہیرے کے ایک سے ایک قدر دان ہیں۔ وہاں لاکھوں ریال، پونڈ اور امریکی ڈالر اور دینار کا سودا آسانی سے ہو سکتا ہے۔ بعض شیوخ جو تیل کے ایکسپورٹر ہیں وہ ایک رات ایک لاکھ ریال بھی دیتے ہیں۔ تین چار لڑکیوں کو ہم پانچ لاکھ ریال میں فروخت کر آئے ہیں۔ شاید آپ کو علم نہیں ہے کہ خفیہ طور پر بازار حسن لگتا ہے۔ جہاں کنواری لڑکیوں کا نیلام عام ہوتا ہے۔'' کیا سمجھے جناب؟ باہر کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔'' وہ غصے سے بولیں۔ ''کراچی شہر میں ہزار پانچ سو میں بہت پھول مل جاتے ہیں۔''

فریب؟ میری نظروں کے سامنے ایک کوندا سا لپکا اور پھر میرے وجود میں ایک دھماکا سا ہوا۔ میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ میں نے قدرے پرے ہو کر دیکھا تو آنٹی کا اصل چہرہ نظر آیا جو سامنے والے چہرے کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ ایک چڑیل کا چہرہ تھا۔ مکروہ، بھیانک اور خوف ناک نظروں کے سامنے سے پردہ ہٹا تو میرا سر چکرایا۔ مجھے کمرے کی ہر چیز تیزی سے گھومتی چکر کھاتی محسوس ہوئی۔ اگر میں تیزی کے ساتھ بڑھ کر دیوار کا سہارا نہ لیتی تو غش کھا کر فرش پر گر پڑتی۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ چند لمحوں کی جدوجہد کے بعد میں نے خود کو کسی نہ کسی طرح سنبھال لیا۔ قابو پانے میں

کامیاب ہوگئی۔ میں نے دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھ کر سوچا کہ اب مجھے یہاں سے ہر قیمت پر فرار ہونا چاہیے۔

یہ ڈائن آنٹی اور انکل مردود میرا سودا کررہے ہیں۔ اب مجھ سے کچھ پوشیدہ نہیں رہا۔ ایک ایک کر کے سارے پردے اٹھتے چلے گئے تھے۔ پس آئینہ کیا ہے میرے علم میں آچکا تھا۔ ان کے احسانات اور نوازشات کا مطلب سمجھ میں آ گیا تھا۔ مجھے نامناسب اور فحش فلموں کی سی ڈیز کیوں دی جارہی تھیں۔ وہ میرے حسن و شباب اور نوجوانی کی قیمت معہ سود در سود حاصل کرنا چاہتی تھیں۔

میں نے سوچا کہ یہاں سے فرار ہو کر شازیہ خالہ کے ہاں پہنچ جاؤں۔ مگر فرار کی تمام راہیں مسدود تھیں۔ اس لیے کہ کھڑکیوں میں گرل لگی ہوئی تھی اور باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ جو راستہ تھا وہ نشست گاہ سے ہو کر جاتا تھا۔ میں فرار کی تدبیر سوچ رہی تھی آنٹی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا اور ان کی آنکھوں میں برقی قمقموں جیسی روشنی تھی۔ وہ اس لیے اتنی سرشار دکھائی دیتی تھیں کہ انہیں مطلوبہ رقم مل گئی تھی۔

وہ مجھے دیوار کا سہارا لیے کھڑا دیکھ کر سرشار لہجے میں بولیں۔

''چلو بیٹی.....! چلو دولہا آ گیا ہے وہ قاضی کو بھی لیتا آیا ہے۔ نشست گاہ میں چل کر تمہارا نکاح.....''

یک لخت انہیں میری غیر حالت کا احساس ہوا تھا۔ میرا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ آنکھوں میں خوف و دہشت سمٹ آئی تھی۔ میں اپنی یہ حالت سنگار میز کے آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ وہ بری طرح چونک پڑی تھیں۔ وہ اپنا لہجہ ادھورا چھوڑ کے بولیں۔

کیا بات ہے دردانہ بیٹی؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ یہ تمہارے چہرے کا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے؟''

آنٹی نے میری کلائی پکڑ کے دیکھنی چاہی تو میں نے ان کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا اور پھر ہذیانی لہجے میں کہا۔

''خبردار ..... مجھے اپنے منحوس ہاتھ نہیں لگانا..... مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ لیکن آج.....''

''یہ تم کیسی بہکی بہکی باتیں کررہی ہو.....؟'' وہ میری بات کاٹ کر تیزی سے بولیں اور میرا منہ تکنے لگیں۔ ان کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ یہ بتاؤ..... میں کون ہوں؟ بتاؤ.....؟ میں کون ہوں.....؟'' ان کا لہجہ خشک سا ہوگیا۔

''آپ گنی ہیں.....؟'' میں نے انہیں حقارت بھری نظروں سے دیکھا اور نفرت بھرے لہجے میں بولی تو میں نے جرات سے کام لیا۔ آپ نے میرا سودا ایک عیاش شخص سے کیا ہے جس کی آپ داشتہ بھی رہی ہیں۔ وہ ایک لڑکی کو پانچ سات لاکھ کے عوض خرید رہا ہے تاکہ مجھ سے ایک کھلونے کی طرح کھیل کے خلیج میں لے جا کر کسی شیخ کے ہاتھ بیچ دے۔ کیا یہ حرکت اور سودا کوئی شریف عورت کرسکتی ہے؟ ایک نائکہ اور کنجر عورت ہی کرسکتی ہے؟'' میں ایک سانس میں بول گئی۔ ''آپ اتنی ذلیل ہیں.....؟'' میرے سینے میں سانسوں کا زیر و بم اٹھنے لگا تو میں مزید بول نہ سکی اور نہ ان کے چہرے پر تھوک سکی۔ آنٹی بھوچکی سی ہوگئیں۔ ان پر ایسا سکتہ طاری ہوگیا جیسے کوئی افتاد سی آ گری ہو۔ میرے الفاظ ان پر برق بن کر گرے تھے۔ انہیں شاید اس بات کی توقع نہیں تھی کہ اس قدر ذلیل کروں گی۔ کھری کھری سناؤں گی۔ کسی بات کا لحاظ نہیں کروں گی۔ وہ مجھے اس وقت ایک نئے روپ میں اور ایک خطرناک عورت دیکھ رہی تھیں۔ دوسرے لمحے انہیں شاید کچھ احساس ہوا تھا کہ میں نے ان کی گفتگو سن لی ہے۔ وہ سنبھل کر کسی عیار عورت کی طرح مسکرائیں اور کہنے لگیں۔

''تو تم نے ہماری گفتگو سن لی ہے۔ تم نے جو کچھ سنا اور سمجھا ہے تمہاری سماعت کا فتور ہے۔ تمہارے ہونے والے شوہر سے جو لاکھوں روپے

وصول کیے ہیں وہ تمہارے حسن و شباب اور جسمانی کشش کی قیمت نہیں ہے اور نہ ہی ہم اس کے ہاتھوں تمہیں فروخت کر رہے ہیں۔ یہ تو حق مہر کا مطالبہ ہے۔ مہر کی رقم پر تمہارا اپنا حق ہے۔ کوئی بھی اس میں ایک روپیہ بھی نہیں لے سکتا۔ نکاح کے فوراً بعد تمہیں وہ رقم دے دی جائے گی۔ ہمیں تمہاری یہ رقم لے کر کرنا کیا ہے؟ مہر کی رقم اس لیے اتنی رکھی گئی ہے کہ کہیں وہ تم سے جی بھرنے کے بعد طلاق نہ دے دے...... ایسا آج کل ہونے لگا ہے۔ معمولی رقم مہر کی رکھی جاتی تاکہ لڑکی سے سیر ہو کر اسے طلاق دے دی جائے۔'' آنٹی نے سانس لینے کے لیے توقف کیا۔

جس وقت آنٹی ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہہ رہی تھیں تب میری نظریں انہی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے ان کی باتوں نے میرے دل کی ساری کثافت دھو دی تھی۔ ان کی باتوں میں ذرہ برابر بھی ریاکاری اور منافقت محسوس نہیں ہوئی۔ ان کے چہرے پر ایک مخصوص قسم کی معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ ان کی آنکھوں سے بھی سچائی جیسے عیاں تھی۔ انہوں نے میری تیز و تند اور کھری کھری باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا تھا۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتی تو وہ نہ جانے اس کے ساتھ کیا بدسلوکی کرتیں......؟ اسے شاید دودھ میں گری مکھی کی طرح نکال پھینکتیں۔

''مجھے معاف کر دیں آنٹی! پلیز آنٹی......!''

میں نے ایک مجرم کی طرح سر جھکا کے بڑی ندامت سے کہا اور یہ آواز تھی کہ حلق میں کسی گولے کی طرح اٹک رہی تھی اور میں شرم سے گڑی جا رہی تھی۔ اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں سر اٹھا کے ان سے نگاہیں ملا سکوں۔ ''میں نے آپ کو سمجھنے میں بڑی غلطی کی...... میں نے جذباتی اور غلط فہمی کا ہو کر نہ جانے کیا کچھ آپ سے کہہ دیا...... آئندہ میں ایسی کوئی بات زبان سے نہیں نکالوں گی۔ میں بہت شرمندہ ہوں آنٹی!''

آنٹی نے میرے قریب آ کر مجھے چوما۔ پھر میرے شانے پر ساڑی کا پلو درست کیا پھر بڑے دل کش انداز سے مسکرائیں اور پیار بھرے لہجے میں بولیں۔

''نکاح میں دیر ہو رہی ہے...... چلو بیٹی! میرا دل تمہاری طرف سے بالکل صاف ہے...... آخر تم میری بیٹی جو ہوئیں۔''

آنٹی نے میری بانہہ تھام لی اور میں نگاہیں نیچی کیے خراماں خراماں، شرماتی، لجاتی ہوئی نظروں سے نشست گاہ میں پہنچی جہاں میرا انتظار ہو رہا تھا۔ نشست گاہ میں مجھے ایک بڑے صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ اس وقت میرے دل میں خوشی سے لڈو پھوٹ رہے تھے کہ آنٹی کو میرا اتنا خیال اور احساس ہے۔ میری زندگی کے تحفظ اور مستقبل کا...... حق مہر کی رقم پانچ لاکھ جو نکاح کے بعد ملے گی میں اسے بینک میں اپنے نام سے جمع کرا دوں گی۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے جانے کیوں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ میں اپنے ہونے والے شوہر کو ایک نظر دیکھ لوں۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی کن انکھیوں سے سامنے کی طرف دیکھا۔ میرے سامنے والی صوفے پر قاضی صاحب اپنے ہاتھ میں رجسٹر لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے برابر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس شخص کے چہرے پر جیسے ہی میری نگاہ پڑی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گرم گرم سیسہ میرے بدن میں اترتا جا رہا ہے۔ کیا اس شخص سے میری شادی ہو رہی ہے؟ یہ، یہ میرا رفیق زندگی ہے؟

میرے تن بدن میں ایک آگ سی لگ گئی اور رگوں میں نفرت اور غصے سے لہو ابلنے لگا۔ وہ آدمی نہیں کوئی گینڈا تھا۔ کسی بھینسے کی طرح موٹا اور بھدا تھا اس کی چہرے سے کمینہ پن ٹپک رہا تھا اور آنکھوں سے خباثت جھانک رہی تھی اور وہ مجھے کسی بھوکے بھیڑیے کی طرح گھورے جا رہا تھا۔ اس پر کسی پیشہ ور قاتل کا دھوکا ہوتا تھا۔ وہ یقیناً منشیات فروش یا اسمگلر تھا۔ اتنی بڑی رقم ایک جوان اور حسین لڑکی پر پانی کی طرح بہا دینا ایسے جرائم پیشہ کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اس کی عمر ساٹھ برس سے کم نہ ہوگی۔

اس کے سر میں سفید بالوں کی بھرمار تھی۔

میں بدک کر ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔ آنٹی میرے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے شدید حیرت سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

''کیا بات ہے دردانہ بیٹی.....! تم اس قدر پریشان کیوں ہورہی ہو..... خیریت تو ہے نا؟''

یہ میری ساری زندگی کا معاملہ تھا۔ میں نے شرم کو بالائے طاق رکھ کر اس شخص کی طرف نفرت بھری نظروں سے دیکھا اور تنک کر پوچھا۔

''کیا میری شادی اس شخص سے ہورہی ہے؟ اس شخص سے.....''

''ہاں..... ہاں تمہاری شادی مجھ سے ہورہی ہے میرے باپ سے نہیں۔'' آنٹی کے جواب دینے سے پہلے وہ سخت لہجے میں بول اٹھا تھا۔ اس نے اپنی بات ختم کر کے ایک زوردار بھونڈا قہقہہ لگایا۔

میرا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا تھا۔ میں غصے سے پلٹ کر آنٹی سے زہرناک لہجے میں بولی۔

''میں اس گینڈے سے شادی ہرگز نہیں کروں گی۔ آپ اس بھینسے کو کہاں سے پکڑ کے لائی ہیں؟''

وہ ذلیل شخص میری بات سن کر اس طرح سے اپنی جگہ سے اچھل پڑا جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ پھر وہ صوفہ سے ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم شادی کیوں نہیں کرو گی..... تو کیا تیری ماں بھی کرے گی؟ میں نے تمہاری پوری قیمت ادا کی ہے۔ اتنی قیمت کوئی نہیں دے سکتا۔''

''پورے پانچ لاکھ روپے دیے ہیں..... اس کے علاوہ زیورات اور ملبوسات کے لیے دو لاکھ بھی..... منہ دکھائی میں ہیرے کی انگوٹھی دوں گا۔''

''لعنت ہے تم پر تمہارے پانچ لاکھ اور دو لاکھ پر۔'' میں برافروختہ ہوگئی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ''اپنی رقم لے کر یہاں سے دفع ہوجاؤ۔ ہیرے کی انگوٹھی میرے لیے دو کوڑی کی نہیں میں تم سے کسی قیمت پر شادی نہیں کروں گی۔''

انکل جو ایک طرف کھڑے خاموش یہ تماشا دیکھ رہے تھے میرے پاس آ کر مجھے نرمی سے سمجھانے لگے۔

''دردانہ بیٹی! تم اپنے ہونے والے شوہر کے بارے میں کس قسم کے الفاظ زبان سے نکال رہی ہو۔ میں نے تمہاری رضامندی پا کر اس سے شادی کی اجازت دی تھی۔ تم ہو کہ اب اس سے شادی سے انکار کررہی ہو؟ اس سے گستاخی سے بھی پیش آرہی ہو؟''

''آپ کیسے انکل ہیں جو میری شادی اپنی عمر کے شخص سے کررہے ہیں؟ اور پھر مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ میری شادی ایک خبیث شخص سے کریں گے؟'' میں نے تنک کر کہا۔ ''کیا اس کا اور میرا کوئی جوڑ ہے؟''

''یہ شخص تمہارے لیے بہت اچھا شوہر ثابت ہوگا۔ اس کے پاس بے پناہ دولت اور جائداد جس کا اندازہ تم نہیں کرسکتیں۔ تم ساری زندگی عیش کرو گی۔'' عیش کرو گی اور یہ تمہیں کسی شہزادی کی طرح ساری زندگی رکھے گا۔ ایسی زندگی اور ایسے شخص کو لات مار رہی ہو؟''

''اس خبیث شخص نے فوراً ہی اپنا سر ہلا دیا اور کہنے لگا۔

''تمہارے انکل بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم میری بیوی بن جاؤ گی تو تمہاری دنیا ہی بدل جائے گی۔ تمہیں دل کی رانی بنا کر رکھوں گا۔''

''میں نے صاف صاف کہہ دیا ہے نا کہ میں کسی قیمت پر اس سے شادی نہیں کروں گی۔ اس سے شادی کرنے سے میرا مرجانا بہتر ہے اس کمینے، خبیث اور بدکار سے کہو کہ وہ اپنی رقم لے کر یہاں سے دفع ہوجائے۔'' میرا پارہ چڑھ گیا۔

آنٹی کے تیور اک دم سے بدل گئے۔ ان کے چہرے پر سفاکی ابھر آئی اور آنکھیں انگارہ بن گئیں۔ انہوں نے میرا بازو سختی سے پکڑا اور بڑی بے رحمی سے بٹھا دیا۔ ان کا چہرہ سرخ ہو کر تمتمانے لگا۔ وہ کڑک کر بولیں۔

''دردانہ.....! تم اپنی حد سے نکلی جارہی ہو۔ تم ہماری نوازشات اور احسانات کو فراموش کررہی ہو۔ تم یہ بات بھول رہی ہو کہ ہم تمہیں نالی سے نکال کر محل میں لائے تھے۔ تم سیدھی طرح اپنا نکاح پڑھواؤ ورنہ نہیں تو میں.....''

انہوں نے اپنا جملہ ادھورا اور ان کا یہ جملہ بھی زہر آلود تھا۔

وہ مجھے اس لمحے کسی بدروح کی نظر آرہی تھیں۔ ان کا اصل اور مکروہ چہرہ سامنے آیا تو وہ چڑیل دکھائی دینے لگیں۔ کاش! اس دن نظر آجاتا جب وہ مجھے لینے آئی تھیں۔ میں ان کے ساتھ ہرگز نہیں آتی۔ وہ ہمدردی اور شرافت کا لبادہ اوڑھ کر آئی تھیں۔ میں اس لیے دھوکا کھا گئی تھی کہ فکرمند، پریشان اور حالات سے ہراساں اور حد درجہ خائف بھی تھی۔

میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو اس طرح چھڑایا جیسے وہ کوئی چڑیل ہو اور انہیں غیر محسوس انداز سے دھکا دے کر صوفے پر گرادیا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکیں۔ پھر میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر پھنکاری۔

''اب مجھے کوئی بھی ہاتھ نہ لگائے..... میں ایک بے سہارا اور غریب کی بیٹی ضرور ہوں لیکن بکاؤ مال نہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ لوگ شیطان صفت ہیں..... ملعون اور جرائم پیشہ ہیں۔ مجھے اس لیے لائے ہیں کہ میرا سودا کریں۔ لیکن آپ یہ بات یاد رکھیں..... کان کھول کر سن لیں میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو آپ جیسی سیٹھیوں کے ہاتھوں بک جاتی ہیں۔ مجھے آپ جیسی ڈائن اور شیطان اور رنڈیوں جیسی عورتو سے نمٹنا آتا ہے۔ میری ماں نے مجھے حالات اور نشیب و فراز سے مقابلہ کرنا سکھایا ہے۔''

''میں یہاں سے ابھی اور اسی وقت جارہی ہوں۔ کوئی میرے راستے میں حائل ہونے اور مزاحمت کرنے کی کوشش نہ کرے۔ جو بھی میرے سامنے آیا نہ صرف اس کا منہ نوچ لوں گی بلکہ یہ جو میرے ہاتھ کے لمبے لمبے ناخن ہیں اس سے آنکھیں پھوڑ دوں گی اور چہرے پر ایسی خراشیں ڈالوں گی مسخ ہوکر رہ جائے گا۔ تمہاری ماں بھی نہیں پہچان سکے گی۔ سن رہے ہو حرام زادو.....''

میں ایک ہی سانس میں تیز و تند لہجے میں کہتی چلی گئی۔ میرا سینہ بری طرح دھڑک رہا تھا اور سانس اس طرح پھول رہی تھی جیسے بہت دور سے تیز دوڑتی ہوئی آئی ہوں۔ ان سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ ان کے چہرے متغیر اور بے لہو ہوتے گئے۔ شاہد انکل اور آنٹی کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میں شعلہ مجسم بنی ہوئی تھی۔ میرے الفاظ، برہمی اور تیور نے گہرا اثر کیا تھا۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ ایک سیدھی سادی لڑکی زخمی شیرنی کی طرح غضب ناک ہوجائے گی۔

''لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے ہیں۔'' آنٹی دوسرے لمحے بولیں اور پھر انکل کی طرف اشارہ کیا۔ ''آپ اسے روک کر رکھیں۔ جانے نہ دیں۔'' ''میں ابھی آتی ہوں..... دراصل اسی چیونٹی کے پر نکل آئے ہیں۔ یہ بڑی خطرناک ہے۔ کیسی بھولی اور سیدھی اور معصوم بنی ہوئی تھی آفت کی پرکالہ ہے۔''

وہ اپنی بات ختم کرکے تیزی سے کچن کی طرف کوندا بن کے لپک گئیں جیسے وہاں سے چھری لاکر میرے سینے میں بھونک دینا چاہتی ہوں۔ میں نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے سوچا کہ کیوں نہ اپنے کمرے میں بند ہوکر کمرے سے خوب شور مچا مچا کر محلے والوں کو اکٹھا کرلوں۔ میں اپنے کمرے میں جانے کے ارادے سے سرعت سے گھومی تھی کہ انکل نے لپک کر میرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میں نے اپنا بازو چھڑانے کے لیے پورا زور لگادیا۔ کسی نہ کسی طرح بازو چھڑا لیا تھا کہ انکل میرا دوسرا بازو بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا۔ گرفت بڑی سخت تھی۔ میں ہذیانی لہجے میں چیخی۔

''کمینے..... ذلیل میرا بازو چھوڑ دے۔ ورنہ

تیرا حشر نشر کردوں گی۔''

''نہیں۔'' وہ ذلیل سخت لہجے میں بولا۔''شرافت سے کھڑی رہ..... ورنہ تمہارا حلیہ بگاڑ دوں گا۔ تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔''

''ذلیل..... کمینہ اور کنجر جو اپنی ماں بیٹیوں کا سودا کرتا ہے۔ بے شرم..... بے غیرت۔''

میں نے اتنا کہہ کر دوسرے ہاتھ اس کے منہ پر ایک زور دار تھپڑ رسید کیا اور اس کے منہ پر تھوک دیا۔

جب اس نے دیکھا اور محسوس کیا کہ میں شیرنی بنی ہوئی ہوں اور مجھ پر قابو پانا دشوار اور ناممکن سا ہو رہا ہے تو اس نے اپنی مدد کے لیے اس خبیث شخص کو بلا لیا۔ ان دونوں نے مجھے پکڑ کے بے بس کر دیا اور صوفے پر بٹھا دیا۔ اس دھینگا مشتی کی وجہ سے نہ صرف میری سانسیں بھی پھول رہی تھیں بلکہ ان دونوں کی سانسیں پھولنے لگی تھیں۔ وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔ کیوں کہ میں نے مزاحمت اور جدوجہد کی تھی کہ ان کے قابو میں نہ آؤں۔ اس آدمی نے میری بے بسی دیکھی تو مسکرا کر مجھے آنکھ بھی ماری۔

میرا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ میں اس کی آنکھیں پھوڑ دیتی۔ اس نے مجھے جو آنکھ ماری تھی فحش اور غلیظ اشارہ تھا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور رگوں میں لہو ابلنے لگا تھا۔ پھر میں نے بے خوفی اور حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

''تم دونوں ذلیلوں اور سوروں یہ مت سمجھنا کہ میں ایک لڑکی ہوں۔ تم دونوں کا بال تک بیکا نہیں کر سکتی ہوں۔ تم دونوں کو بخش دوں گی۔'' چوں کہ میری سانس پھول رہی تھی اور سینہ بری طرح دھڑک رہا تھا۔ سانس قابو میں آئی تو خشونت بھرے لہجے میں بولی۔''تم دونوں کے چہرے کا جغرافیہ جوتی مار مار کر ایسا بگاڑ دوں گی کہ تم خود بھی اپنے آپ کو پہچان نہ سکو گے۔ ذرا میرا ہاتھ چھوڑ کر تماشا دیکھنا۔ ایسا تماشا جو تم نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔'' میں اپنی بے بسی پر تپ رہی تھی کہ میرے ہاتھ آزاد نہیں ہیں۔

چند لمحوں کے بعد آنٹی کچن سے آئی تو ان کے ہاتھ میں چھری کے بجائے شربت جیسی بوتل تھی۔ اس بوتل میں جو سیال تھا اس کی رنگت دیکھ کر میں نے پہچان لیا یہ تیزاب تھا۔ تیزاب کی بوتل دیکھتے ہی میرے سارے بدن پر ایک جھرجھری سی آ گئی اور میرا دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا۔ ایک نا معلوم سا خوف کسی زہریلے ناگ کی طرح ڈسنے لگا۔

آنٹی بوتل لہراتی ہوئیں میرے سر پر کسی چڑیل کی طرح آ کھڑی ہوئیں۔ سرد سفاک لہجے میں بولیں۔

''دیکھو دردانہ ..... ہم اب تک تحمل اور برداشت سے کام لے رہے تھے۔ بہت ہو چکا۔ تمہاری گالیاں تک سن لیں..... تمہاری خیریت اس میں ہے کہ چپ چاپ نکاح پڑھوالو..... ورنہ یہ تیزاب نہ صرف تمہارے چہرے اور جسم پر پھینک کر ساری زندگی کے لیے اس قدر بھیانک اور مکروہ بنا دوں گی تو تمہیں کوئی دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔''

جب ہی شاہد انکل نے بھی ہزیانی لہجے میں کہا۔

''قاضی صاحب.....! یہ تم الوؤں کی طرح ہماری شکل کیا دیکھ رہے ہو..... چلو جلدی کرو نکاح پڑھا دو..... اب یہ لڑکی کچھ کرنے کی نہیں..... پوری طرح ہمارے قابو میں آ چکی ہے۔ اس کی عقل ٹھکانے آ چکی ہے۔ سمجھے کہ نہیں سمجھے۔''

وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اس میں میری مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ جبر و زبردستی سے میرا نکاح پڑھایا جانے لگا میں نے نکاح کے وقت قبولیت سے صاف انکار کر دیا۔ میں نے بے خوفی سے کہا کہ منظور نہیں۔ منظور نہیں۔ اس کے باوجود کہ میں نے کہا کہ یہ گینڈا، سور مجھے کسی قیمت پر قبول نہیں ہے۔ اس کمینے پر اور قاضی پر لعنت بھیجتی ہوں کہ میرا نکاح جبر سے پڑھا رہے ہو۔ تم دوزخی ہو گئے ہو۔ میں نے قبول کی جگہ..... لعنت ہے۔ لعنت ہے۔ لعنت ہے۔

اس کے باوجود قاضی نے میرا نکاح زبردستی پڑھا دیا۔ آنٹی تیزاب کی بوتل لیے کھڑیں میرے سر پر جیسے سوار تھیں۔ پھر بھی میں نے بے خوفی سے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''کیا آپ قاضی ہیں .....؟ کیا قاضی ایسے ہوتے ہیں؟ کیا ان کے تقدس پر بدنما دھبا نہیں ہیں۔ آپ کے ضمیر اور ایمان کی کیا قیمت ہے؟ اگر آپ واقعی قاضی ہیں تو خوف خدا کریں۔ میدان حشر میں خدا کو کیا جواب دیں گے؟ یہ سوچا آپ نے؟''

نکاح نامہ پر میرے بجائے آنٹی نے خود اپنے دستخط کر دیے۔ کیوں کہ میں نے نکاح نامہ پر دستخط کرنے کے بجائے اسے پھاڑنے کی کوشش کی تھی۔ نکاح کی کارروائی جو ایک ڈراما تھی پوری ہونے کے بعد آنٹی اور انکل نے مجھے دونوں طرف سے پکڑ لی۔ اس کے بعد میرے خود ساختہ اور نام نہاد شوہر زمان نے قاضی کو دو ہزار کی رقم دی۔ اسے وہ رخصت کر کے اندر آیا تو بہت خوش تھا۔

قاضی کے دفع ہونے کے بعد، چند لمحوں کے بعد انکل اور آنٹی مجھے قربانی کے جانور کی طرح کھینچ کر باہر لائے تو میں نے ایک سرخ رنگ کی نئی گاڑی دیکھی۔ اسے گاڑی میں اسٹیرنگ پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ جو شاید ڈرائیور تھا۔ اس نے گاڑی سے باہر آ کر دروازہ کھولنے اور بند کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس میں ایک عجیب سی بے پروائی اور بے نیازی تھی اور نہ ہی اس نے مجھے دیکھا۔ زماں نے خود ہی آگے بڑھ کر پچھلی نشست کا دروازہ کھولا تھا۔ پہلے وہ اندر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میرے بیٹھتے ہی مجھے آغوش میں لے کر میرے چہرے پر جھک جائے گا۔ گلی سنسان اور ویران پڑی تھی اور نیم تاریکی کی آغوش میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گلی اور پڑوس کے مکانوں کی روشنیاں بھی گل تھیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں کیا کروں؟ کیا کچھ کر سکتی ہوں؟ میں نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے مزاحمت کرتے ہوئے کہا۔

''آنٹی! تم میری جگہ کیوں نہیں چلی جاتی ہو..... تم ایک برس تک اس کی داشتہ اور رنڈی بنی رہی ہو۔''

آنٹی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنٹی کا بس چلتا تو وہ میرے چہرے پر تیزاب انڈیل دیتیں لیکن وہ ایسا کرنے سے اس لیے باز رہی تھیں کہ میرے سودے کی رقم چلی جاتی۔ انکل شاہد نے اس بات پر اس لیے توجہ نہیں دی تھی اور وہ سمجھے تھے کہ میں نفرت اور غصے میں بول رہی ہوں۔ میں ان دونوں کے مقابلے میں کمزور تھی۔ اکیلی مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ مجھے کسی قربانی کے جانور کی طرح بے رحمی سے گھسیٹتے ہوئے، دھکیلتے اور دھکے دیتے ہوئے گاڑی کے دروازے تک لائے۔ میں نے ایک اور آخری کوشش کی گاڑی کے اندر قدم نہ رکھوں۔ اپنا پورا زور لگا دیا لیکن ناکام رہی۔ دونوں مجھے گاڑی کے اندر بٹھانے کے لیے پوری قوت سے کوشش کرنے لگے۔ معاً میری نظر اسٹیرنگ پر بیٹھے ہوئے شخص پر پڑی۔ وہ ایک جوان اور خوب صورت شخص تھا۔ وہ حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مجھے یہ خوف سا دامن گیر ہو رہا تھا کہ شاید وہ ان کی مدد کو آئے۔ کیوں کہ وہ خبیث کی گاڑی کا ڈرائیور جو تھا۔ مگر اس کی نوبت نہ آئی۔ کیوں کہ زمان نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بڑی بے رحمی اور قوت سے اندر کھینچا تھا۔ میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی اس کے اوپر جا گری تو اس نے مجھے چومنا چاہا لیکن میں سرعت سے سنبھل گئی اور دروازے کی طرف جانا چاہا۔ اس لمحے انکل نے دروازہ بند کر دیا۔ زمان کا چہرہ میری اس مزاحمت پر غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ میرے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیتا۔

زمان نے میرا بازو مضبوطی سے پکڑ کر عقبی آئینے میں ڈرائیور کو گھورتے ہوئے تیز و تند لہجے سے مخاطب کر کے کہا۔

''تم یہ کیا تماشا دیکھ رہے ہو؟ کیا یہ کسی فلم کی

شوٹنگ ہو رہی ہے؟ جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کرو اور چل پڑو۔ بہت دیر ہو چکی ہے۔ جلدی کرو۔'' اس نے فوراً ہی گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا تو آنٹی بولیں۔

''جاؤ بیٹی! ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا..... خوش رہو..... تمہیں نئی زندگی مبارک ہو۔''

''کتیا.....!'' میں نے کھڑکی سے ان کے منہ پر تھوک دیا۔ ''چھنال.....!''

ڈرائیور نے چوں کہ گاڑی اسٹارٹ کی ہوئی تھی اس کے انجن کے شور میں اسے شاید میری آواز سنائی نہیں دی۔ وہ سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا اس لیے اس نے میری حرکت کو نہیں دیکھا اور میں نے جو کچھ کہا اسے سنا نہیں..... دوسرے لمحے گاڑی سیدھی اور پتلی سی سڑک پر دوڑنے لگی۔ اس کی رفتار لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی جیسے کوئی عفریت تعاقب میں ہو۔

میں نے محسوس کیا کہ زمان کے ہاتھ کی گرفت میرے گرد سخت ہوتی جا رہی ہے۔ اسے یہ خوف تھا کہ کہیں میں چلتی گاڑی کا دروازہ کھول دوں۔ گاڑی کے رکتے یا رفتار کم ہوتے ہی میں چھلانگ نہ لگا دوں۔ میرے دوسرے بازو میں درد اور تکلیف ناقابل برداشت ہونے لگی۔ اس کمینے نے نہ جانے مجھے کیا سمجھ لیا۔

''مردود..... پاجی..... اپنا ناپاک ہٹاؤ، گاڑی رکواؤ اور مجھے جانے دو۔'' میں نے ہذیانی لہجے میں چیختے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے زبردستی اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ تم مجھے اغوا کر کے لے جا رہے ہو..... سور۔'' میرے منہ سے گالیوں کا فوارہ ابل پڑا۔

''میں زبردستی کہاں لے جا رہا ہوں.....؟'' اس نے استہزائیہ انداز سے قہقہہ لگایا۔ ''میں نے تم سے باقاعدہ نکاح کیا ہے۔ قاضی نے نکاح پڑھایا ہے..... تمہیں باعزت طریقے سے تمہارے ماں باپ کے گھر سے رخصتی کروا کے لے جا رہا ہوں۔ تم اسے اغوا کا نام نہ دو۔ اب تم میری ملکیت ہو۔ میں جب اور جس وقت اور جہاں چاہوں من مانیاں کر سکتا ہوں۔ کھیل سکتا ہوں۔''

''وہ نکاح نہیں تھا۔'' میں نے بگڑ کے برہمی سے کہا۔ میں نے اس کے ہاتھ کمر اور سینے سے الگ کر کے کنارے ہو کر بیٹھ گئی۔ ''یہ منحوس ہاتھ دور رکھو۔''

''وہ نکاح نہیں تھا تو پھر کیا تھا.....؟'' وہ ہنس کر بولا۔ ''کیا تم نے تین مرتبہ ایجاب وقبول نہیں کیا تھا؟ نکاح نامہ پر دستخط نہیں کیے تھے؟''

''وہ نکاح نہیں فراڈ تھا، ڈھونگ تھا، ناٹک تھا۔'' میں نے زہر خند کہا۔ ''میں نے تین مرتبہ لعنت بھیجی تھی۔ تین مرتبہ آنٹی نے ایجاب وقبول کیا تھا۔ نکاح نامہ پر میرے بجائے آنٹی نے میرے نام سے دستخط کیے۔ اب میں نہیں وہ تمہاری بیوی ہے۔ تم نے ایک برس اس چھنال کو داشتہ رکھا تھا۔ تمہیں اس نکاح کے روسے اسے ساتھ لے جانا چاہیے تھا۔ میں کسی بھی لحاظ سے تمہاری بیوی نہیں ہوں۔ تم مجھ سے شادی کر کے نہیں بلکہ خرید کے لے جا رہے ہو۔ میں نوکرانی بھی نہیں ہوں۔ اس لیے تو میں کہہ رہی ہوں کہ تم مجھے اغوا کر کے لے جا رہے ہو..... تم پر حرام کاری اور بے حرمتی کا کیس بنتا ہے۔''

''تمہارے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''قاضی کے پاس جو نکاح نامہ ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارا نکاح ہو گیا۔ گواہ اور قاضی بھی ہیں۔ اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا، نہ تم اور نہ ہی قانون..... اب تم میری جان ہی نہیں بلکہ شریک حیات بھی ہو۔''

''تم مجھے یا دنیا کو بے وقوف نہیں بنا سکتے ذلیل آدمی! ایسے نکاح نہیں ہوتا اور نہ کہلایا جاتا ہے کیا تم نے نکاح کو مذاق سمجھا ہوا ہے؟'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم ایک بدکار اور اوباش آدمی ہو۔ تم نکاح کے بہانے مجھے جبر و زبردستی سے لے جا رہے ہو۔ قاضی کے اس طرح نکاح پڑھانے سے کیا ہوتا ہے؟''

وہ میری زبان سے سخت کلمات سن کر طیش میں آ گیا تھا۔ اس نے مجھے مارنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھایا

تو میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ اک دم بھوچکا سا ہوگیا۔ پھر لال پیلا ہوگیا۔ میری کمر میں ڈال کر قریب کرلیا۔ اسے پرے دھکیل کر دیکھا تو گاڑی کھیل کے ایک بڑے میدان میں کھڑی نظر آئی۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ وہ ویران اور سنسان پڑا تھا۔

زمان نے سنبھل کر میرا بازو چھوڑ کے باہر جھانکتے ہوئے ڈرائیور سے پوچھا تو اس کے لہجے میں غصہ اور حیرت تھی۔

''تم نے گاڑی یہاں کیوں روکی؟ کیا خراب ہوگئی ہے؟''

اس شخص نے جواب دینے کے بجائے گاڑی کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھولا۔ پھر وہ باہر آ گیا۔ اس نے لپک اور جھک کر اسٹیرنگ کے نیچے سے کوئی چیز نکالی تو وہ ہاکی تھی۔ اس نے ہاکی کو فضا میں لہراتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

''سیٹھ صاحب! اگر آپ ذرا باہر تشریف لے آئیں تو بڑی نوازش ہوگی۔''

''کیا کہا.....؟'' زمان نے حیرت اور غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں باہر کیوں آؤں؟ یہ تو کیا بکواس کررہے ہو؟ سیدھی طرح چلے کیوں نہیں ہو؟''

ڈرائیور کی اس اچانک اور غیر متوقع حرکت پر میں چونکے بغیر نہ رہ سکی اور اپنی جگہ ششدر ہوکر رہ گئی۔ اس کی یہ حرکت بڑی جارحانہ انداز کی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔

زمان بری طرح بوکھلا گیا۔ ہراساں ہوگیا۔ اس کا خون شاید خشک ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ طاری ہوگئی تھی۔ مگر اس نے دوسرے لمحے خود کو سنبھال لیا تھا۔ وہ اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ کر بولا۔

''یہ کیا بدمعاشی ہے؟ میں نے تمہیں منہ مانگی رقم دی ہے۔ پورے ایک ہزار پیشگی دے چکا ہوں۔ ایک ہزار کم نہیں ہوتے ہیں جو تم ہمیں اس ویران اور سنسان جگہ کیوں اتار رہے ہو؟ یہ کہاں کی شرافت ہے؟''

''شرافت کی ماں کو مرے عرصہ ہوگیا ہے۔'' اس نے ہاکی کو زمین پر مارتے ہوئے تیز اور سفاک لہجے میں کہا۔ ''اگر شرافت کی اولاد ہو تو سیدھی طرح سے گاڑی سے نیچے اتر آؤ۔ تمہاری دلہن گاڑی کے اندر ہی رہے گی اور ہاں زیادہ چیخ و پکار کی ضرورت نہیں.....ورنہ بھیجہ باہر نکال دوں گا۔''

''صرف میں.....؟'' اس نے اچھل کر پہلے تو میری طرف دیکھا اور بعد میں ڈرائیور کی طرف..... پھر وہ تپ گیا۔ پھر بھناتے ہوئے بولا۔ ''وہ کس لیے؟ یہ عورت میری بیوی ہے.....اور میرے ساتھ ہی رہے گی۔''

''میں جو کہہ رہا ہوں اور حکم دے رہا ہوں اس پر عمل کرو۔'' وہ غرایا۔ ''میرے پاس تمہاری ان فضول باتیں سننے کو وقت نہیں ہے۔ اور نہ ہی میرے پاس اگر مگر کے لیے کوئی گنجائش ہے۔ میری بات تمہاری کھوپڑی میں آرہی ہے یا نہیں۔''

زمان جیسے اس کے تیور اور تحکمانہ لہجے سے ہراساں اور حد درجہ خائف ہوگیا تھا۔ اس کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ اس کی حالت ایک مردے سے بھی بدتر ہورہی تھی۔ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

''اگر تم ہمیں کسی وجہ سے نہیں لے جانا چاہتے ہو تو کوئی بات نہیں۔ تم اپنی گاڑی لے جاؤ۔ ہم دونوں کوئی دوسری سواری کرلیں گے۔'' زمان نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر میرا ہاتھ اک دم سے پکڑ لیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''آؤ جان.....ہم دوسری ٹیکسی پکڑ لیتے ہیں۔ سڑک پر کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔''

میں نے ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑالی اور تیز لہجے میں بگڑ کر برہمی سے بولی۔

''وہ تم سے اترنے کے لیے کہہ رہا ہے.....مجھ سے نہیں، میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی.....کان کھول کر سن لو۔''

اس شخص نے ہاکی زمان کے گلے میں ڈال دی۔ اور اس کی مدد سے اسے باہر کھینچتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔

''اسے اندر ہی بیٹھے رہنے دو۔ وہ ہمیں بہت اچھی لگ رہی ہے۔''

زمان نے پھر بھی پس و پیش کیا تو اس نے زمان کو اس قدر بے رحمی سے کھینچا وہ درد اور تکلیف سے چیختا اور کراہتا ہوا باہر نکل آیا اور باہر آ کر وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا کسی گیند کی طرح زمین پر لڑھک گیا تھا۔ دوسرے لمحے وہ اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تو زمان نے اس کی پشت پر ہاکی سے ایک ہلکی سی ضرب لگائی۔

''تم مجھے کیوں مار رہے ہو؟'' زمان نے کراہ کے احتجاج کیا۔ ''میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ تم میرے دشمن کیوں ہو رہے ہو؟''

''اس لیے کہ تم اس عورت کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آ رہے ہو اور دست درازی بھی کی ہے۔ اس سے من مانیاں کرنے والے تھے...... ٹیکسی کو بیڈ روم بنا رہے تھے۔ پولیس موبائل والے دیکھتے تو میری بھی شامت آ جاتی اور تمہیں فحش حرکات کے الزام میں اور اس غریب عورت کو بھی لے جاتے۔ وہاں تمہارے جوتے پڑتے اور مال بھی کھا جاتے لیکن اس عورت کی آبرو کی خیر نہیں ہوتی کیوں کے تھانے میں کالی بھیڑیں ہوتی ہیں۔ اس عورت سے اجتماعی زیادتی کرتے...... کیا اخبار نہیں پڑھتے ہو۔ آئے دن ایسی خبریں چھپتی رہتی ہیں۔''

''او گینڈے...... کمینے کیا ایک عورت کے ساتھ ایسے پیش آیا جاتا ہے......؟''

''یہ عورت میری بیوی ہے...... میں اس سے کسی طرح بھی پیش آؤں، تمہیں اس سے کیا......؟'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔ وہ اپنا دفاع کرنے لگا۔ ''تم میاں بیوی کے معاملات میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟''

''یہ کس نے کہہ دیا کہ یہ عورت تمہاری بیوی ہے......؟'' اس شخص نے کہا۔ ''کیا بر سر عام بیوی سے فحش حرکات اور بوس و کنار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے؟ یہ عورت کہہ رہی ہے کہ تم اسے زبردستی اغوا کر کے لے جا رہے ہو؟ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ تمہاری بیوی ہے؟''

''قاضی نے ہمارا نکاح پڑھایا۔ آنٹی اور انکل بھی گواہ ہیں۔'' زمان نے پھر دفاع کیا۔ ''میری بات کا یقین نہیں ہے تو عورت سے پوچھ لو۔''

''لیکن یہ عورت کہہ رہی ہے کہ تم اسے اغوا کر کے لے جا رہے ہو؟'' وہ تیز لہجے میں بولا۔

''یہ ہماری محبت کی شادی ہے۔'' زمان نے جواب دیا۔ ''یہ مجھے چھیڑ رہی ہے۔ مذاق کر رہی ہے۔ بڑی شریر ہے۔ شوخ ہے۔''

''کیا تم نے مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے؟'' اس نے مخالف سمت اشارہ کیا اور کرخت لہجے میں کہنے لگا۔ ''اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو ناک کی سیدھ میں چلتے بنو...... خبردار جو مڑ کے دیکھا۔ اگر تم نے ذرا سی چوں چرا کی تو اس میدان میں تمہاری لاش نظر آئے گی۔ میں تمہارا سر پھاڑ کے اور قتل کر کے یہاں پھینک دوں گا۔''

زمان کا چہرہ میں دیکھ نہیں سکی کہ اس شخص ہر دھمکی کا کیا اثر ہوا۔ کیوں کہ اس کی پشت میری طرف تھی اور باہر گھپ اندھیرا تھا۔ یقیناً اس کا چہرہ بے لہو اور مردے سے بھی بدتر ہو گیا ہو گا۔ چہرے پر پھٹکار برسنے لگی ہو گی۔ وہ قدرے متذبذب سا ہو کر مخالف سمت چل پڑا مگر اس کی حالت اس جواری کی سی تھی جس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا پھر بھی وہ بازی جیت نہ سکا اور ہار گیا۔ اس کی چال میں سست روی تھی جیسے اس میں جان نہ رہی ہو۔ وہ بے حال دکھائی دیتا تھا۔ اس کی کوئی حسرت پوری نہ ہو سکی ملیا میٹ ہو کر رہ گئی تھی۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکی کہ ڈرائیور اتنی ہمدردی میرے ساتھ کیوں کر رہا ہے......؟

میں اس لمحہ اتنا سمجھ سکی کہ ڈرائیور نے ہم دونوں

Waqar Azeem Pakistanipoint

کی گفتگو سنی تھی اس لیے اس کے دل میں فتور آ گیا۔ اس نے رستے کا مال سمجھ لیا۔ اس نے مجھے بنگلے سے نکلتے اور گاڑی میں بیٹھتے اور پھر عقبی آئینے میں دیکھا تھا کہ زمان نے میرے ساتھ کیا حرکتیں کیں اور میں نے مزاحمت کی اس لیے وہ جیسے معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ اب میری بے بسی، کمزوری اور مجبوری سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ ہوسکتا ہے کہ میں گاڑی سے اتر کے کسی بھی مخالف سمت دوڑ لگا دوں۔ میں اسکول میں تیز دوڑنے میں اول آتی رہی تھی۔ اور پھر رات کا وقت ہے۔ اس اندھیرے میں اسے نظر نہ آ سکوں گی۔ پھر خیال آیا کہ ساڑھی میں ملبوس ہوں۔ زیورات سے لدی پھندی ہوں۔ تیز دوڑ سکوں گی؟ دوسرے لمحے خیال آیا کہ اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ کیوں کہ اس شخص کے پاس گاڑی ہے۔ وہ چند لمحوں میں مجھے بڑی آسانی سے آلے گا اور پھر وہ ایک ظالم شخص ہے۔ کسی قیمت پر وہ نہیں چاہے گا کہ مفت کا مال ہاتھ سے نکل جائے۔ وہ عقبی آئینے میں مجھے نیم عریاں حالت میں اور گریبان میں خربوزے دھڑکتے ہوئے اس کے جذبات میں ہیجان پیدا کر چکے ہیں۔ وہ جس طرح زمان سے پیش آیا اس سے ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ کس قماش کا ہے۔ اس کھلے میدان اور گھپ اندھیرے میں بھی وہ ایک بھوکے بھیڑیے کی طرح یقیناً رال ٹپکا رہا ہوگا۔ اگر میں نے حکم عدولی کی تو نشانہ نہ بن جاؤں۔ مرد کا کوئی بھروسا نہیں، اس کی اور ناگ کی ایک ہی فطرت ہوتی ہے۔ وہ جبر و زیادتی سے ہر قسم کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ میدان بالکل صاف ہے۔ میرا چیخنا اور شور مچانا بے سود ہے۔ کیوں کہ سڑک خاصی دور ہے۔ وہاں صرف ٹریفک سیلاب کی طرح بہہ رہا ہے۔ گاڑیوں میں تیزی سے گزرتے ہوئے لوگ میری آواز بھی سن نہیں پائیں گے۔ بہتر ہے کہ میں اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر اس طرح چھوڑ دوں جیسے ایک ملاح سمندر میں طوفان میں لہروں کے رحم و کرم پر کشتی کو چھوڑ دیتا ہے۔ میں موقع کی تلاش میں رہوں کہ اپنی عزت پر آنچ نہ آنے دوں..... کیا ایسا ممکن ہوگا؟ کیوں میں جس لباس اور بے حجابی کی حالت میں تھی ایک مرد کے جذبات سے اپنی عزت کو بچا سکوں؟

جب اس نے دیکھا کہ زمان اندھیرے میں گم ہو گیا تو وہ برق رفتاری سے لپک کر میرے پاس آیا۔ میں گاڑی کے سہارے کھڑی ہوئی تھی۔ میں چونک پڑی۔ اس وقت میں خیالوں کی یلغار میں پھنسی ہوئی تھی۔ میں اس سے نکل آئی اور اسے خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ آخر میں ایک پچھی تھی جو ایک پنجرے سے نکل کر دوسرے پنجرے میں آ گئی تھی۔ عیار آخر عیار ہوتا۔ میرے دل کو یہ دھڑکا سا لگ گیا وہ مجھے دبوچ کر بے بس کر دے مجھے مزاحمت اور دفاع بے سود لگا۔ کیوں کہ وہ نہ صرف جوان اور وجیہہ اور دراز قد بھی تھا۔ اس کے بازو فولادی اور سینہ چوڑا چکلا تھا۔ میں اس کی آغوش سے نکلنا تو درکنار کسمسا تک نہیں سکتی تھی۔ پہلے تو اس نے پچھلا دروازہ بند کیا۔ میں پچھلی نشست پر بیٹھ چکی تھی۔ ہراساں اور خائف ہونے کے باوجود..... اس نے اسٹیرنگ سنبھال کر دروازہ بند کر لیا۔ چند لمحوں کے بعد گاڑی کشادہ سڑک پر فراٹے بھرنے لگی جو پکی، ہموار اور سیدھی جا رہی تھی۔ ادھر میرے خیالات بھی تیزی سے سانپوں کی طرح ڈسنے لگے تھے۔ ''دردانہ! اب تو اس شخص کے ہاتھوں سے اپنی آبرو نہ بچا سکے گی۔ تیری قسمت میں تباہی بربادی لکھی ہوئی ہے۔ یہ شخص شب عروسی سنا کر ہی رہے گا۔ جو غیر قانونی اور غیر شرعی ہوگی۔ میں نے خود کو حالات کے دھارے پر اس لیے چھوڑ دیا کہ اگر میں نے کسی سگنل پر دروازہ کھول کر مدد کے لیے شور کیا تو پولیس اس سے بچا تو لے گی لیکن پولیس کی کالی بھیڑوں کا ساری رات کا نشانہ بنتی رہوں گی۔ صبر اور خاموشی سے دیکھتی رہوں کہ کیا حالات پیش آتے ہیں۔

کتنی ہی دیر تک ہم دونوں کے درمیان سکوت طاری رہا۔ وہ تیز رفتاری سے گاڑی تو چلا رہا تھا لیکن

وقفے وقفے سے مجھے عقبی آئینے میں ایک لحظہ کے لیے دیکھ لیتا تھا کہ کہیں میں کوئی ایسی حرکت تو نہیں کروں گی جو پریشانی کا سبب بن جائے۔ لیکن اس نے مجھے خاموش سا دیکھ کر محسوس اور اطمینان کر لیا تھا کہ میں ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتی ہوں۔

یہ ایک پرائیویٹ ٹیکسی تھی جو عموماً رینٹ اے کار کی دکانوں پر ملتی تھی۔ یہ گاڑی نئی، خوب صورت اور نیا ماڈل لگتی تھی۔ بڑی آرام دہ اور اتنی کشادہ تھی کہ پچھلی سیٹ پر دو آدمی آسانی سے ساتھ لیٹ سکتے تھے۔ لوگ عموماً شادی بیاہ، تقریبات اور خاص موقعوں کے لیے کرائے پر لیتے تھے۔ میں نے بھی اسے دو ایک بار عقبی آئینے میں دیکھا تھا اور اس کے بشرے، اس کی نیت اور ارادوں کے بارے میں کچھ جان نہ سکی تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

اس نے اچانک ایک ویران سڑک کے کنارے گاڑی روک لی۔ یہاں دائیں اور بائیں قدرے فاصلے پر اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ یہ بہت بڑی آبادی تھی۔ یہ کون سی آبادی، علاقہ اور کالونی تھی یہ میں جان نہ سکی۔ اس نے مجھے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا کہ میں اس کی نشست پر اس کے ساتھ آ بیٹھوں۔ میں نے چون و چرا نہیں۔ اس لیے اس سے کچھ حاصل نہ تھا۔ میں نے بغیر پس و پیش اور تذبذب کے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ لباس اور سراپا سمیٹ کر جا نکلی اور اگلی نشست پر جا بیٹھی۔

''اچھا.....!'' اس نے گاڑی کو سڑک پر ڈالنے کے بعد میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور کہا۔

''اب آپ یہ بتائیں کہ آپ کہاں جائیں گی؟ آپ کا گھر کہاں ہے تاکہ آپ کے گھر چھوڑ دوں۔''

میں نے چونک کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا مجھے اپنی سماعت پر دھوکے کا احساس ہوا۔ جسے میں بدمعاش سمجھ رہی تھی جو مجھے ایک شیطان صفت لگا وہ تو مسیحا نکلا تھا۔ فرشتہ تھا۔ میری عزت و آبرو کا محافظ نکلا تھا۔ میں اس عظیم شخص کو حیرت سے دیکھ رہی تھی جس کے بارے میں جانے کیا کیا سوچ لیا تھا۔ قیاس کر لیا تھا وہ بڑی تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے خاموش پا کر چند لمحوں کے بعد سڑک سے نگاہیں ہٹا کے ایک لمحے کے لیے دیکھا اور پھر اس نے سابقہ سوالات دہرائے۔

''آپ کہاں جائیں گی؟ آپ نے بتایا نہیں؟ آپ کا گھر کہاں ہے؟ جلدی سے بتا دیں .....رات بہت ہو چکی ہے۔''

میں اسے کیا بتاتی کہ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میں تو ایک خانہ بدوش سے بھی گئی گزری ہوں۔ اس وقت میں اس حالت میں شازیہ خالہ کے ہاں جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے کہ کل انکل، آنٹی اور زمان وہاں میری تلاش میں آ سکتے تھے۔ زمان ان کی جان کو بھی آ سکتا تھا اور انہیں رقم ہضم کرنے نہیں دیتا۔ وہاں ایک فساد برپا اور ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ..... میں شازیہ خالہ اور شائستہ آپا کو کسی مصیبت اور کرب ناک اذیت میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے میں کیا جواب دوں؟ آخر میں نے اپنے آنکھیں بند کر لیں۔ میرے ذہن میں ایک عجیب سی کش مکش ہونے لگی تھی۔ میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ اگر میرا گھر ہوتا تو دربدر کی ٹھوکریں تو نہ کھاتی۔ یوں ذلیل و خوار نہ ہوتی؟'' لمحہ بھر میں نے توقف کیا۔ کیوں میرا سینہ بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ ''میرا نیلام تو نہ ہوتا۔'' اتنا کہہ کر میں سسک پڑی۔

''آپ کا گھر نہیں ہے؟'' اس نے چونک کر مجھے بڑی حیرت سے دیکھا۔ پھر اس نے اپنی نگاہیں سڑک پر مرکوز کر دیں۔

کافی دیر تک ہم دونوں کے درمیان سناٹا طاری رہا۔ میں نے اس کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا تاکہ اس کے بشرے سے اندازہ ہو سکے کہ میرے

جواب کا اس پر کیا اثر ہوا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے ایسا لگا جیسے وہ کسی کش مکش میں مبتلا ہو۔ پھر اس نے گہرے سکوت کو توڑا۔

''آپ گھبرائیں نہیں..... فکر مند اور پریشان نہ ہوں۔'' اس نے مجھے دلاسا دیا۔ ''اللہ کا شکر ادا کیجیے کہ اللہ نے آپ کو بے آبرو ہونے سے بچالیا۔ میرا اپنا گھر تو ہے میرے گھر چل کر آج کی رات تو کاٹیں۔ کل میں سوچوں گا کہ آپ کے لیے کیا کی جاسکتا ہے۔ ہاں آپ کو میرے ساتھ میرے گھر چلنے پر کوئی اعتراض نہیں؟ اگر ہو تو بتادیں؟''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' میری آواز شدت جذبات سے مغلوب ہوگئی۔ ''آپ تو میرے محسن ہیں مسیحا ہیں آپ نے میری ذات پر جو احسان کیا ہے میں اسے اپنی آخری سانس تک بھلا نہیں سکتی۔ یہ رسمی اور جذباتی بات نہیں کہہ رہی ہوں۔''

''اس میں احسان کی کوئی بات نہیں ہے؟'' اس نے بڑی سادگی سے کہا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور لہجے میں سچائی بھری ہوئی تھی۔ ''یہ تو ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ کسی انسان کو مصیبت اور پریشانی میں دیکھے تو اس کی مدد کرے..... آپ تو ایک کمزور و بے بس اور مجبور عورت تھیں جس سے وہ درندہ صفت فائدہ اٹھانا چاہتا تھا..... میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ میں آپ کے لیے ایک اجنبی شخص ہوں۔ کسی کی پیشانی پر لکھا نہیں ہوتا ہے کہ وہ کیا ہوتا ہے۔ کسی پر اندھا بھروسا بھی تو نہیں کیا جاسکتا ہے؟ اور یہ بات میں اب بتادینا اور چھپانا نہیں چاہتا ہوں کہ میں اپنے گھر میں اکیلا رہتا ہوں۔ میرے سوا اس گھر میں کوئی نہیں ہے۔ نہ ماں باپ ہیں اور نہ ہی بھائی بہن ہیں۔ یہ بات سوچ لیں۔ میں بتائے بغیر لے جاؤں تو آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں دھوکے اور آپ کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کے جانے کس ہمت اور ارادے سے لے آیا ہوں؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' میں نے جواب دیا۔ یہ خدانا خواستہ آپ کے دل میں کوئی کھوٹ ہوتا اور نیت میں کوئی فتور ہوتا تو میری بے بسی اور مجبوریوں اور کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے مجھ سے جھوٹ بول کر، فریب دے کر اپنے گھر لے جاتے..... بالفرض محال میں حالات کا نشانہ نہ بن جاتی تب میں ایک کمزور عورت ہونے کے ناتے کیا کرسکتی تھی۔ اور پھر ایک عورت مرد کو جتنا جانتی، پہچانتی ہے ایک مرد عورت کو ایک نظر میں عورت کی طرح پرکھ نہیں سکتا؟''

''مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوئی آپ نے مجھ جیسے ایک ایسے شخص پر اندھا بھروسا کیا۔ اعتماد کیا ہے جو اجنبی ہے۔ میں آپ کے اس اعتماد اور خلوص کو کسی بھی ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ میں حیران ہوں کہ آپ جیسی نفیس اور شائستہ خاتون حالات کے بھنور میں کیسے اور کیوں کر پھنس گئیں؟''

''میں نے اس کی بات سن کر صرف اتنا ہی کہہ سکی۔''

''بعض اوقات قدرت انسان سے بڑا امتحان لیتی ہے..... اسے ہر آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔'' اس نے سڑک سے نگاہیں ہٹا کر میرے چہرے پر مرکوز کردیں۔

''بہتر ہوگا کہ میں آپ سے اپنا مختصر سا تعارف کرادوں..... میرا نام سعود بیگ ہے۔ میں ایک ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ یہ پرائیویٹ ٹیکسی ہے اور میں اس کا مالک ہوں۔ اچھی ملازمت نہیں ملی اسے ذریعہ معاش بنالیا۔''

''میرا نام دردانہ ہے۔'' میں نے اپنی نظریں نیچی کر کے اپنے مہندی بھری ہاتھوں کو دیکھا اور ایک گہری سانس لے کر افسردگی سے کہا۔

''میں ایک ایسی بدبخت لڑکی ہوں جو آپ نے کبھی نہیں دیکھی ہوگی۔ آپ میری درد بھری کہانی سن کر کیا کریں گے؟''

''میں گھر چل کر آپ سے کہانی ضرور سنوں گا۔'' سعود کے لہجے میں خلوص جھلک رہا تھا۔ ''آپ مایوسی کی باتیں نہ کریں، دل، چھوٹا نہ کریں اور نہ ہی

جذباتی ہوں۔ دنیا میں جس کا کوئی نہیں ہوتا ہے اس کا خدا تو ہوتا ہے۔ اس پر توکل کریں، صبر کریں۔"

دس منٹ تو دلاسا دینے اور جذباتی باتوں میں گزر گئے تھے جو میرے دل کو تقویت دیتے رہے۔ مسعود سارا راستہ مجھے حوصلہ دے رہا تھا جیسے اس کے اور میرے درمیان کوئی اٹوٹ رشتہ اپنائیت اور خلوص کا جو دو ایک دن میں نہیں برسوں میں قائم ہوتے ہیں ..... میں اس کی باتوں اور جذبے سے بڑی متاثر ہو رہی تھی مگر پھر بھی مجھ پر جو مایوسی طاری ہو رہی تھی وہ دور نہ ہو سکی۔ دل پر جو ایک منوں بوجھ تھا وہ بھی اتر نہ سکا تھا۔ اب مجھے ہر سمت تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی تھی۔ گو مسعود کی ذات سے کوئی خطرہ نہ تھا پھر بھی نا معلوم کیوں میرے دل کے تمام گوشوں میں ایک نا معلوم سا خوف کسی سانپ کی طرح کنڈلی مار کے چھپا بیٹھا تھا۔ کچھ بھی ہو مرد ذات اور ناگ کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا ہے۔ لیکن اس پر بھروسا کیے بغیر چارہ نہ تھا۔

کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد گاڑی ایک ایسی آبادی میں داخل ہوئی جہاں کچے پکے، بے ترتیب، بے ڈھنگے سے گھر بنے ہوئے تھے۔ اس آبادی کی گلیاں کچی پکی، ٹیڑھی میڑھی اور ناہموار تھیں۔ یہ کوئی بہت پرانی کچی آبادی تھی شاید..... ٹیکسی ایک کسی قدر تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوئی تو ٹیکسی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی نے اس گلی کو نہلا دیا۔ بتیاں گل ہوئیں تو گھپ اندھیرے نے کسی عفریت کی طرح اس گلی اور مکان کو نگل لیا جس کے سامنے ٹیکسی جا کر رکی تھی۔

گاڑی سے باہر آنے کے بعد اس نے اس کے دروازے کے جیب سے چابی نکال کر اپنے مکان کا قفل کھولا۔ پہلے وہ اندر گیا اور اس نے جا کر بتی جلائی اور باہر آ کر مجھے اندر لے گیا۔ میں صحن سے گزر کر ایک بڑے سے کمرے میں پہنچا۔ اس کمرے میں ایک نہیں دو بڑی لائٹیں روشن تھیں۔ اس کی دودھیا روشنی نے گھر کو ایسا منور کیا کہ ذرہ ذرہ صاف نظر آنے لگا۔ اس نے ایک ٹیوب لائٹ آف کر دی۔ غلطی سے اس نے شاید دونوں جلا دی تھیں۔ اس تیز روشنی میں میں نے جو سب سے پہلے چیز دیکھی وہ مسعود کا چہرہ تھا۔

وہ تیس برس کا ایک بھرپور جوان مرد تھا۔ اس کی رنگت سانولی لیکن پرکشش اور جاذبیت لی ہوئی تھی اور چہرے کے نقوش بھی بڑے دل فریب تھے۔ اس کی بڑی سیاہ آنکھوں سے ذہانت جھانک رہی تھی۔ اس کا بدن مضبوط اور کسرتی تھا۔ چوڑا چکلا سینہ..... اس کے دراز قد نے اسے مزید وجیہہ بنا دیا تھا۔ ایک تصوراتی محبوب جس کا خواب کنواری لڑکیاں دیکھتی ہیں۔

گو وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور تھا لیکن اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے لگتا نہیں تھا۔ وہ مہذب، تعلیم یافتہ اور کسی اچھے خاندان کا فرد دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اپنا تعارف کراتے وقت کہا تھا کہ اسے اچھی ملازمت نہیں ملی تو اس نے ٹیکسی کو ذریعہ معاش بنا لیا تھا۔ وہ مجھے اس طرح سے دیکھ رہا تھا جیسے میں دنیا کا کوئی عجوبہ ہوں۔ اس کی آنکھوں میں ہوسناکی اور میل نہیں تھا بلکہ شدید حیرت تھی۔ اس کی خوب صورت سی آنکھیں جیسے میرے حسن کو خراج پیش کر رہی تھیں۔ اس کا چہرہ جیسے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا..... مجھے اندازہ نہ تھا کہ تم اس قدر حسین ہو گی۔ کہیں میں جاگتے میں کوئی سہانا خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ کیا تم جنت سے اتری ہوئی کوئی حور ہو؟ مسعود کی ان ستائش بھری نظروں سے میری نس نس میں ایک عجیب سی سنسنی خیز لہر بجلی کی رو کی طرح دوڑ گئی اور میری پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ میں اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے حیا آلود ہو گئی تھی اور میں سکڑ اور سمٹ کے گھڑی سی بن گئی۔ اس کی اور ان مردوں کی نظروں میں بڑا فرق تھا۔ سراہ مجھے مرد بڑی گرسنہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ وہ تصور میں مجھے بے لباس کر کے آلودہ کر رہے ہوں۔ ان کے پراگندہ خیالات ان کے چہروں سے عیاں ہوتے تھے۔ میرا دل کرتا تھا کہ ان کی آنکھیں پھوڑ دوں۔ ان کی میلی نظروں میں نہ تو ستائش ہوتی تھی اور

نہ ہی پاکیزگی..... میں نے ان نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے گھوم کر کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک کونے میں پلنگ پڑا تھا جس کا بستر بے ترتیب ہو رہا تھا اور اس کی چادر پر شکنوں کا جال تھا۔ ایک کرسی اور میز بھی تھی۔ جس پر کچھ رسائل رکھے تھے۔ اس کے علاوہ تیل کی شیشی، کنگھی اور نہ جانے کیا اور البلا بکھرا ہوا تھا۔ کمرے کی حالت کباڑ خانے جیسی ہو رہی تھی۔ آخر مسعود ایک مرد تھا صبح جاتا تو شاید رات ہی لوٹتا تھا۔ تب اسے کمرے کی صفائی کا موقع نہ ملتا تھا یا پھر وہ کاہل واقع ہوا تھا۔ اگر وہ اگر روزانہ ایک گھنٹہ بھی گھر کی صفائی پر لگا دیتا تو اس کا کمرا اس قدر اجاڑ نہ دکھائی دیتا۔

''آپ اس کباڑ خانہ کو کیا دیکھ رہی ہیں؟ یہ ایک ٹیکسی ڈرائیور کا گھر ہے۔'' اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''جس گھر میں مرد رہتے ہوں اور عورت کا وجود نہ ہو وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ آپ کو شاید تعجب اس لیے ہو رہا ہے کہ پہلی بار ایسا گھر دیکھ رہی ہیں۔ آپ ادھر تشریف رکھیں یہ صاف جگہ ہے۔''

اس نے تیزی سے بڑھ کر پلنگ کی چادر اور شکنیں درست کیں۔ میں جھجکی تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تکلف نہ کریں..... آپ کو تو بیٹھنا ہی ہے..... اگر پلنگ پر نہ سہی تو کرسی پر بیٹھ جائیں، ویسے یہ گھر آپ کے لائق نہیں ہے۔''

''میں کوئی شہزادی یا کسی بڑے گھر کی نہیں ہوں بلکہ بہت غریب گھرانے کی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ پھر میں اپنا لباس سنبھالتی ہوئی پلنگ پر جا بیٹھی۔ ''میں نے اپنی ساری زندگی ایسے ہی گھر میں گزار دی ہے۔''

''ایسا لگتا تو نہیں ہے.....؟'' اس نے مجھ پر ایک نگاہ ڈال کر کہا۔ ''آپ یہ بات انکساری سے کہہ رہی ہیں۔ آپ کسی بڑے گھرانے کی معلوم ہو رہی ہیں بلکہ لگتی بھی ہیں۔ یہ آپ کے چہرے سے ہی ظاہر ہے۔''

''میرے چہرے مہرے پر نہ جائیں۔'' میں نے کہا۔ ''چہرے بہت جھوٹ بولتے ہیں۔ دھوکا دیتے ہیں۔ فریبی ہوتے ہیں۔''

''ارے ہاں۔'' وہ اک دم سے چونک کر اچانک اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ معاف کیجئے گا..... آپ نے کچھ کھایا پیا بھی ہے کہ نہیں..... بھوکی ہیں؟ میرا خیال ہے کہ شادی کی خوشی میں بریانی، قورمہ اور چکن بروسٹ..... سوئٹ ڈش میں ربڑی ملائی، سوئٹ ڈش میں کسٹرڈ..... آئس کریم اور کیک پیسٹری تو ضرور کھائی ہوگی۔''

''جی نہیں.....'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''دوپہر تو کھانا کھایا تھا اس کے بعد ایک لقمہ بھی کچھ نہیں کھایا..... ویسے اب مجھے بالکل بھی بھوک نہیں رہی ہے۔ وہ کب کی مر چکی ہے۔ دل اچاٹ ہو جائے تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا ہے۔''

''مگر مجھے تو بڑی سخت بھوک لگی ہے..... پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں..... کیوں کہ میں نے بھی دوپہر کے بعد سے کچھ نہیں کھایا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''بھوک میرے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ راستے میں خیال نہیں آیا۔ ورنہ کسی ہوٹل سے کھانا پارسل کروا لیتا۔ میں ابھی جا کر کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ لے آتا ہوں۔ جب تک آپ آرام کر لیں..... کمر سیدھی کر لیں۔''

''اتنی رات گئے کھانا کہاں ملے گا؟'' میں بولی۔ ''اگر گھر میں کچھ ہو تو میں کھانا ابھی تیار کیے لیتی ہوں۔ آپ کا باورچی خانہ کہاں ہے؟''

''میں کھانا زیادہ تر باہر ہی کھاتا ہوں۔'' مسعود کہنے لگا۔ ''کبھی کبھی یعنی جس دن آدھے دن کی چھٹی کر لیتا ہوں تو کھانا خود ہی بنا لیتا ہوں کیوں کے ہوٹل کے کھانے زیادہ پسند نہیں ہیں۔ کئی دنوں سے اپنی پسند کا کھانا کچھ نہیں بنایا اس لیے گھر میں کچھ نہیں ہے۔ یہ کراچی شہر ہے۔ یہاں رات تین چار بجے تک ہوٹل کھلے رہتے ہیں۔ آپ اندر سے دروازہ

بند کر کے بیٹھیں۔ میں گیا اور آیا۔''

سعود رکا نہیں چلا گیا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کراچی میں رات تین بجے تک زندگی جاگتی رہتی تھی۔ اس شہر میں لوگوں کے پاس پیسہ بہت ہے، وافر ہے۔ شاپنگ سینٹروں میں دل کھول کر سینکڑوں ہزاروں کی خریداری کرتے ہیں۔ ہوٹل بازی میں ہر شام ہزاروں خرچ کر دینا کوئی بات نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے رات گئے تک ہوٹل کھلے رہتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ اور تجربہ اس لیے تھا کہ انکل اور آنٹی رات کے کھانے کے لیے نجانے نجانے کہاں کہاں لے جاتے تھے۔ ہماری واپسی تین بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ رات دو تین بجے ہوٹل، ریسٹورنٹ اور بار بی کیو کھلے رہتے اور ان میں بڑا رش ہوتا تھا۔ خالی میز تک نہیں ملتی تھی۔ ان کے باہر ایک سے ایک گاڑیوں کی قطاریں ہوتی تھیں۔ ہوٹلوں میں رش دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کراچی میں کوئی غریب نہیں ہے۔

میں نے باہر کے دروازے کی چٹخنی لگائی اور کمرے میں آ گئی۔

گویا وہ کھانا لینے اپنی گاڑی لے گیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کھانا لینے دور گیا تھا۔ اس کی واپسی ایک گھنٹے سے پہلے مشکل تھی۔ میں کمرے کے وسط میں چند لمحوں تک کھڑی سوچتی رہی کہ بیٹھے بیٹھے کیا کروں! ایک عجیب سی بے زاری اور اکتاہٹ ہونے لگی۔ پھر کمرے کی ناگفتہ بہ حالت کو خیال آیا کہ کیوں نہ اس کباڑ خانے کو ٹھیک کر دوں؟ پھر میں نے بیس منٹ کے اندر کمرے کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ وہ آئینے کی طرح چمک اٹھا گھر کی صفائی ہمیشہ سے میری کمزوری رہی ہے۔ اور پھر میری ماں مجھ سے اکثر کہتی رہتی تھی کہ بیٹی! ایک لڑکی کا سب سے بڑا جہیز اور اس کا حسن، اس کی دولت اور عزت، اس کی خوب سیرتی اور سلیقہ شعاری میں ہوتی ہے۔ ماں نے میری تربیت ایک خاص انداز سے کی تھی جس کی بدولت میں امور خانہ داری میں ماہر آغاز شباب میں ہو گئی تھی۔ پڑوس اور محلے کی عورتیں نہ صرف مجھ پر اش اش کرتی تھیں بلکہ اپنی جوان لڑکیوں اور بیوؤں کو میری مثال دیتی تھیں۔

میں نے کمرے کی صفائی سے فراغت پانے کے بعد باورچی خانے کا رخ کیا۔ باورچی خانے میں گھس کر میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ایک تو وہ بے حد گندا ہو رہا تھا اور دوسرا سامان اس قدر بے پروائی سے رکھا ہوا تھا کہ توبہ بھلی..... یہ کیسا شخص ہے؟ کیا اسے باورچی خانہ کی گندگی کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں؟ وہ کس طرح ناشتا تیار کرتا تھا؟ اس کی حالت ایسی تھی کہ کوئی منٹ بمشکل کھڑا رہے۔ میں نے بڑی ہی تیزی کے ساتھ پہلے باورچی خانے کے فرش، سنک اور سلیب کو خوب اچھی طرح صابن، اسٹیل وول اور برش سے خوب اچھی طرح رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ پھر رکابیاں، چائے اور کھانے پکانے کے برتن بھی صاف کیے۔ پھر ہر چیز کو ترتیب اور سلیقے سے رکھ دیا۔ باورچی خانے کی حالت اور اس کا نقشہ ہی بدل گیا۔ اب وہ واقعی باورچی خانہ لگ رہا تھا۔ ہر چیز چمک رہی تھی۔ میں نے صفائی اور ترتیب کے دوران ایک سلیب پر آٹا، ہری مرچ، پیاز، آلو، چاول، گھی اور چھ سات انڈے دیکھے تھے۔ اس کے علاوہ، چنا اور مونگ مسور کی اور ماش کی دال بھی موجود تھی۔

موصوف کو گئے ہوئے نصف گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا ابھی تک لوٹے نہیں تھے۔ کام اور صفائی سے ذہن بٹ گیا تھا اور وقت گزرنے کا خیال تک نہ آیا تھا۔ یہ کوئی سی یو، کلفٹن اور ناظم آباد اور گلستان جوہر کا علاقہ نہیں تھا شاید اس لیے اسے دور جانا پڑا تھا۔ اس قدر کام اور مشقت کرنے سے میری بھوک کھل گئی تھی۔ لہٰذا میں نے مونگ کی دال بگھاری، ساتھ ساتھ چار پانچ چپاتیاں بھی پکا لیں، انڈوں کا خاگینہ بھی بنا کر کمرے میں لا کر کمرے کی میز پر چن دیا۔ چائے کی کیتلی دھیمی آنچ پر رکھ دی۔ اس وقت مجھے چائے کی بڑی طلب محسوس ہو رہی تھی لیکن اس کا

انتظار ضروری بھی تھا۔ اس لیے کہ وہ دوپہر سے بھوکا پیاسا تھا۔

میں نے صحن میں غسل خانے کے باہر لگے واش بیسن میں منہ دھویا۔ منہ کا میک اپ نالی میں بہہ گیا۔ میں نے لمحے کے لیے سوچا کہ یہ جو دلہنیں چالیس چالیس، پچاس پچاس اور ساٹھ ہزار میں صرف ایک رات کے لیے بنتی سنورتی اور سجتی ہیں لیکن صبح نہاتے وقت ان کا میک اپ نالی میں بہہ کر گرد میں چلا جاتا ہے۔ میک اپ ہی نہیں بلکہ رقم بھی بہہ جاتی ہے۔ واقعی عورت نہ صرف بے وقوف بلکہ ناقص عقل ہے۔ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں بیوٹی پارلر سے سج دھج کر سینکڑوں روپے میں جاتی ہیں۔ صرف چند گھنٹوں کے لیے عورت کا حسن کسی میک اپ کا محتاج نہیں ہوتا ہے۔ میں نے کمرے میں آ کر اپنا حلیہ درست کیا۔ وہ پورے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد واپس آیا اس کے ہاتھ میں دودھ، ڈبل روٹی، مکھن کی بڑی ٹکیہ تھی بسکٹ کے دو پیکٹ تھے۔ چوں کہ رات کا وقت تھا وہ کسی ایسے علاقے میں نہیں گیا نہ جا سکا جہاں رات گئے تھے ہوٹل کھلے ہوتے ہیں اور شاید اسے اس بات کا اندیشہ بھی ہو کہ کوئی اس کا دوست یا ملنے والے نے آ کر دروازہ کھٹ کھٹایا اور میں نے دروازہ کھول دیا تو مجھے دیکھ کر وہ مشکوک ہو جائے گا۔ اس نے جاتے وقت یہ تاکید تو نہیں کی تھی کسی نے دروازے پر دستک دی تو میں دروازہ نہیں کھولوں۔

کمرے میں پہنچ کر وہ اک دم سے ٹھٹک گیا۔ اپنے کمرے کو وہ نہ صرف سکتے کی سی حالت میں دیکھنے لگا جیسے دنیا کا وہ کوئی نیا عجوبہ دیکھ رہا ہو۔ اس نے چند لمحوں کے بعد میری طرف دیکھا اور شدید حیرت سے بولا۔

''بھئی.....! سچ سچ بتائیں..... کیا یہ واقعی میرا ہی گھر ہے؟ کہیں میں غلطی سے کسی اور گھر میں تو گھس نہیں آیا ہوں؟''

''اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے.....؟'' میں دھیمی آواز میں بولی اور زیر لب مسکرا دی۔ ''میں نے گھر کی صفائی ہی تو کی ہے..... اگر آپ بھی وقتاً فوقتاً گھر کی صفائی کرتے رہتے تو گھر بھی آئینے کی مانند چمکتا رہتا..... غریب دراصل صفائی کو ترس گیا تھا۔''

''جب کبھی بھی میں کسی دن چھٹی کرتا ہوں تو گھر کی صفائی ضرور کرتا ہوں۔'' اس نے قدرے خفت سے کہا۔ ''یہ گھر جانے کیوں اور کیسے صحیح طرح یہ گھر اس قدر گندا ہو جاتا ہے کہ کی بتاؤں؟ ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ صفائی میرے بس کی بات نہیں..... میں جلد ہی تھک بھی جاتا ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں کاہل اور نکما واقع ہوا ہوں۔''

''چلیے کھانا کھا لیجیے..... آپ کا جرم قابل معافی اس لیے ہے کہ آپ نے اقبال جرم کر لیا۔ آپ جانے کہاں کہاں ہو کر آ رہے ہیں تو بھوک سے آپ کا برا حال ہو رہا ہوگا۔ مجھے بھی اب بھوک لگ رہی ہے۔''

سعود نے میز کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اگر اس نے دیکھا تھا تو خیال نہیں کیا تھا۔ اس نے لائی ہوئی چیزیں میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بہ مشکل یہی کچھ مل سکا ہے۔ آپ اس وقت اس پر اکتفا کر لیں۔ میں اس لیے بہت دور نہیں گیا کہ واپسی میں بہت دیر ہو جاتی..... آپ کو صبح کے وقت گرم گرم حلوہ پوریاں کھلاؤں گا۔ ہمارے محلے میں صادق حلوائی کی دکان ہے۔ وہ بڑی اچھی پوریاں بناتا ہے۔ اس کا حلوہ اور ترکاری زبردست ہوتی ہے۔ آپ نے شاید ہی کبھی ایسی پوریاں اور ترکاری کھائی ہوگی؟''

میں نے آپ کے باورچی خانے میں جا کر کھانا بنایا تھا۔ میرے خیال میں ہم دونوں کے لیے اس وقت کافی ہوگا۔'' میں نے میز کی طرف اشارہ کیا۔

سعود نے میز کے قریب جا کر دال، انڈوں کا خاگینہ اور روٹیاں دیکھیں تو اس کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اس کی آنکھوں میں میرے لیے احسان مندی کی چمک تھی۔ پھر اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ایک تھی عائزہ

''دیکھو تم سب لوگ۔ یہ ہے میرے خوابوں کی شہزادی، بالکل ایسے ہی لمبے اور خوب صورت بال ہوں گے جس سے میں شادی کروں گا۔''

ہاتھ میں ریموٹ پکڑے آریان نے ٹی وی اسکرین پر ایک منظر روک لیا تھا۔ مارننگ شو میں شہد رنگ اور چیک دار بالوں کے ساتھ ادائیں دکھاتی وہ کوئی ماڈل گرل تھی۔ بچپن سے ماں کی سنائی ہوئی کہانی کی اک شہزادی اس کے دل و دماغ میں سمائی تھی۔ جو اس کی ماں سناتی تھیں۔ راپنزل جس کے بال اتنے لمبے تھے کہ وہ قلعہ کی کھڑکی سے اپنے بال نیچے لٹکاتی اور شہزادہ بالوں کے ذریعے اوپر چڑھتا تھا۔

''شہزادی کے بال اتنے لمبے کیسے ہو سکتے ہیں؟''

وہ بے یقینی سے ماں کی گود میں رکھے سر کو اٹھا کر پوچھتا تو وہ ہنستے ہوئے اسے سمجھاتیں۔

''بیٹا! وہ شہزادی تھی نا، اس لیے اپنے بالوں کا بہت خیال رکھتی تھی اور بالوں کو بڑھانے کے لیے مختلف قسم کی جڑی بوٹیوں سے بنے ہوئے تیل کا استعمال کرتی تھی۔''

وہ اسکرین پر مسکراتی ہوئی ماڈل کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

''اس وقوف کو دیکھو، یہ نہیں جانتا کہ اس کے بال اصلی نہیں ہیں۔ یہ وگ لگائی ہوئی ہے۔'' احمد نے آریان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''ویسے بھی پاکستانی لڑکوں کے مقدر میں خالہ یا پھوپھی کے علاوہ چچا یا ماموں کی بیٹی ہی لکھی ہوتی ہے۔'' مشارب نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے ماحول کو مزید سرد کرنے کی کوشش کی۔

''میں بھی ایک زمانے میں بڑے خواب دیکھا کرتا تھا یارو!'' جواد نے دکھی انداز میں کہا۔ ''نوکری ملنے کے بعد جب آرزوؤں بھرے دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے اماں سے کہا کہ اماں! کرینہ کپور جیسی لڑکی میرے ساتھ سجے گی۔ اس سے کم نہ ہو اور اس سے زیادہ پیاری تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ تب اماں نے اپنی چپل کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑے پیار سے جواب دیا تھا کہ بیٹا ذرا آئینے میں اپنی صورت دیکھ۔ تو کون سا سیف علی خان جیسا ہے۔ میں نے بچپن سے ہی تیری بات ارم باجی کی بیٹی سے کر رکھی ہے۔ یارو! یقین کرو، یہ بات سن کر بچپن میں بہتی ہوئی ناک والی لڑکی ذہن میں آ گئی۔ ایسے میں کیا رومانٹک فیلنگ آتی۔''

اس کی بپتا سن کر وہ سارے پیٹ پکڑے ہنستے ہنستے دہرے ہو گئے۔

☆☆☆

آریان خان جہاں آرا بیگم اور حشمت علی خان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ تعلیم مکمل کر کے بہت اچھی جاب ملنے کے بعد والدین کو اس کی شادی کی فکر ستانے لگی اور پوچھنے پر جو اس نے اپنی پسند کا نقشہ ماں کے سامنے کھینچا تو وہ بھی سوچ میں پڑ گئیں۔

''آریان! ہم نے تمہاری بات آپا کی عائزہ سے بچپن ہی سے طے کی ہوئی ہے۔ عائزہ کی بھی تعلیم مکمل ہو گئی ہے۔ ماشاء اللہ ڈاکٹر بن گئی ہے۔ آپا دو چار مہینے میں پاکستان آ رہی ہیں۔ ہم نے سوچا ہے کہ تم دونوں کی اب شادی کر دیں۔ بیٹا وہ بہت خوب صورت ہے، تم دیکھو گے تو تمہیں بھی پسند آئے گی۔ اگر بال نہیں بھی اچھے.....''

''نہیں امی! میں نہیں مانتا ان بچپن کے رشتوں کو۔ زندگی مجھے بار بار نہیں ملے گی جو میں دوسروں کی پسند سے گزاروں۔ مجھے شریک حیات اپنی مرضی اور خواہشات کے مطابق چاہیے۔'' آریان نے ان کی بات کاٹ کر کہا اور گھر سے باہر چلا گیا۔

☆☆☆

''ہیلو آپا! میں جہاں آرا بول رہی ہوں۔'' ساری رات پریشانی میں گزارنے کے بعد ان کو ایک ہی حل نظر آیا کہ ساری بات آپا کو بتا دیں۔

''جہاں آرا! سب خیریت ہے؟ آریان نے بات کی تم نے۔''

''آپا! کہاں خیریت ہے۔ آریان نے شرط رکھ دی ہے کہ اسے تو لڑکی لمبے بالوں والی چاہیے اور تم نے جو تصویر عائزہ کی بھیجی ہے اس میں تو اس کے بال بہت چھوٹے ہیں۔ میں نے تو آریان کو دکھائی بھی نہیں۔ رات سے پریشان بیٹھی ہوں۔ تمہارے بہنوئی سے ذکر کیا تھا، وہ کہنے لگے خود ہی کوئی حل نکال لو۔ مجھے تو معاف کرو۔ اب بتاؤ کیا کروں۔''

حسن آرا نے پوری بات سنی اور کہا۔

''پڑھائی کی وجہ سے اپنے آپ پر توجہ ہی نہیں دیتی۔ سر جھاڑ منہ پہاڑ لیے بس پڑھتی رہتی ہے۔ تم فکر نہ کرو، ابھی تو دو چار مہینے ہیں ہمارے پاس۔ ان شاء اللہ یہ

مسئلہ بھی ختم ہو جائے گا۔"

"پر کیسے آپا....."

"ارے، بھول گئیں۔ اماں ہمارے بالوں پر ایک ہیئر آئل لگایا کرتی تھیں۔ کتنے خوب صورت اور گھنے ہوتے تھے ہمارے بال۔ بس دو چار ہفتوں میں ہی تم دیکھنا کہ کیسے عائزہ کے بال لمبے ہوتے ہیں۔ جادوئی ہیئر آئل ہے۔ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو اور شادی کی تیاری کرو۔ ابھی آریان سے کچھ نہ کہنا۔"

"ہاں آپا! کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ دل مطمئن ہو گیا آپ سے بات کر کے۔ عائزہ کو میرا پیار دینا، اللہ حافظ۔"

☆☆☆

عائزہ کسی کام سے لاؤنج میں آئی تو دیکھا کہ حسن آرا فون ہاتھ میں پکڑے کسی سوچ میں گم بیٹھی ہیں۔

"امی! پاکستان میں سب خیریت ہے۔ آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟"

"خیریت کہاں؟ جہاں آرا کا فون آیا تھا۔" انہوں نے سارا ماجرا کہہ سنایا پھر بولیں۔

"تم نے تو کبھی اپنے بالوں پر توجہ ہی نہیں دی۔ کتنے روکھے اور بے رونق ہو رہے ہیں تمہارے بال۔ اب جو میں کہوں گی، اس پر تمہیں عمل کرنا ہوگا۔"

"امی! کیا ضرورت ہے۔ اگر آریان کے اتنے نخرے ہیں تو مجھے تبھی کوئی ایسی کوئی خواہش نہیں ہے جو میں اپنے آپ کو ان کی پسند میں ڈھالوں۔ انکار کر دیں آپ۔" عائزہ کو یہ سب بہت ناگوار لگ رہا تھا۔

"خاموش رہو۔ زیادہ چوں چرا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" حسن آرا نے غصہ میں جواب دیا اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔

پھر دوسرے دن سے حسن آرا روز رات کو اپنے ہاتھوں سے ہیئر آئل لگاتیں اور اس کے سر کا مساج کرتیں اور صبح وہ حسن آرا کی ہدایت کے مطابق دو دفعہ سر کو دھو لیتی۔

اس دن بھی رات کو وہ عائزہ کے سر میں ہیئر آئل لگا کر مساج کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ باتیں بھی جاری تھیں کہ عائزہ کہنے لگی۔

"امی! آپ جب میرے سر کا مساج کرتی ہیں، اتنا سکون ملتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ساری رات اسی طرح آپ کے پاس بیٹھ کر مساج کرواتی رہوں۔ یہ آپ کے ہاتھوں کا کمال ہے یا آپ کی محبت کا..... آپ نے کون کون سی جڑی بوٹیوں سے یہ ہیئر آئل بنایا ہے اور کتنی محنت کی ہوگی نا اس ہیئر آئل کو بنانے میں....."

حسن آرا مسکراتے ہوئے بولیں۔

"اب محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ "ڈابر آملہ ہیئر آئل" جو ہے۔ آملہ فروٹ بالوں کی افزائش کے لیے بہترین ہوتا ہے۔ ہماری اماں بھی "ڈابر آملہ ہیئر آئل" ہی استعمال کرتی تھیں۔ "ڈابر آملہ ہیئر آئل" پر نسلوں کا اعتماد ہے۔ ہم نے بھی "ڈابر آملہ ہیئر آئل" ہی کو بالوں کے لیے مفید پایا اور تمہیں بھی اسی کا مشورہ دوں گی۔"

"ڈابر آملہ ہیئر آئل" بالوں کو گھنا اور مضبوط بناتا ہے۔ سر سے خشکی اور سکری کا خاتمہ کر کے بے رونق اور الجھے بالوں کو چمک دار، نرم و ملائم اور سلکی بناتا ہے۔ سر کی جلد کو نمی فراہم کرتا ہے۔ بالوں کو وقت سے پہلے سفید ہونے سے بچاتا ہے کیونکہ اس میں آملہ ہے، جو بالوں کی افزائش کے لیے لازمی ہے۔"

"امی! میں اپنی دوستوں کو بھی "ڈابر آملہ ہیئر آئل" کی خوبیاں بتاؤں گی اور انہیں "ڈابر آملہ ہیئر آئل" استعمال کرنے کا مشورہ دوں گی۔"

☆☆☆

دو مہینے بعد جب حسن آرا اور عائزہ پاکستان پہنچی تو آریان عائزہ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے لگا کہ اس کے خوابوں کی شہزادی مجسم اس کے سامنے کھڑی ہے۔

جہاں آرا بیگم نے اس کی اور دیکھا۔ خوشی اس کے چہرے سے صاف جھلک رہی تھی۔

آریان نے جہاں آرا بیگم سے جھجکتے ہوئے اپنی رضامندی ظاہر کی اور جلدی شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔

شادی کی رات آریان دلہن بنی عائزہ کی خوب صورتی کی تعریف کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"عائزہ! تمہارے بال کتنے خوب صورت ہیں۔ بالکل راپنزل کی طرح۔"

عائزہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"یہ تو "ڈابر آملہ ہیئر آئل" کا کمال ہے۔"

آریان نے قہقہہ لگایا تو اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔

☆☆

جرم کی سیاہی

جاوید راہی

آج کا انسان کتنا ظالم..... کیسا جابر ہے کہ ظلم کے کوہ گراں توڑتے ہوئے یہ بھی بھول جاتا ہے کہ بے آواز کی لاٹھی چلتی ضرور ہے خواہ کسی اور رخ سے ہی سہی۔ اس ظالم و سفاک لڑکی پر بھی لاٹھی چلی ایسے انداز سے کہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔

بھلی صورت والے ہوتے ہیں بھلا بھی۔ مشرقی روایات کی قاتل ایک لڑکی کا دردناک انجام

پروفیسر احسان الٰہی کو اصول پرست ہونا ہی چاہیے تھا، ساری زندگی درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے تھے اور انسانی زندگی کی بہتری کا سبق دیتے رہتے تھے۔ چھوٹے سے گھر کے چند افراد بھی ان کے اصولوں پر عمل پیرا تھے۔ لیکن باہر سے آنے والوں کو تو اپنے اصولوں پر نہیں چلایا جا سکتا تھا اور اگر کوشش بھی کی جاتی تو یہ ایک لمبا عمل تھا۔

آسیہ غیر گھرانے سے آئی تھی، اچھا گھرانہ تھا اور اچھا سمجھ کر ہی اس گھرانے میں رشتہ کیا گیا تھا، موٹے موٹے معاملات کے بارے میں معلوم کر لیا گیا تھا، لیکن افراد کی فطرت کی گہرائیوں کی تلاش تو آسانی سے نہیں ہوتی ہے، خود ان کے گھر میں صبح، اپنے وقت پر ہو جاتی تھی، لیکن آسیہ کے گھر میں ایسا نہیں ہوتا تھا وہاں ہر شخص اپنی ضرورت پر جاگتا تھا، یہ احسان صاحب کو دیر میں معلوم ہوا تھا۔ انہوں نے ہر نقطہ نظر سے آسیہ کو سمجھایا کہ بیٹے دیر سے جاگنے کے کیا کیا نقصانات ہوتے ہیں۔ انہوں نے آسیہ کو بھی اپنا اسٹوڈنٹ سمجھا، لیکن پھر سلیمہ بیگم نے انہیں سمجھایا۔

''آپ آسیہ کو صبح جاگنے کا لیکچر نہ دیا کریں۔''

''ایں..... کیوں؟'' وہ حیرت سے بولے۔

''محسن کہہ رہا تھا کہ اماں ابو کو سمجھا دیں، اصل میں آسیہ کے گھرانے میں صبح خیزی کی عادت نہیں ہے، آہستہ آہستہ وہ ہمارے ہاں کی روایات کی عادی ہو گی۔''

''اوہو، گویا وہ میری ہدایات کا برا مانتی ہے۔''

''ظاہر ہے، اس نے ہی محسن سے یہ کہلوایا ہوگا۔'' بیگم صاحبہ اداس لہجے میں بولیں اور پروفیسر صاحب کا چہرہ بجھ گیا تھا۔ لیکن بہت دن تک وہ ناشتے کی میز پر بیٹھے بہو کو مس کرتے رہے اور اداس رہے۔ لوگ ہی کتنے تھے، احسان الٰہی ان کی بیگم سلیمہ، بیٹا محسن الٰہی اور بیٹی شکیلہ، جو محسن سے کافی چھوٹی تھی اور اب وہ انٹر پاس کر کے بی اے پارٹ ون میں پہنچی تھی، گھر پر سکون اور با اصول تھا۔ انہی اصولوں کے تحت محسوس کیا گیا کہ اب محسن کی شادی ہو جانی چاہیے، چنانچہ اس کی شادی کر دی گئی اور اس گھر میں بھی مسائل داخل ہو گئے۔

پھر جب محسن نے دبی زبان سے کہا کہ آسیہ الگ گھر میں رہنا چاہتی ہے تو سلیمہ بیگم کا حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔ ''میں نے کرائے کا ایک فلیٹ دیکھ لیا ہے۔'' محسن نے دوسرا خنجر بھونکا۔

احسان الٰہی نے سنا تو ہنس پڑے۔ ''آپ ہنس رہے ہیں۔'' سلیمہ بیگم نے رندھی آواز میں کہا۔

''دھان کٹے، دھن کٹی لے گئی، دھنکا لے گئی بیاس
بڑا پوت بڑ کوئیا لے گئی مڑوا بھیو اداس''

پروفیسر نے کہا اور خوب ہنسے۔

''پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' سلیمہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''اپنی بہو بہت اچھی ہے، اتنے دن ساتھ گزار لیے یہ اس کا احسان ہے، اب ایک مشورہ دوں۔''

''جی۔''

''پورے پیار اور اہتمام سے انہیں ان کے گھر پہنچا دو، اگر بیٹے سے ملتے رہنا چاہتی ہو، ورنہ بہو کے تیور تو شادی کے دوسرے دن ہی پتا چل گئے تھے۔''

محسن الٰہی خوشی خوشی اپنے گھر چلا گیا کہ وقت بدل گیا ہے، ریت بدل گئی ہے، اب بیٹیاں نہیں بیٹے رخصت ہوتے ہیں، کاش جہیز کی رسم بھی بدل جائے اور اب بیٹوں کا جہیز تیار کیا جائے۔ پروفیسر صاحب سمجھ دار تھے، جیسے بھی بن پڑا انہوں نے بیوی اور بیٹی کو سنبھال لیا ان کی محبت ڈلیتی کا شکار ہو گئی تھی، البتہ پروفیسر صاحب کی سمجھ داری سے ملنے جلنے کا راستہ بند نہیں ہوا، جب دل چاہتا یہ لوگ دوسرے کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔

آج بھی گھر میں بھینس کے پاس پکے تھے، یہ فرمائش خاص طور سے محسن کی ہوتی تھی، چنانچہ اسے مدعو کیا گیا۔

''آسیہ تو بڑا گوشت کسی بھی شکل میں نہیں کھاتی، میں آجاؤں۔''

''میں اس کے لیے الگ کھانا پکا دوں گی۔''

سلیمہ بیگم نے کہا۔

''نہیں امی، اس کی کسی دوست کے ہاں پروگرام ہے وہ وہاں جائے گی، میں آجاؤں گا۔'' محسن نے کہا اور اس وقت وہ بیٹھے محسن کا انتظار کر رہے تھے۔ یہاں ساڑھے آٹھ بجے دسترخوان لگ جاتا تھا، محسن سے کہا گیا تھا کہ وہ لازمی طور پر آٹھ بجے پہنچ جائے، لیکن اب نو بج رہے تھے، پروفیسر صاحب بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔

''میں تو اس کے بعد کھانا نہیں کھا سکوں گا، ویسے بھی بھینس کے پائے ثقیل ہوتے ہیں، مجھے نقصان دیں گے۔''

''آپ کھانا کھالیجیے، واقعی بڑی دیر ہوگئی۔'' سلیمہ بیگم نے کہا۔

''ویری گڈ، گویا اب ہر شخص نے نئے نئے اصول وضع کرنے شروع کر دیے، کیا احسان الٰہی کو مرحوم سمجھ لیا گیا ہے۔''

''ارے ارے خدا نہ کرے، سلیمہ بیگم جلدی سے بولیں، اسی وقت شکیلہ کمرے میں داخل ہوئی۔''

''بھائی کو بہت دیر ہوگئی امی، نو بج چکے ہیں، میں انہیں فون کروں۔''

''نہیں اسے علم ہے کہ کھانا ساڑھے آٹھ بجے لگ جاتا ہے، کیا اب وہ ہمارے گھر کے اصول بھی توڑنا چاہتا ہے، کوئی فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''آپ کھانا کھالیں ابو، ہم بھائی کے ساتھ کھالیں گے۔''

''جی بیٹے، آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، لیکن آپ تکلیف نہ کریں، مجھے جب ضرورت ہوگی آپ کو تکلیف دوں گا، فی الحال میں اس کا انتظار کرنا چاہتا ہوں۔'' شکیلہ کو فوراً ہی باپ کی ناراضی کا احساس ہوگیا، اس نے شرمندگی سے کہا۔

''سوری ابو۔'' یہ کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

پروفیسر نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لیے اور سوچ میں ڈوب گیا، بڑا تلخ تجربہ تھا، دنیا میں یہ سب کچھ ہوتا ہوگا انہوں نے اس طرح کے قصے کبھی غور سے نہیں سنے تھے اور سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ خود بھی ایک ایسی کہانی بن جائیں گے، بیٹے کو ہر طرح کا اعتماد دیا تھا، ہر بات میں اس سے مشورہ کرتے تھے اس کا گھر سے چلے جانا ان کے لیے بہت بڑا حادثہ تھا۔ لیکن نہ صرف خود برداشت کر گئے بلکہ سلیمہ بیگم کو بھی زیادہ دکھی نہ ہونے دیا۔ البتہ اس طرح کی بے اعتنائی ان کے لیے شدید دکھ کا باعث تھی، صحت زیادہ ٹھیک نہیں تھی، ریٹائر ہو چکے تھے، بہت آسان انداز میں سوچا تھا کہ محسن اور شکیلہ کی شادی کے بعد سب ٹھیک ہوجائے گا۔

شکیلہ تیزی سے جوان ہو رہی تھی، ان کا خیال تھا کہ بی اے کے بعد اس کی بھی شادی کر دی جائے گی، کئی رشتے آئے تھے جن میں سے ایک پر ان کی نظر تھی، لڑکے نے اسی سال فزکس میں ایم ایس سی کیا تھا اور ایک اچھی ملازمت پر لگ گیا تھا جس میں ترقی کے بڑے مواقع تھے۔ خود شکیلہ اس بارے میں ایک سادہ کتاب تھی، اس کے ذہن کے پردے پر اپنی پسند کا کوئی عکس نہیں تھا، جس کا اظہار اس نے برملا کر دیا تھا کہ جو حق والدین کو ہے وہ اس میں کبھی مداخلت نہیں کرے گی، چنانچہ یہ رشتہ قابل غور تھا۔

محسن اس بارے میں کہتا تھا کہ ابھی شکیلہ کی عمر اتنی نہیں ہے کہ اس کے لیے فکر مند ہوا جائے، وہ کم از کم ایم اے کر لے اس کے بعد دیکھا جائے گا، پہلے تو اس کی بات کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی، لیکن جب سے وہ الگ ہوا تھا اور محسوس کیا گیا تھا اس کی علیحدگی کی وجوہات کیا ہیں تو احسان صاحب فکر مند ہو گئے تھے، محسن کا جھکاؤ سسرال کی طرف زیادہ ہوگیا تھا۔

''کمال ہے، وہ بھول تو نہیں گیا؟'' سلیمہ بیگم اب بے چین ہونے لگی تھیں۔

''یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اب ہم اسے کس حد تک یاد رہ گئے ہیں۔ اس سے ہم آئندہ لائحہ عمل منتخب کر سکیں گے۔''

''اگر ایک فون کر لیا جائے تو......'' سلیمہ نے کہا لیکن شوہر نے جس انداز میں انہیں دیکھا اس کے بعد انہوں نے جملہ پورا نہیں کیا۔

''اب اس کی ایک دنیا ہے، اس دنیا میں اب آسیہ ہے، اس کے گھر والے ہیں، ساس، سسر، جنہیں وہ بڑے احترام سے امی ابو کہتا ہے، دو بھائی ہیں اس کے، یعنی ارشاد اور شمشاد، یہاں کیا تھا صرف شکیلہ......''

برابر کے کمرے سے ٹی وی پر خبریں ختم ہونے کی آواز سنائی دی تو سلیمہ اور ہول گئی۔ ''اب مجھے وحشت ہو رہی ہے، ایک بات کہوں؟''

''جی فرمایئے۔''

''ضرور وہ کسی ضروری کام میں پھنس گیا ہے۔''

''شاید۔''

''اگر فون کر لیا جائے تو۔''

''اس کے پاس بھی فون ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے، وہی فون کر کے بتا دیتا۔''

''جایئے کھانا نکلوایئے۔'' احسان صاحب نے کہا۔

کھانا ٹھیک سے نہیں کھایا گیا لیکن کھا لیا گیا۔ ساڑھے گیارہ بارہ بج گئے۔ پھر احسان صاحب نے روشنیاں بند کرنے کا حکم دیا، انہیں بیٹے کی اس بے اعتنائی پر غصہ تھا، ان کے غصے کا اظہار بہت سرد ہوتا تھا۔ گھر کا ایک طریقہ کار تھا جس میں کسی بڑی تبدیلی کی گنجائش نہیں تھی نہ ضرورت، ہاں تبدیلیاں خود بخود آ جاتی ہیں اور یہ ضروری بھی ہوتی ہیں جیسے محسن کی شادی ضروری تھی، ہوئی، پھر آسیہ کا مزاج، اس کا رویہ...... احسان صاحب نے عزت بچائی تھی کہ ان دونوں کو الگ رہنے کی اجازت دے دی تھی، جانتے تھے کہ کچھ دن کے بعد انہیں اجازت کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ انہوں نے اولاد سے تعلق بچا لیا تھا اور اب محسن کا رویہ۔

اگر وہ نہیں آ سکا تھا تو فون کر کے بتا سکتا تھا، ماں باپ کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا، نئے نئے اصول وضع کر رہا تھا۔ رات کو نجانے کب تک جاگتے رہے کراہتے رہے، بیوی پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ جاگ رہے ہیں۔ دوسری طرف بھی یہی کیفیت تھی۔

سلیمہ بیگم نے اذان کی آواز سنی تو اٹھ گئیں اور نماز کی تیاریاں کرنے لگیں، دل پر عجیب سا بوجھ تھا، نماز کے بعد دعائیں پڑھنے لگیں، پھر شکیلہ جاگ گئی، وہ بھی زیادہ دیر نہیں سوتی تھی، کالج جانے کے لیے تیاریوں میں بھی وقت لگتا ہے، پھر وہ بھی جائے نماز سے اٹھ گئیں، کچن دیکھنا تھا، ابھی کچن کی طرف بڑھی تھیں کہ ڈور بیل بج اٹھی اور ان کا دل زور سے دھڑکا۔

''اس وقت کون آ گیا، کسی کے آنے کا وقت تو نہیں تھا۔'' سلیمہ بیگم نے دروازے کی طرف جانے کے لیے رخ بدلا ہی تھا کہ احسان صاحب تیزی سے کمرے سے باہر نکلے۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' انہوں نے کہا اور تیز قدموں سے گیٹ کی طرف چل پڑے، شکیلہ بھی گھنٹی کی آواز سن کر اپنے کمرے کے دروازے پر آ گئی تھی۔

احسان صاحب نے دروازہ کھول کر دیکھا تو حیران رہ گئے، ان کی بہو آسیہ اپنے بھائی شمشاد کے ساتھ کھڑی تھی، دونوں کے چہروں سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

''ارے تم لوگ، آؤ اندر آؤ......خیریت تو ہے نا؟'' احسان کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔

''انکل۔ کیا محسن بھائی یہاں ہیں؟'' شمشاد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا اور احسان صاحب کے دل پر گھونسا سا لگا۔

''نہیں وہ یہاں نہیں آیا، رات کو میں نے اسے کھانے پر بلایا تھا، لیکن وہ نہیں آیا، کیا وہ گھر پر نہیں ہے۔'' احسان صاحب نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

سلیمہ اور شکیلہ بھی آگے آ گئی تھیں، سلیمہ نے بھی انہیں دیکھا تھا اور ان کی آوازیں بھی سن لی تھیں۔

''کیا ہوا، کیا بات ہے آسیہ؟'' سلیمہ کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

''محسن..... وہ کل شام سے گھر نہیں آئے۔''

''کل شام سے۔'' احسان الٰہی نے کہا۔

''ہاں کوئی چھ بجے کے قریب گھر سے نکلے تھے، پہلے انہیں ہمارے گھر جانا تھا، امی نے ان سے کچھ چیزیں منگوائی تھیں، مجھے کہیں اور جانا تھا اس لیے میں ان کے ساتھ نہیں گئی تھی، انہوں نے کہا تھا کہ امی کے ہاں سے انہیں یہاں آپ کے پاس آنا تھا، لیکن وہ امی کے ہاں بھی نہیں پہنچے اور رات کو بھی گھر نہیں آئے۔''

''اس کا فون اس کے پاس ہے۔'' احسان صاحب نے بے اختیار پوچھا۔ اب انہیں شدید افسوس ہوا کہ غصے میں انہوں نے نہ خود محسن کو فون کیا نہ سلیمہ کو کرنے دیا۔

''جی..... انہیں کے پاس تھا لیکن وہ بند ہے۔''

''شکیلہ..... تم کوشش کرو۔'' احسان صاحب نے کہا پھر بولے۔ ''تم لوگ اندر آؤ۔''

دونوں اندر آ گئے، آسیہ کے رخساروں پر آنسو رواں تھے۔

''خود کو سنبھالو بیٹی، اللہ بہتر کرے گا۔'' احسان صاحب بڑی مشکل سے خود پر قابو پائے ہوئے تھے۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ پلنگ پر لیٹ جائیں۔ کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔

''نہیں لگ رہا ابو فون..... کوئی آواز نہیں ہے۔'' شکیلہ کی روتی ہوئی آواز ابھری۔

''اب کیا کریں انکل؟'' آسیہ نے کہا۔

''ایں کہاں تلاش کریں گے اسے، کہاں جا سکتا ہے کہاں چلا گیا بغیر بتائے ہوئے، ایسا ہے تو نہیں۔''

''مجھے ایک دوست کی مہندی میں جانا تھا، میری بہت سی پرانی دوستیں بھی آئی ہوئی تھیں، میں ان کے ساتھ تھی، مہندیوں میں بہت دیر ہو جاتی ہے، محسن نے مجھے خود اجازت دی تھی کہ میں آرام سے مہندی انجوائے کروں اور جب آنا چاہوں انہیں فون کر دوں، لیکن ثوبیہ نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے خود ڈراپ کر دے گی اس لیے میں نے محسن کو منع کر دیا تھا کہ وہ آپ کے ہاں سے فارغ ہو کر گھر چلے جائیں اور آرام سے سو جائیں میں آ جاؤں گی، رات کو کافی دیر سے گھر پہنچی وہ گھر میں موجود نہیں تھے، مجھے حیرت ہوئی، میں نے بڑی ہمت کر کے انہیں فون کیا کوئی جواب نہیں ملا، ویسے بھی رات کو وہ موبائل آف کر دیتے ہیں۔ میں سخت پریشان تھی۔ بستر پر لیٹ کر ان کا انتظار کرتی رہی۔ پھر مجھے نیند آ گئی، مہندی کے شور شرابے سے تھک گئی تھی۔''

''تم نے ہمیں فون کیوں نہیں کیا؟'' احسان صاحب نے کہا۔

''رات اتنی ہو گئی تھی کہ میری ہمت نہیں پڑی۔'' آسیہ نے کہا۔

سلیمہ اور شکیلہ آنسو بہا رہی تھیں خود احسان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''تم لوگوں نے کہیں اور تلاش کیا اسے؟''

''ابھی تو کہیں بھی نہیں انکل، ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، آسیہ پریشان ہو کر علی الصباح ہمارے گھر آئیں اور ہمیں صورت حال بتائی تو میں انہیں لے کر سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔'' شمشاد نے کہا۔

''چلو اسے تلاش کرتے ہیں، میں کپڑے بدل آؤں سلیمہ آؤ مجھے کپڑے دو۔'' احسان صاحب کا سانس بری طرح پھول رہا تھا، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا، اکلوتا بیٹا تھا، اس کا گھر سے پہلے جانا ہی بڑی مشکل سے برداشت کیا تھا پھر اس کی زندگی کی دعائیں کرتے تھے کہ وہ سلامت رہے، دل کو سہارا تھا کہ اچھے برے وقت کا سہارا بیٹا تو ہے، پتا نہیں کہاں ہے۔''

''ہم انہیں کہاں تلاش کریں انکل؟'' آسیہ نے روتے ہوئے کہا۔

''اللہ تعالیٰ خیر کرے، میں اسے جانتا ہوں اتنا برا نہیں ہے کہ سب کو نظر انداز کر دے۔ کوئی گڑبڑ ہی ہوئی ہے۔'' احسان صاحب نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''یا اللہ میرے بچے کی خیر.....'' سلیمہ بیگم کے

ضبط کا بندٹوٹ گیا اور وہ زار و قطار رونے لگیں۔

''نہیں امی روئیں نہیں پلیز..... بھائی آ جائیں گے، روئیں نہیں امی۔'' شکیلہ ماں کو تسلی دیتے ہوئے خود بھی رونے لگی۔

''ہم اسے سرکاری ہسپتالوں میں تلاش کرتے ہیں، خدانخواستہ کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو، ریسکیو والے سرکاری ہسپتالوں میں لے جاتے ہیں، وہاں نہ ملا تو پولیس میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کراتے ہیں، تم لوگ ٹیکسی میں آئے ہو؟''

''نہیں میں اپنی گاڑی میں آئی ہوں۔''

''اس تو کیا اپنی گاڑی نہیں لے گیا تھا۔''

''نہیں۔ انکل گاڑی دو دن سے میرے پاس تھی، میں نے محسن بھائی سے مانگ لی تھی، کچھ ضروری کام تھے مجھے؟'' شمشاد نے بتایا۔

''اچھا.....'' احسان صاحب نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''چلو۔''

''میں بھی چلوں گی ابو۔'' شکیلہ نے کہا۔

''نہیں تمہاری امی اکیلی کیسے رہیں گی؟''

''نہیں میں چلوں گی۔'' شکیلہ نے روتے ہوئے کہا، اس نے اس طرح ضد کی کہ اسے ساتھ لینا پڑا، باہر محسن کی کار کھڑی تھی جو اب شمشاد کے پاس تھی۔ چاروں کار میں بیٹھ کر چل پڑے۔ شمشاد ہسپتالوں کے چکر لگانے لگا، تمام بڑے بڑے سرکاری ہسپتالوں میں وہاں کے مردہ خانوں میں، ایمرجنسی وارڈ وغیرہ ہیں معلومات حاصل کی گئیں، لیکن کوئی پتا نہیں چل سکا، کچھ بڑے غیر سرکاری ہسپتالوں میں بھی دیکھا گیا، اس کے بعد احسان صاحب نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''اب ایسا کرو شمشاد، پولیس اسٹیشن چلو، رپورٹ درج کرادیں۔''

وہ علاقے کے پولیس اسٹیشن پہنچ گئے، آسیہ اور شکیلہ باہر کار میں بیٹھی رہیں اور احسان صاحب شمشاد کے ساتھ تھانے میں داخل ہو گئے، ذمے دار افسران نے رپورٹ درج کی، روایتی سوالات کیے، کسی سے دشمنی، کوئی جھگڑا، کوئی عورت وغیرہ کا قصہ، کوئی گھریلو ناچاقی وغیرہ، رپورٹ شمشاد کی طرف سے درج کی گئی تھی، پولیس والوں نے روایتی انداز میں ہی اپنے تعاون کا وعدہ کیا تھا۔

''تمہیں اس کے دوستوں کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟''

''زیادہ نہیں۔ دیکھ لیتے ہیں۔'' شمشاد نے کہا۔

''اس کا ایک بہت پرانا اور قریبی دوست ہے الیاس، اس کے پاس چلتے ہیں۔'' الیاس محسن کی اس طرح گمشدگی کی خبر سن کر دنگ رہ گیا تھا، اس نے زبردستی ان لوگوں کو ناشتا کرایا اور تسلی دی کہ وہ ابھی محسن کی تلاش میں نکلتا ہے، اس نے کہا کہ وہ کچھ اور دوستوں کو بھی ساتھ شامل کرتا ہے، آپ لوگ گھر جا کر آرام کریں۔

الیاس نے سب کے سیل نمبر لیے اور انہیں دلاسے دے کر رخصت کر دیا۔ الیاس پڑھا لکھا نوجوان تھا، اس نے چند اور دوستوں کو ساتھ لے کر محسن کی تلاش شروع کر دی، ساتھ ہی جن اور دوستوں کے بارے میں الیاس کو معلوم تھا اس نے ان سے بھی رابطے کیے، لیکن کوئی پتا نہیں چل سکا، محسن کسی سے نہیں ملا تھا۔ الیاس کے کچھ عزیز پولیس میں بھی تھے اور اس نے ان سے مدد لی، خاصی رات گئے اسے اطلاع ملی کہ آج شہر کے ایک بڑے سرکاری ہسپتال میں تین لاشیں لائی گئی ہیں جو نامعلوم ہیں، ان میں سے دو مرد اور ایک عورت ہے۔ تینوں لاشیں ہسپتال کے مردہ خانے میں موجود ہیں انہیں دیکھا جا سکتا ہے الیاس اور اس کا ایک دوست ہاشم ہسپتال پہنچ گئے، ضروری کاروائی کے بعد وہی بغیر قبروں کے قبرستان میں داخل ہو گئے، بے حد بھیانک ماحول تھا، مرنے والوں کو اس عارضی پناہ گاہ میں داخل ہو کر ان کے بدن تھرا گئے، یہاں مردے عجیب عجیب شکلوں میں نظر آتے ہیں۔

الیاس نے خوف بھری نگاہوں سے ان مردوں

کی لاشیں دیکھیں اور اس کے حلق سے مدہم سی آواز نکلی۔

''ہاشم..... ہاشم یہ، یہ دیکھو، یہ.....'' وہ محسن کی لاش تھی۔

ہاشم نے بھی محسن کا چہرہ پہچان لیا، دونوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے، الیاس کے تو پاؤں لڑکھڑا گئے تھے، اس کا سارا بدن شدید سنسناہٹ کا شکار تھا، ہاشم نے مشکل سے اسے سنبھالا اور بولا ''آؤ باہر چلیں، وہ محسن ہی کی لاش ہے۔'' وہ الیاس کو سنبھالے ہوئے مردہ خانے سے باہر لایا، باہر آتے ہی الیاس پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا، ہاشم نے اسے بمشکل سنبھالا اور پھر وہ لاش کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے چل پڑا۔

محسن کی لاش شہر کے ایک نواحی لیکن آباد علاقے میں ایک ایسی جگہ پڑی ملی تھی جہاں گہرائی تھی اور ان گہرائیوں میں جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، اس جگہ سے تھوڑے فاصلے پر ایک میدان تھا، جسے صاف ستھرا کر کے کرکٹ گراؤنڈ بنا لیا گیا تھا، آبادی کے لڑکے وہاں کرکٹ کھیلتے تھے۔ انہی نے یہ لاش دیکھی تھی، اس وقت شام ہو رہی تھی، لڑکوں کو یہ غیر متحرک جسم دیکھ کر خوف محسوس ہوا تاہم انہوں نے اسے قریب سے دیکھا اور انہیں پتا چل گیا کہ یہ لاش ہے۔

پولیس کو اطلاع دی گئی، پولیس نے وہاں پہنچ کر لاش تحویل میں لے لی، لاش ایک مرد کی تھی جسے گردن دبا کر قتل کیا گیا تھا، لاش کی گردن پر گلا گھونٹ دینے کے نشانات صاف تھے، لیکن مرنے والے کے پاس سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہوئی تھی۔ جو اس کی شناخت کر سکتی، چنانچہ لاش ہسپتال پہنچا دی گئی، جہاں دوسرے دن اس کا پوسٹ مارٹم کیا جانا تھا۔

''اب کیا کریں؟'' ہاشم نے الیاس سے پوچھا۔

''یار۔ ہم کیسے اس کے گھر اطلاع دیں، کیسے ان لوگوں کو بتائیں کہ کہ..... ان کے اکلوتے بیٹے ایک بہن کے بھائی ایک جواں سال بیوی کے شوہر کا بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے انہیں فون پر اطلاع دے دیں، مجھ سے ان کی کیفیت نہیں دیکھی جائے گی۔'' الیاس نے کہا۔

''نہیں الیاس یہ مناسب نہیں ہوگا، ہمیں ان کے دکھ درد میں شریک کرنا ہوگا، وہاں اب کوئی بھی نہیں ہے، جو انہیں سہارا دے۔'' ہاشم نے کہا اور الیاس شرمندہ ہوگیا۔

''بس ان کا دکھ مجھ سے نہیں دیکھا جائے گا، اور کوئی بات نہیں۔''

الیاس اور ہاشم جس وقت احسان صاحب کے گھر پہنچے تو وہاں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ پورے گھر پر سوگ برس رہا تھا۔ آسیہ وغیرہ اپنے گھر جا چکے تھے، باقی تین افراد برآمدے میں بیٹھے ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے، ان کے کان باہر کی آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ شاید محسن اچانک واپس آجائے اور یہی ہوا، ڈور بیل پر تینوں پاگلوں کی طرح دروازے کی طرف دوڑے تھے، لیکن دروازے پر ہاشم اور الیاس کھڑے تھے۔

''کچھ..... کچھ پتا چلا بیٹے۔'' احسان صاحب نے مایوسی سے کہا۔

''ہاں۔'' الیاس بولا تو احسان صاحب اچھل پڑے۔

''کیا..... کیا کہا، پتا چل گیا ہے، کہاں ہے وہ، تمہارے ساتھ نہیں آیا، کیا اپنے گھر نہیں گیا۔'' احسان صاحب نے کئی سوال کر ڈالے اور الیاس رو پڑا، بمشکل تمام ہاشم نے گلوگیر لہجے میں انہیں پوری تفصیل بتائی۔ سلیمہ روتے روتے بے ہوش ہوگئی، شکیلہ پر سکتہ طاری ہوگیا، احسان صاحب پاگلوں کی طرح سب کی شکلیں دیکھنے لگے۔

انہی دونوں نے آسیہ اور اس کے گھر والوں کو یہ روح فرسا خبر سنائی۔ سب کا برا حال ہوگیا، آسیہ نے چوڑیاں توڑ دیں، بال نوچ ڈالے، وہ جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی اس طرح لمحوں میں سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ محسن نے گھر ضرور چھوڑ دیا تھا، لیکن

احسان صاحب کے لیے بہت بڑا سہارا تھا، جوان بیٹی کا بوجھ ان پر تنہا نہیں تھا، لیکن اب وہ تنہا ہو گئے تھے۔ ہاشم اور الیاس سب کچھ کر رہے تھے۔ دونوں ہمدرد اور خدا ترس تھے، انہوں نے پولیس سے وہ جگہ معلوم کی جہاں سے محسن کی لاش دستیاب ہوئی تھی۔ وہاں جا کر اس جگہ کا جائزہ لیا اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ محسن کو یہاں قتل کیا گیا ہے یا کہیں اور..... پھر اس کی لاش یہاں لا کر ڈالی گئی ہے، انہوں نے آس پاس کے لوگوں سے بھی معلومات کیں۔

دوسرے دن پوسٹ مارٹم رپورٹ موصول ہوگئی، محسن کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا، گردن دبائی گئی تھی، لیکن دستانے پہن کر کیونکہ گردن پر انگلیوں کے نشانات نہیں تھے۔ مزید یہ کہ قاتل اور مقتول کے درمیان خاصی ہاتھا پائی ہوئی تھی۔ مقتول کے جسم کے دوسرے حصوں پر شدید مزاحمت کے نشانات موجود تھے۔ یہ اندازہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ قاتل شاید ایک سے زیادہ تھے کیونکہ مقتول کے جسم پر جو نشانات تھے وہ صرف ایک شخص سے جدوجہد کے نہیں تھے پوسٹ مارٹم کے بعد لاش ورثاء کے حوالے کر دی گئی، پورے علاقے میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ احسان الٰہی بے حد شریف انسان تھے، کچھ لوگوں نے پہلے ہی محسن کے اس اقدام کو ناپسند کیا تھا کہ وہ بیوی کے آجانے پر ماں باپ اور جواب بہن کو چھوڑ کر گھر سے چلا گیا تھا اور اب دنیا ہے سے چلا گیا تھا، آسیہ اور اس کے گھر والے بھی یہیں آ گئے تھے کیونکہ الیاس اور ہاشم لاش کو احسان صاحب کے گھر ہی لائے تھے۔ آسیہ غم کی تصویر بنی ہوئی تھی رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔

آسیہ کے باپ کا نام حیات خاں اور ماں کا نام سعیدہ تھا، اس کے دونوں بھائی شمشاد اور ارشاد اس سے بڑے تھے۔ لیکن تمام بہن بھائیوں میں بس سال دو سال کا فرق تھا، البتہ دونوں بھائیوں کی ابھی شادیاں نہیں ہوئی تھیں۔ آسیہ کی شادی کو بھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ غرضیکہ جواں سال محسن کے کفن دفن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ آسیہ کا باپ حیات خاں رو رو کر کہہ رہا تھا۔

''مجھے اپنی بیٹی کے بیوہ ہونے کا ہی غم نہیں ہے احسان بھائی، مرحوم محسن نے تھوڑے ہی دنوں میں میرے دل میں اتنی جگہ بنالی تھی کہ مجھے لگتا ہی نہیں تھا کہ میرے دو بیٹے ہیں۔ وہ میرا تیسرا بیٹا تھا، یہ بچے کون ہیں۔'' حیات خان نے الیاس اور ہاشم کے بارے میں پوچھا کیونکہ وہ دونوں ہر معاملے میں پیش پیش تھے۔

''دونوں میرے محسن کے دوست ہیں۔''

''اچھے لوگوں کے دوست بھی اچھے ہوتے ہیں۔'' حیات صاحب نے کہا اور دونوں ہاتھوں سے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرنے لگے۔

پوسٹ مارٹم کے بعد گمشدگی کا یہ کیس قتل کے کیس میں بدل گیا تھا، مقتول کی لاش دستیاب ہوگئی تھی چنانچہ پولیس مصروف عمل ہوگئی۔ ظاہر ہے ابتدائی تفتیش محسن گھر اور سسرال سے ہونی تھی، متعلقہ تھانے کے انچارج رئیس خاں نے تفتیش کا آغاز کیا جس کے نتیجے میں پولیس کو بتایا گیا کہ مقتول ایک صلح جو اور صاف ستھری طبیعت کا نوجوان تھا، اس کی یا ان دونوں خاندانوں کی کبھی کسی سے دشمنی نہیں رہی تھی، کسی بھی طرح کا کوئی خاندانی جھگڑا یا جائداد کا تنازعہ نہیں تھا۔

''ہمیں ان کے دوستوں وغیرہ کے نام اور پتے بتایے۔'' انچارج نے کہا اور احسان علی نے وہ نام بھی بتا دیے۔ ''مقتول کے اپنی بیوی سے کیسے تعلقات تھے، کوئی اختلاف یا جھگڑا۔''

''ہرگز نہیں، ہماری بہو آسیہ ایک نیک خاتون کی نیک لڑکی ہے، ہم نے خود ان دونوں کو الگ رہنے کی اجازت دی تھی تاکہ دونوں اپنی ذمے داریوں کے عادی ہوں۔'' احسان صاحب نے کہا۔

''مرحوم کے تعلقات اپنے سسرال والوں سے کیسے تھے؟''

''بہت اچھے، یہ بات اس کے سسرال والے

بھی بتائیں گے۔''

حیات خان، ان کے دونوں بیٹوں نے بھی وہی سب کچھ بتایا جو احسان صاحب بتا چکے تھے۔ اس میں اضافہ یہ تھا کہ محسن نے ان سے دس ہزار روپے لیے تھے اور کہا تھا کہ وہ یہ پیسے بینک سے نہیں نکلوا سکا، اسے اپنے والدین کو یہ پیسے دینے ہیں، شام کو اسے اپنے ماں باپ کے گھر جانا ہے۔

پولیس کی دس ہزار کی رقم محسن کی جیب سے نہیں ملی تھی بلکہ بعد کی پوچھ گچھ سے پتا چلا کہ محسن کے ہاتھ میں ایک بے حد قیمتی گھڑی بندھی تھی جو اس کی لاش سے دستیاب نہیں ہوئی، جب اس رقم کے بارے میں احسان صاحب سے پوچھا گیا تو انہوں نے لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ ان کے اور محسن کے درمیان کسی بھی طرح کے پیسے کا لین دین نہیں تھا وہ اپنی پنشن سے گزارہ کرتے ہیں، ہاں وہ اپنی بہن کو تین ہزار روپے ماہانہ جیب خرچ دیتا تھا۔

''آپ کے خیال میں اس نے یہ دس ہزار روپے کیوں لیے ہوں گے جبکہ اس نے حیات خان صاحب سے یہ کہہ کر پیسے لیے تھے کہ یہ رقم وہ اپنے والدین کو دینا چاہتا ہے۔''

''میں نہیں جانتا۔'' احسان صاحب نے کہا۔

''ممکن ہے اس کا قتل اس کی گھڑی اور دس ہزار روپے کے لیے کیا گیا ہو کیونکہ اس کے علاوہ قتل کی اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، آپ کے بیٹے کو ضرور نامعلوم لٹیروں نے ہلاک کیا ہے، اور لوٹنے کی کوشش میں مزاحمت پر اسے گردن دبا کر ہلاک کر دیا۔''

''آہ اس کی تقدیر میں ایسی دردناک موت لکھی تھی، میں تو اس کے لیے اپنے آپ کو بھی بیچ سکتا تھا۔''

''ہم ان نامعلوم لیٹروں کے خلاف مقدمہ درج کیے لیتے ہیں، آپ بے فکر رہیں، ان کی تلاش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جائے گی اور ان کی گرفتاری کے بعد انہیں بدترین سزا دی جائے گی۔''

علاقہ تھانے کا انچارج ایسے سینکڑوں واقعات سے دن رات دوچار ہوتا ہے اور کوشش ضرور کرتا ہے کہ مجرم ہاتھ لگ جائیں، لیکن مجرم بیوقوف نہیں ہوتے جرم سے پہلے وہ اپنے گرد حصار بناتے ہیں اور اپنے جرم کو چھپانے کے لیے مضبوط خول تیار کرتے ہیں۔

رئیس خاں نے اس کیس کے کمزور ہونے کے باوجود اپنے فرض کو پورا کرنے کے لیے کام شروع کر دیا، کسی بھی قتل کی صورت میں قاتل کو تلاش کرنے کے لیے اس کے اردگرد لوگوں پر نظر ڈالی جاتی ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ مرنے والے کی موت سے سب سے زیادہ فائدہ کسے پہنچتا ہے، حالانکہ یہ مفروضہ زیادہ اہم تھا کہ اسے دس ہزار روپے اور قیمتی گھڑی کے لیے قتل کیا گیا ہے، لیکن پھر بھی پولیس دوسرے امور کا بھی جائزہ لے رہی تھی۔

کچھ عرصہ قبل محسن نے ایک خوب صورت مکان خریدا تھا جو اس نے اپنی بیوی آسیہ کے نام سے رجسٹر کرایا تھا اور آسیہ اب اس کی قانونی مالک تھی، اس کے ساتھ ہی محسن نے اسے شاندار ڈیکوریٹ کرایا تھا، وہاں اس نے دنیا کی ہر چیز مہیا کر دی تھی، پتا نہیں اس مکان کو وہ کس طرح استعمال کرنا چاہتا تھا۔ ان کے پاس اچھا خاصا بینک بیلنس تھا اور ان کا مشترکہ اکاؤنٹ تھا، تمام کوائف سے اس بات کا اظہار ہوتا تھا کہ محسن کے پاس جو کچھ تھا وہ اس کی بیوی آسیہ کی ملکیت تھا۔ اس طرح آسیہ یا اس کے گھر والوں کو محسن کو نقصان پہنچانے کی ضرورت نہیں تھی۔ نہ ہی محسن کے قتل میں اس کے اپنے گھر والوں کے بارے میں کچھ سوچا جا سکتا تھا۔

لاکھ دماغ لڑانے کے باوجود اس کے علاوہ اور کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی کہ محسن کا قتل صرف رہزنی کا نتیجہ تھا، چنانچہ تمام کارروائیوں کے بعد معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا اور پے چارے محسن کی موت بے وقعت ہوگئی۔ اس کے قتل کے سلسلے میں کسی شخص کو پوچھ گچھ تک کے لیے گرفتار نہیں کیا گیا۔ یوں کئی ماہ گزر گئے، آسیہ نے اپنی عدت پوری کر لی، اس کے

ساتھ ضروری کارروائیوں کے تحت اب اس نے سارا اکاؤنٹ اپنے نام کرالیا، گھر تو تھا ہی اس کے نام، محسن کی کار بھی آسیہ کے بھائی شمشاد کے پاس تھی، محسن کی موت کے کچھ دن کے بعد شمشاد نے کار کی چابی احسان صاحب کو دینا چاہی تو انہوں نے انکار کردیا۔

''نہیں بیٹے، ہم اس کا کیا کریں گے، یہاں کسی کو کار چلانی بھی نہیں آتی، تم یہ کار آسیہ کو دے دو، وہ اسے استعمال کرلے گی۔'' چنانچہ وہ کار بھی آسیہ کے پاس آگئی۔

احسان صاحب راتوں کو جاگتے رہتے تھے، بیٹے کو یاد کرکے روتے تھے، وہ دعائیں مانگتے تھے کہ ان کے لختِ جگر کے قاتلوں کو بھی سزا ملے۔ اس شام تینوں خاموش بیٹھے بے دلی سے ٹی وی دیکھ رہے تھے، بس وقت گزاری تھی ورنہ ان کے دل اداسی میں ڈوبے رہتے تھے، دروازے کی بیل بجی تو سب چونک پڑے۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' احسان صاحب نے کہا، دروازہ کھول کر دیکھا تو الیاس تھا۔ اسے دیکھ کر خوش ہوگئے، الیاس مثالی نوجوان تھا۔ اس نے محسن کی موت کے بعد ان لوگوں کو جس طرح خیال رکھا تھا، وہ ایک بہت بڑی بات تھی، کون کسی کو یاد رکھتا ہے، احسان صاحب اسے اندر لے آئے، الیاس نے سب کو سلام کیا، سلیمہ بیگم نے شکیلہ سے چائے بنانے کے لیے کہا۔

چائے کے دوران الیاس نے کہا۔ ''آنٹی..... کیا آسیہ بھابھی میرا مطلب ہے ان کے گھرانے سے آپ کا رابطہ ہے، میرا مطلب ہے کہ آپ کی زبانی کبھی ان کے آنے کے بارے میں نہیں سنا۔''

''بس وہ محسن کی جدائی کے بعد صرف دو بار آئی ہیں، اب تو طویل عرصہ ہوگیا اور پھر انہوں نے تو محسن کی زندگی میں ہی ہمارے پاس رہنا پسند نہیں کیا تھا۔'' سلیمہ بیگم نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ کو یہ بھی پتا نہیں ہوگا کہ ان کی شادی ہورہی ہے؟'' الیاس نے کہا۔

''کیا؟'' سب چونک پڑے۔

''جی ان کی شادی ہورہی ہے۔''

''میرے خدا..... اتنی جلدی ابھی تو میرے بچے کا کفن بھی میلا نہیں ہوا ہوگا۔'' سلیمہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہاں زندہ لوگوں کے لباس کی کوئی فکر نہیں کرتا آنٹی، کفن کی بات کون سوچتا ہے، ویسے ایک بات کہوں آپ لوگ برا نہ مانیئے۔'' الیاس نے کہا۔

''تمہاری بات کا برا کون مانے گا الیاس، تم انسان کے روپ میں فرشتہ ہو۔'' احسان صاحب نے کہا۔

''یہ جان کر میرا دل بے ایمان ہوگیا ہے کہ آسیہ بیگم نے اتنی جلدی شادی رچانے کا فیصلہ کرلیا، ایسا لگتا ہے جیسے وہ دوسری شادی رچانے کے لیے محسن کی موت کا انتظار کررہی ہوں۔''

یہ الفاظ ایک دھماکا تھے، سب کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے، یہ الیاس کیا کہہ رہا، اس کا مطلب کیا ہے، کیا کہنا چاہتا ہے وہ۔ احسان صاحب نے خود کو سنبھالا اور بولے۔

''وہ نوعمری میں بیوہ ہوئی ہے، اس کے شادی شدہ رہنے کے دن ہی کتنے رہے، عمر دیکھتے دیکھتے بڑھتی ہے، کوئی اچھا رشتہ مل گیا ہوگا، عدت بھی پوری ہوگئی ہے حیات خان بھی چلتا پرزہ ہیں، بیٹیوں کو کون گھر بٹھانا پسند کرتا ہے، وہ بھی ایک بیوہ کو۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں انکل، لیکن آسیہ اتنی جلدی تیار کیسے ہوگئیں، وہ تو اپنے شوہر کے ساتھ جان دینے کے لیے تیار تھیں، میں نے یہی سنا تھا۔'' الیاس نے کہا۔

''ارے بیٹے، یہ وقتی کہانیاں ہوتی ہیں، کون کسی کے لیے جان دیتا ہے، آسیہ کا تو محسن سے سال سوا سال کا ساتھ تھا ہمیں دیکھو..... اس کی زندگی کے پہلے دن سے ہمارا اس کا ساتھ تھا، ہم کون سے مرگئے،

کھا رہے ہیں، پی رہے ہیں، جی رہے ہیں، اسے بھی اس کے باپ بھائیوں نے مجبور کیا ہوگا، جوان بچی ہے، زندگی بیٹھ کر تو نہیں گزرتی۔'' احسان صاحب بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں انکل، میں فرشتہ بننے کی کوشش نہیں کر رہا، نہ ہی معاف کیجیے گا، مجھے آپ سے کوئی لالچ ہے، لیکن میں محسن کو بھول نہیں سکتا وہ مجھے بہت یاد آتا ہے اور سچ بتاؤں مجھے اس کی موت کا یقین نہیں آ رہا، کچھ باتیں، کچھ خیالات مجھے پریشان کیے ہوئے ہیں۔''

''کیا بیٹے؟'' احسان صاحب نے کہا۔

''آپ کو یہی نہیں معلوم کہ آسیہ کی شادی ہو رہی ہے، تو یہ کیسے معلوم ہوگا کہ وہ کس سے شادی کر رہی ہے۔''

''ہاں ایسا ہی ہے۔''

''اس کی شادی غلام پاشا سے ہو رہی ہے، یہ شخص کوئی پینتالیس پچاس کی عمر والا ہے، پہلی بیوی مر چکی ہے اس کے دو بچے ہیں، بیٹی کی عمر انیس سال ہے، بیٹا سترہ سال کا ہے دونوں امریکہ رہتے ہیں اور وہیں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔''

''اوہ..... اچھا دولت مند آدمی ہوگا۔'' سلیمہ نے کہا۔

''جی آنٹی..... کروڑ پتی ہے، لیکن دنیا جانتی ہے کہ وہ ایک بدنام اسمگلر اور منشیات فروش ہے۔''

''ایں.....'' احسان الٰہی چونک پڑے۔ ''کیا یہ بات حیات خاں کو نہیں معلوم؟''

''دنیا جانتی ہے انکل تو وہ نہیں جانتے ہوں گے، زیادہ عرصہ نہیں گزرا غلام پاشا ہیروئن کی اسمگلنگ کے الزام میں گرفتار ہوا تھا، لیکن پھر آزاد ہو گیا، اس نے آسانی سے خود کو بے گناہ ثابت کر دیا اور اپنے کچھ کارندوں کو مجرم قرار دے کر انہیں سزائیں دلوا دیں، لیکن دنیا جانتی ہے، اصل مجرم وہی تھا۔''

''کمال ہے حیات بھائی ایسے شخص سے بیٹی کی شادی کر رہے ہیں۔'' سلیمہ نے کہا۔

''آپ لوگ بہت معصوم ہیں آنٹی انکل، اس وقت شریف صرف وہ ہے جو دولت مند ہے، دولت شرافت کی ترازو ہے۔'' الیاس نے کہا۔

''کیا کر سکتا ہے کوئی بیٹے، ہمیں ان باتوں سے کیا فرض، ہم تو ویسے ہی ستم رسیدہ ہے، ہماری دیوار تو گر چکی ہے۔'' احسان صاحب نے کہا۔

''نہیں انکل..... آپ ایسے نہ کہیں میرا دل کچھ اور ہی کہہ رہا ہے۔'' الیاس نے کہا۔

''کیا؟'' احسان صاحب حیرت سے بولے۔

''انکل، میرا دوست رہزنی کا شکار نہیں ہوا ہے، اس کے خلاف سازش کی گئی ہے، پتا نہیں کیوں شروع ہی سے میں اور ہاشم ایک الجھن کا شکار تھے، دونوں محسن کی موت کے بارے میں باتیں کرتے رہتے تھے، ہاشم بہت چلاک ہے، اس نے مجھ سے کہا کہ محسن کو جس طرح ہلاک کیا گیا ہے، دل نہیں مان رہا، پھر اس نے مجھے بتائے بغیر آسیہ بھابھی کے بارے میں معلومات کرنے کا فیصلہ کر لیا، اس کے دل میں کوئی برا خیال نہیں تھا، بس وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ان پر کیا گزر رہی ہے، بس اس نے بہت سی معلومات حاصل کیں جو بالکل ٹھیک ہیں۔''

''کیا الیاس بھائی؟'' شکیلہ نے بے باکی سے پوچھا۔

''محسن سے شادی سے پہلے آسیہ کے لیے غلام پاشا نے رشتہ دیا تھا۔ اس وقت غلام پاشا کی بیوہ زندہ تھی، لیکن وہ آسیہ سے شادی کرنا چاہتا تھا، اس کا موقف تھا کہ اسے بڑے بڑے اونچے تعلیم یافتہ لوگوں، اعلیٰ حکام اور سرکاری پارٹیوں میں جانا پڑتا ہے، بیرون ممالک بھی جانا رہتا ہے جبکہ اس کی بیوی ایک جاہل اور گھریلو عورت ہے، جسے کپڑے تک ٹھیک سے پہننا نہیں آتا، اس لیے وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے، حیات خاں صاحب تیار ہو گئے تھے، لیکن ابھی دنوں غلام پاشا منشیات کی اسمگلنگ کے جرم میں گرفتار ہو گیا، بس اس کی شادی آسیہ سے نہیں ہو سکی اور محسن سے ہو گئی۔''

''یہ بات ہمارے علم میں تو نہیں تھی ابو۔'' شکیلہ نے کہا۔

''ہاں حیات خاں نے ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔''

''اور شاید آسیہ نے محسن کو بھی نہیں بتائی، ورنہ وہ مجھ سے تذکرہ ضرور کرتا۔'' سلیمہ بیگم نے کہا۔

''یہ بہت اہم بات تو نہیں ہے پیغام دیا گیا، شادی نہیں ہوسکی، ایسے رشتے آتے ہی شادی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی، ان کے تذکرے بے معنی ہوتے ہیں۔'' احسان صاحب بولے۔

''غلام پاشا گرفتار ہوگیا لیکن ایسے لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں، وہ آزاد ہوگیا، اس دوران آسیہ کی شادی محسن سے ہوگئی، الیاس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ عرصے کے بعد غلام پاشا کی بیوی جو ڈرائیور کے ساتھ کار میں جارہی تھی، ٹریفک کے ایک حادثے میں ہلاک ہوگئی، سے کسی نا معلوم بھاری گاڑی نے ٹکر ماری اور اس کی کار چکنا چور ہوگئی، ڈرائیور اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگئے اور آنٹی..... غلام شاہ بے لگام ہوگیا، لیکن انکل اس نے حیات خاں سے بدستور رابطہ رکھا۔''

''کیا مطلب؟'' پروفیسر احسان الٰہی چونک پڑے۔

''جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، مکمل تصدیق کے بعد کہہ رہا ہوں..... غلام پاشا اپنے کیس سے فارغ ہو چکا تھا۔ اگر عین وقت پر وہ منشیات کے اسمگلر کی حیثیت سے گرفتار نہ ہوگیا ہوتا تو اس کی شادی آسیہ سے ہی ہوتی، کیونکہ حیات خاں اس کے لیے مکمل تیار تھے، رہا ہونے کے بعد آخر کار اس کا رابطہ حیات خاں سے کیوں جاری رہا اور پھر اس نے کہیں اور شادی کیوں نہیں کی۔''

''تمہارا مطلب ہے، تمہارا مطلب ہے۔'' احسان صاحب کا سانس پھولنے لگا۔

''اگر آپ واقعات کی کڑیوں کو ملائیں تو بہت سے شبہات جنم لیتے ہیں، غلام پاشا آسیہ سے شادی کرنا چاہتا تھا، لیکن اس کی گرفتاری کی وجہ سے یہ شادی نہیں ہوسکی اور آسیہ کی شادی محسن سے ہوگئی بعد میں غلام پاشا مختصر سی سزا کے بعد باہر نکل آیا، پھر اس کی بیوی حادثے کا شکار ہوگئی۔ اس گاڑی کا کہیں پتا نہیں چلا جس نے یہ حادثہ کیا تھا، پھر انکل پھر کچھ عرصے کے بعد میرا دوست قتل کردیا گیا، آج تک پولیس اس کے قاتلوں کا پتا نہیں چلا سکی، بالکل غلام پاشا کی بیوی کی موت کی طرح۔''

''ہائے تو کیا میرے بھائی کو؟'' شکیلہ ضبط نہ کرسکی اور بے اختیار رو پڑی۔

کچھ دیر کے بعد ماحول غم ناک ہوگیا، پھر احسان صاحب نے کہا۔

''میں ایک صلح جو اور مجبور سا انسان ہوں، اپنے آخری سانس تک اپنے اکلوتے بیٹے کی موت نہیں بھول سکتا۔ مجھے زندگی سے بھی دلچسپی نہیں ہے، لیکن مجھے اپنی بیٹی کے لیے جینا ہے، آج بھی اگر مجھے اپنے محسن کے قاتلوں کا پتا چل جائے تو پولیس یا قانون اسے سزا دے سکے یا نہ دے سکے میں ضرور اس کا خون پی جاؤں گا۔'' احسان صاحب کے لہجے میں ایک خوں خوار غراہٹ پیدا ہوگئی۔

''اور اب اس کے راستے ہموار ہوگئے اور اس کی شادی آسیہ سے ہورہی ہے۔'' الیاس نے سرد لہجے میں کہا۔

''نہ صرف حیات خان بلکہ ظاہر ہے آسیہ نے بھی وہ اسی لیے میرے بھائی کو ہم سے چھین کر لے گئی تھی۔'' شکیلہ نے بدستور روتے ہوئے کہا۔

''ہم یہ بات کبھی نہیں بھول سکتے کہ غلام پاشا ایک بدترین جرائم پیشہ آدمی ہے، اسمگلر ہے، واقعات کی کڑیاں ملایئے تو ایک بے حد مشکوک تصویر ابھرتی ہے، غلام پاشا کسی نا معلوم بنیاد پر یا پھر یوں کہیں کہ اپنے اسی موقف کے تحت آسیہ سے شادی کرنا چاہتا تھا کہ وہ سوسائٹی میں اپنی اسمارٹ بیوی کو موو کرسکے، اس نے اس مقصد کے لیے اپنی پہلی بیوی پھر میرے دوست کو قتل کرادیا۔'' الیاس کی آواز بھرا گئی۔

''میرا بچہ۔'' سلیمہ بیگم بھی رونے لگیں۔ ''کیا یہ منحوس شادی میرے بچے کی موت بن گئی۔

دیر تک خاموشی طاری رہی، پھر احسان صاحب نے کہا۔ ''میں ایک کمزور آدمی ہوں الیاس بیٹے.....لوگ کہتے ہیں گڑے مردے نہیں اکھاڑنے چاہیے ہیں، لیکن میرے دونوں بازو ٹوٹ گئے ہیں انہیں کیسے بھلادوں، مجھے بتاؤ الیاس میں کیا کروں۔''

''انکل آپ ضرور سوچیں گے کہ اس نفسا نفسی کے دور میں جب ہر انسان اپنی ہی الجھنوں سے نجات نہیں حاصل کر پاتا، میں اور ہاشم ابھی تک محسن کے قتل کو کیوں نہیں بھول سکے، تو بس میں آپ کو یہ بتادوں کہ ہر انسان کمزور ہوتا ہے۔ میں بھی کمزور ہوں، محسن میرا دوست تھا، میں نے مردہ گھر میں اس کی لاش دیکھی تھی، اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، وہ مجھے دیکھ رہی تھیں، مجھے ان سے ایک آواز آرہی تھی وہ کہہ رہا تھا الیاس میرے ماں باپ کا خیال رکھنا، میں نے کسی کو دھوکے میں آکر آنکھیں چھوڑ دیا، میں انکل..... میں آگے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' الیاس گلوگیر لہجے میں بولا، پھر آنکھیں خشک کر کے کہنے لگا۔

''ہاشم بھی محسن سے اتنی ہی محبت کرتا تھا، وہ بے حد چالاک ہے، ایک بار ہم اس ہوٹل میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہاں طالب علمی کے دور مین محسن بھی ہمارے ساتھ ہوتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے ہاشم نے کہا کہ الیاس محسن کا قتل ذہن سے نہیں اترتا، پتا نہیں کیوں عجیب عجیب سے خیالات دل میں آتے ہیں۔ پھر ہم دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے، میں نے ہاشم کو بتایا کہ ایک بار محسن مجھے بہت پریشان نظر آیا، میں نے اس سے پریشانی کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ یار میں بڑی مشکل میں ہوں، ماں باپ کے پاس سے الگ ہوجانے پر مجھے خوشی نہیں ہے، لیکن کچھ لوگ ہماری ازدواجی زندگی تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، مجھے لگتا ہے جیسے میرے خلاف سازش ہورہی ہے۔''

''یہ کہا تھا محسن نے تم سے؟'' احسان صاحب نے کہا۔

''ہاں، میں نے بہت پوچھا لیکن اس نے مجھے ٹال دیا اور کہا کہ ہوسکتا ہے یہ اس کا وہم ہو، بعد میں بھی اس نے کچھ نہیں بتایا لیکن..... وہ خوش نہیں تھا، ہاشم سے اور بھی بہت سی باتیں ہوتی رہیں تو اس نے جوش سے کہا کہ وہ اب دوسرے انداز میں سوچ رہا ہے، محسن کی موت دس ہزار روپے اور قیمتی گھڑی کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ اس کے پس پردہ کچھ اور ہی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ ہاشم بے حد چالاک ہے اس نے خاص انداز میں حیات خاں کے گھرانے تک رسائی حاصل کی اور یہ معلومات حاصل کیں۔ ان معلومات نے ہماری حوصلہ افزائی کی اور ہم نے مزید کام کرنے کا فیصلہ کیا، ہم اس جگہ کو دیکھنے آئے تھے جہاں محسن کی لاش ملی تھی، لاش کو خاص طور سے ایسی جگہ ڈالا گیا تھا جہاں لوگوں کی نگاہ اس پر پڑ جائے اور محسن کی موت منظر عام پر آجائے اس طرح قاتل جلد از جلد اس کی موت کی تشہیر چاہتے تھے، آپ سمجھ رہے ہیں نا، مقصد یہ تھا کہ سب کو پتا چل جائے کہ آسیہ بیوہ ہوچکی ہے۔''

احسان الٰہی کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا، وہ آنکھیں پھاڑے الیاس کو دیکھ رہے تھے اور ان کے بدن پر کپکپی طاری تھی، الیاس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''اور ایک آخری بات انکل، جس جگہ محسن کی لاش دستیاب ہوئی وہاں سے کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر ایک گڑھا ہے، لوگوں کا کہنا ہے کہ ادھر سے گزرنے والی پانی کی پائپ لائن میں زیر زمین پانی کے رساؤ سے اس گڑھے میں پانی جمع رہتا ہے اور کافی گندہ رہتا ہے، لاش اس گڑھے میں بھی ڈالی جاسکتی تھی، پتا بھی نہیں چلتا مگر خاص طور سے لاش اس جگہ ڈالی گئی جہاں سے وہ آسانی سے دیکھ لی جائے۔''

احسان صاحب نے خود کو سنبھالا اور دکھ بھرے لہجے میں بولے۔ ''تمہارا تجزیہ بالکل ٹھیک ہے بیٹے، اس کا مطلب ہے کہ میرے محسن کو بہت بڑی سازش کے ذریعہ قتل کیا گیا ہے، مگر ہم اس طاقت ور اسمگلر

کے خلاف کیا کر سکتے ہیں؟''

''کریں گے انکل، ضرور کریں گے، ہمارے محسن کو ناحق قتل کیا گیا ہے، ہم اس کے قاتلوں کو پھانسی دلوائے بغیر نہیں رہیں گے، میں اکیلا نہیں محسن کے دوستوں کا پورا گروہ قاتل کے خلاف کام کرے گا۔''

''میں اپنی بچی کے لیے خوف زدہ ہوں، ایسے لوگوں سے دشمنی کا انجام خطرناک ہی ہوتا ہے۔'' احسان صاحب نے کہا۔

''اللہ پر بھروسا کریں انکل، ہم اپنے محسن کا بدلہ ضرور لیں گے۔''

''آپ میرے لیے خوف زدہ نہ ہوں ابو، میں خود آگے بڑھ کر الیاس بھائی کے ساتھ کام کروں گی، ارے واہ، لوگوں نے میرے بھائی کو مار دیا اور میں خاموشی سے اس کے قاتلوں کو عیش کرتے دیکھتی رہوں۔'' شکیلہ نے جوش سے کہا۔

پروفیسر احسان الٰہی الیاس اور ہاشم کے ساتھ متلقہ تھانے کے ایس ایچ او سے ملے اور انہوں نے اپنے تمام خدشات سے آگاہ کیا، ایس ایچ او نے ان کے خدشات سنے اور پھر طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''آپ کو اچانک چھ مہینے بعد یہ خیال آیا کہ آپ کا بیٹا رہزنی کا نہیں بلکہ کسی سازش کا شکار ہوا ہے۔''

''جی بس ..... اتنی دیر میں ہی پتا چلا ہے۔'' احسان صاحب نے خجل لہجے میں کہا۔

''خیر آپ کے کہنے سے ہم انکوائری کرتے ہیں، لیکن آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی، اور پھر بات ایک بہت بڑے آدمی کی ہے جس پر اس خدشے کا اظہار خطرناک بھی ہو سکتا ہے، تاہم آپ چار دن کے بعد میرے پاس آئیے، انچارج کا انداز ٹال دینے والا تھا۔''

''تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا الیاس بیٹے۔'' احسان صاحب نے تھانے سے باہر آ کر کہا۔

''جی انکل۔'' الیاس نے کہا ان دونوں کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا، چار دن کے بعد وہ تھانہ انچارج سے ملے تو اس نے بڑی ہمدردی سے کہا۔

''میں نے تحقیق کر لی ہے آپ کے خدشات بے بنیاد ہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ لوگ صبر کریں۔''

''جی۔'' احسان صاحب نے کہا اور وہ لوگ باہر نکل گئے تھے۔

☆☆☆

سردیوں کی بارش بھی کیا خوب ہوتی ہے، شاہ میر، صفورا اور زمان شاہ کافی پی رہے تھے کہ اردلی نے کچھ افراد کے آنے کی اطلاع دی۔ ''تین آدمی ہیں سر، ایک بزرگ اور دو نوجوان۔''

''بلاؤ۔'' شاہ میر نے کہا اور مہمان اندر آ گئے، شاہ میر نے نرمی سے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا، تینوں کچھ نروس سے نظر آ رہے تھے۔

''چائے منگواؤں آپ کے لیے؟'' شاہ میر نے کہا۔

''نہیں انسپکٹر صاحب، بے حد شکریہ، آپ کی مصروفیت میں دخل انداز ہو کر ہمیں شرمندگی ہو رہی ہے۔'' بزرگ شخص نے کہا۔

''کوئی بات نہیں ہے، فرمائیے کیا خدمت کی جا سکتی ہے۔''

''فریادی ہیں، دکھ بھری کہانی لے کر آئے ہیں، آپ قانون کے رکھوالے ہیں، قانون شکنی جہاں بھی ہو آپ اس کے سامنے سینہ سپر ہوتے ہیں، ہاں کچھ حد بندیاں ہوتی ہیں، لیکن اگر کہیں دادرسی نہ ہو تو سائل تنکے کا سہارا پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔'' بزرگ نے کہا۔

''آپ کی جو مشکل ہے بے دھڑک بتائیے، ہم ضرور آپ کی خدمت کریں گے۔'' شاہ میر نے کہا۔

''سر ہمارا کیس جس علاقے کا ہے وہاں کے انچارج رئیس خاں صاحب ہیں، ہم ان سے ملے لیکن انہوں نے ہمارے لیے کچھ کرنے سے انکار کر دیا، آپ کے بارے میں کافی دن پہلے اخباروں میں پڑھا تھا کہ آپ ہر ایک کی فریاد سنتے

ہیں اور اس کی مدد کرتے ہیں، ہم ایک آس لے کر آپ کے پاس آگئے ہیں۔''

''آپ بتایئے تو سہی مسئلہ کیا ہے؟''

''میرا نام احسان الٰہی ہے، بچوں کو علم سکھانے میں زندگی بسر کی ہے لیکن.....''

احسان الٰہی اور الیاس وغیرہ نے پوری کہانی تفصیل سے شاہ میر کو سنائی، تینوں نے پوری توجہ سے ایک ایک بات سنی، آخر میں احسان الٰہی نے کہا ''میں میری بیوی اور بیٹی کو صبر نہیں آیا، ہم مجبوری سے سمجھوتا کررہے ہیں، لیکن آرزو ضرور ہے کہ محسن کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچتے دیکھیں۔ ان دونوں بچوں نے بیساکھیوں کی طرح سہارا دیا ہے، تو ہمت پڑی ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں ہم آپ کے بیٹے کے قاتلوں کو پھانسی کے پھندے تک پہنچائیں گے۔'' شاہ میر نے کہا پھر اس نے زمان شاہ سے کہا۔ ''رئیس خان کون سے علاقے میں لگا ہوا ہے؟''

''علی آباد، اے فور۔'' زمان شاہ بولا۔

''اس کیس کی فائل منگواؤ اور مجھے دو۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' زمان شاہ نے کہا۔

''اب آپ چائے پی ہی لیجیے، باہر بارش شروع ہوگئی ہے، اس دوران کچھ باتیں بھی ہوجائیں۔'' شاہ میر نے کہا۔ احسان صاحب نے شکر گزار نگاہوں سے شاہ میر کو دیکھا تھا۔ چائے کے دوران شاہ میر نے کہا۔ ''آپ نے بتایا تھا الیاس صاحب کہ مرحوم احسان نے آپ سے کہا تھا کہ کوئی ان کے اور ان کی بیوی کے درمیان حائل ہونا چاہتا ہے۔''

''جی دوبار محسن نے مجھ سے کہا تھا۔''

''جتنے عرصہ محسن اور اس کی بیوی آپ کے پاس رہے ان کے درمیان کیسے تعلقات تھے؟''

''بہت اچھے۔'' احسان صاحب نے بتایا۔

''اور مسز محسن کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا تھا؟''

''بس واجبی سا، اس نے کبھی ہم سے یا میری بیٹی سے یگانگت کا اظہار نہیں کیا، اور آخر کار میرے بیٹے کو لے کر دوسرے مکان میں چلی گئی۔''

''بعد میں ان دونوں کے آپس میں کیسے تعلقات رہے؟''

''بہت اچھے، دونوں خوش نظر آرہے تھے۔''

''ہوں..... اب وہ کہاں ہے؟''

''کون آسیہ؟''

''جی۔''

''وہ اپنے ماں باپ کے گھر رہ رہی ہے۔''

''وہ گھر جو آپ کے بیٹے نے خریدا تھا؟''

''وہ بک چکا ہے۔'' ہاشم نے بتایا اور شاہ میر مسکرانے لگا، پھر بولا۔

''آپ دونوں کو تو محکمہ پولیس میں ہونا چاہیے تھا بڑی اچھی جاسوسی کرلیتے ہیں آپ؟''

''یقین کریں انسپکٹر صاحب ہمیں محسن سے بہت محبت تھی۔'' الیاس نے آزردگی سے کہا۔

''مجھے اندازہ ہے، خیر آپ لوگ اطمینان رکھیں، آپ صحیح جگہ آگئے ہیں، ہمیں مجرموں سے سخت نفرت ہے، ایسے شخص یا لوگوں کو ہم کبھی نہیں چھوڑتے جو بڑے اعتماد سے جرم کرتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ انہیں کوئی نہیں پکڑ سکتا، لیکن پروفیسر احسان صاحب، کل دوپہر دو بجے آپ یہاں تھانے میرے پاس آجایئے، مجھے آپ سے آپ کے خاندان وغیرہ کے بارے میں پوری تفصیل درکار ہوگی، یہ میرا طریقہ کار ہے، آپ تنہا آیئے۔''

''بہتر..... میں دو بجے پہنچ جاؤں گا۔'' احسان صاحب نے کہا۔

ان تینوں کے جانے کے بعد شاہ میر نے صفورا کی طرف دیکھا تو صفورا مسکرادی۔

''زندگی کے بعض شعبے کتنے عجیب ہوتے ہیں سر، جیسے ہم، جیسے ڈاکٹر..... غم ناک واقعات میں الجھے ہوئے، ان بزرگ کے چہرے پر مجھے ایسی حسرت نظر آئی کہ دل کانپ گیا۔'' صفورا نے کہا، شاہ میر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شام کو چار بجے زمان شاہ نے علی آباد تھانے سے محسن الٰہی قتل کیس کی ساری تفصیلات نکلوالیں اور

شاہ میر کے پاس آ گیا۔ ''رئیس خان نے بڑی آئیں بائیں شائیں کیں سر جی، بڑے چکر دیئے کہ ریکارڈ روم کا بندہ نہیں ہے خوب ناک بھوں چڑھائی کہ شاہ جی ہر ایک کے پھڈے میں ٹانگ اڑائے دیتے ہیں، احسان الٰہی کو برا کہنے لگا کہ بڑے میاں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ خواہ مخواہ غلام پاشا سے پھڈا مول لے رہا ہے، خطرناک آدمی ہے کہیں نقصان نہ پہنچا دے۔ میں نے بھی دو چار سنا دیں۔''

''کیا کہا تم نے؟'' شاہ میر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''یہی کہ احسان الٰہی بے چارہ تو غلام پاشا سے پھڈا مول نہیں لے رہا، لیکن وہ ضرور شاہ میر سے پھڈا مول لے رہا ہے، چلتے ہوئے میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر احسان الٰہی یا الیاس اور ہاشم کو بال برابر بھی نقصان پہنچا تو شاہ جی اس کا ذمے دار تمہیں خیال کریں گے اور تم شاہ جی کو جانتے ہو، بڑا اچھلا یہ بات سن کر.....''

شاہ میر محسن کیس فائل کا جائزہ لینے لگا جس میں پولیس میں ایف آئی آر پوسٹ مارٹم رپورٹ اور دوسری تفصیلات، جائے وقوع کی تصویریں وغیرہ بھی لگی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد اس نے زمان شاہ سے کہا۔

''زمان شاہ تم باقاعدہ ان واقعات کی دوبارہ تفتیش کرو، خاص طور سے غلام پاشا کی منشیات کی اسمگلنگ کے سلسلے میں گرفتاری اور رہائی کی تفصیل مجھے درکار ہے، دیکھتے ہیں یہ سب کیا ہے؟''

''یس سر۔'' زمان شاہ نے ایڑیاں بجائیں۔

دوسرے دن مقررہ وقت پر احسان الٰہی شاہ میر کے پاس آ گیا، وہ تنہا ہی تھا۔ ''آپ جس نرمی اور محبت کے ساتھ مجھ سے پیش آئے ہیں اس کے لیے میں بے حد شکر گزار ہوں۔''

''جو لوگ حاجت مندوں اور خاص طور سے بزرگوں سے بہتر رویہ نہیں رکھتے بدنصیب ہوتے ہیں اور پھر آپ تو استاد ہیں جن کا احترام لازمی ہوتا ہے۔ میں نے آپ کو تنہا اس لیے بلایا ہے کہ آپ کے تمام خاندانی حالات معلوم کرنے تھے، جو کسی اور کے سامنے نہیں پوچھے جا سکتے تھے، کیا میں سوالات کر سکتا ہوں؟''

''ہاں ضرور.....'' احسان نے کہا اور شاہ میر نے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا، اس نے احسان کے بیوی بچوں، بیٹے کے سسرال والوں کے بارے میں ایک ایک تفصیل نوٹ کی اور ایک طویل نشست کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوا احسان صاحب نے کہا۔

''کیا محسن کے قاتلوں کے بارے میں آپ کو کوئی اندازہ ہوا ہے انسپکٹر صاحب..... ویسے معافی چاہتا ہوں آپ اس کا خیال ضرور رکھیے کہ غلام پاشا ایک دولت مند اور با اثر آدمی ہے اور..... اور میں ایک جوان بیٹی کا باپ ہوں۔''

''آپ بالکل اطمینان رکھیں، مجھے ایسے ہی با اثر درندوں کے شکار میں مزا آتا ہے، آپ کی ہر لحہ حفاظت کی جائے گی۔'' احسان کے باہر جانے کے بعد شاہ میر نے زمان شاہ کو احسان اور اس کے اہل خاندان کے بارے میں کچھ ہدایات دی تھیں۔ چار دن کے بعد ایک دن الیاس کے موبائل پر کال آئی۔

''مسٹر الیاس، میں ایس آئی زمان شاہ بول رہا ہوں شاہ میر صاحب کے تھانے سے، آپ نے مجھے پہچانا۔''

''جی سر پہچان لیا۔''

''شام چار بجے شاہ صاحب نے آپ کو اور پروفیسر صاحب کو تھانے بلایا ہے۔''

''ہم دونوں حاضر ہو جائیں گے، اگر اجازت ہو تو میں ہاشم کو بھی ساتھ لے آؤں۔'' ہاشم کو بھی ساتھ لانے کی اجازت مل گئی تھی۔

☆☆☆

''سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے ابو، لیکن.....''

''لیکن کیا؟'' پروفیسر احسان نے کہا۔

''پچاس ہزار روپے مانگ رہے ہیں، جب تک ہم پچاس ہزار روپے کا بندوبست نہیں کر لیتے

کچھ نہیں ہوسکتا، ایجنٹ نے صاف صاف کہہ دیا ہے۔'' محسن نے افسردگی سے کہا۔

''ارے لعنت بھیجو، بڑے چکر چلاتے ہیں یہ ریکروٹنگ ایجنٹ۔ میں تمہیں باہر نہیں جانے دوں گی۔'' سلیمہ بیگم نے کہا۔

''زندگی بن جائے گی امی، میرا سلیکشن بھی ہوگیا ہے، پانچ سال بھی باہر لگا لیے تو سمجھ لیں ساری عمر فراغت ہوجائے گی۔''

''بات صرف تمہاری ہے محسن، ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن تم نے کوشش کی ہے، ٹھیک ہے بندوبست کرتے ہیں۔'' پروفیسر صاحب نے کہا، پچاس ہزار اکٹھے ہوئے اور محسن دبئی روانہ ہوگیا۔ احسان صاحب قناعت پسند انسان تھے لیکن بیٹے نے گھر بھر دیا، محسن بڑی بڑی رقمیں بھیجنے لگا وہ بے حد ذہین تھا اس نے دبئی میں خوب کمائی کی کیونکہ اس کا تعلق انجینئرنگ کے شعبے سے تھا اس لیے اپنی فیلڈ کے لوگوں سے اس کا رابطہ تھا، ان میں کبیر احمد سے اس کا گہرا رابطہ ہوگیا تھا۔

کبیر احمد بھی اس کی فیلڈ کا بندہ تھا، غرضیکہ پانچ سال پورے کر کے محسن واپس آ گیا، الیاس، ہاشم اور دوسرے قریبی دوستوں نے اسے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا کبیر احمد سائے کی طرح محسن کے ساتھ لگا رہتا تھا، محسن نے دوستوں کی مدد سے ایک آٹو گیراج بنایا اور اس کا کام شاندار چل پڑا۔ کبیر احمد اس کا دست راست تھا، وہی گیراج چلا رہا تھا، محسن بس کام کی نگرانی کرتا تھا۔ اس کام کے دوران اس کی ملاقات حیات خان سے ہوئی جو اپنی کار ٹھیک کرانے آیا تھا۔ اچھے اخلاق کا آدمی تھا، آنے جانے لگا اس کا بیٹا ارشاد ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں ملازم تھا، اس نے کمپنی کا کافی کام محسن کو دلایا، کبیر احمد سے بھی حیات خاں کے خاندان کی گہری دوستی ہوگئی تھی اور اس کا ان کے گھروں میں آنا جانا ہوگیا تھا، اس طرح کبیر احمد کا ان دونوں خاندانوں سے گہرا رابطہ تھا، احسان صاحب نے محسن سے شادی کے بارے میں بات کی۔

''سلیمہ کو بہو کی بڑی خواہش ہے، میں بھی جلد تمہاری شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں کچھ اور وقت چاہتا ہوں ابو، ابھی میں اپنے کاروبار کو اور بڑھانا چاہتا ہوں۔''

''پھر بھی بیٹے، ہماری خواہش بھی پوری ہو جائے تو کیا حرج ہے۔''

پھر ایک دن حیات خاں نے اس چھوٹے سے خاندان کو اپنے گھر مدعو کیا جہاں ان لوگوں کی زبردست پذیرائی کی گئی، حیات خان کی بیوی شاہدہ نے بڑے پیار سے دونوں بہن بھائیوں کو خوش آمدید کہا، خاص طور سے حایت خاں کی بیٹی آسیہ نے پہلی ہی ملاقات میں محسن کا دل جیت لیا، اس نے اس اپنائیت کا سلوک کیا کہ محسن اس کا گرویدہ ہوگیا، پھر جب یہ لوگ واپس چلے تو آسیہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''پھر کب آئیں گے محسن صاحب؟''

محسن کوئی جواب نہیں دے سکا لیکن اس گھر میں دوبارہ جانے کے لیے اس نے ارشاد اور شمشاد سے روابط بڑھائے اور ان کے ذریعے وہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ جلد ہی اسے احساس ہوگیا کہ آسیہ اس سے پیار کرنے لگی ہے، وہ خود بھی آسیہ کی محبت میں شدت سے گرفتار ہوگیا تھا۔

دوسری طرف حیات خاں کے گھر کے دوسرے لوگوں نے بھی اسے اپنوں جیسا پیار دیا، اور پھر دونوں کی زبان کھل گئی، تب محسن نے سلیمہ بیگم سے دبی زبان میں کہا۔

''امی میں آپ کی خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں۔''

''کون سی خواہش؟''

''آپ میری شادی کر کے اپنے لیے بہو لے آئیں۔''

''ارے میرا لعل۔'' سلیمہ بیگم خاموش ہو گئیں۔ انہی دنوں ایک خاص واقعہ ہوگیا، محسن نے

گیراج کا پورا نظام کبیر احمد کو سونپ دیا۔ اچانک ایک اہم راز کھلا، کبیر احمد نے گیراج کے اکاؤنٹ سے پندرہ لاکھ روپے خرد برد کر دیئے، جن کا راز کھل گیا، محسن کو بہت افسوس ہوا۔

''تم نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا ہے کبیر احمد، مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔''

''کیا چاہتے ہو اب؟'' کبیر احمد نے ڈھٹائی سے کہا۔

''یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو، خود فیصلہ کرو۔'' محسن بھی بگڑ گیا۔

''سنبھالو اپنا یہ تاج محل، میرے لیے بہت کچھ موجود ہے۔'' کبیر احمد نے کہا اور چلا گیا۔ حالانکہ کبیر احمد نے حیات خاں کے گھر میں بھی نچلے گاڑھ رکھے تھے، لیکن جب ان لوگوں کو یہ سب پتا چلا تو انہوں نے بھی کبیر احمد کے اس عمل کی شدید مذمت کی تھی۔ حیات خاں نے کہا۔

''مشکوک آدمی کے ساتھ رعایت بیوقوفی ہوتی ہی، وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا، خدا کا شکر ہے آگے نجانے اس کے ہاتھوں کیا کیا نقصانات اٹھانے پڑتے۔''

''وہ یہاں آیا تھا؟''

''ہاں فریاد لے کر آیا تھا، لیکن یہاں اس کی پذیرائی نہیں ہوئی۔''

محسن کے کہنے سے آسیہ کے لیے رشتہ دیا گیا جسے خوشی سے منظور کر لیا گیا۔ آسیہ اپنی مثال آپ تھی، خوب صورت پر کشش شخصیت کی مالک، چنانچہ ان کی شادی ہو گئی، محسن کو ایک نئی دنیا مل گئی، ایسی خوب صورت دنیا جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ آسیہ نے فرمائش کی ایک خوب صورت سا گھر اس کے نام سے خریدا جائے، محسن نے اس سے وعدہ کر لیا اور خاموشی سے اپنے وعدے کی تکمیل بھی کر دی، یہ اس کا والدین سے پہلا انحراف تھا، اس نے بہت دن تک کسی کو اس گھر کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ ادھر سب سے پہلے شکیلہ کو بعد میں سلیمہ کو یہ احساس ہوا کہ آسیہ ان لوگوں کو اہمیت نہیں دیتی اس کا تمام تر جھکاؤ میکے والوں کی طرف ہے۔ اس کے میکے والے کسی بھی تقریب میں صرف بیٹی اور داماد کو بلاتے تھے، ارمان بھری شکیلہ کو بھی نہیں پوچھا جاتا تھا۔ خود محسن کو بھی ان باتوں کا خیال نہیں آیا تھا۔

''ارے کون سی اس کی عمر ہے، نئی نئی بیوی ہے، آخر کار ٹھیک ہو جائے گا، کوئی تنازعہ نہیں ہونا چاہیے، ہمارا ایک ہی بیٹا ہے۔'' پروفیسر صاحب بیوی کی شکایت پر اسے سمجھا دیتے تھے، لیکن ان کا خیال غلط نکلا، محسن نے ہی انکشاف کیا کہ آسیہ الگ رہنا چاہتی ہے۔ یہ اجازت نہیں اطلاع تھی، چنانچہ دوسری اطلاع یہ موصول ہوئی کہ عارضی طور پر آسیہ اور محسن کرائے کے ایک فلیٹ میں منتقل ہو رہے ہیں۔ جس کی ڈیکوریشن تک کر لی گئی ہے۔

سلیمہ بیگم، شکیلہ اور احسان صاحب نے ہنستے آنسوؤں سے بہو بیٹے کو رخصت کر دیا۔ ''ارے کون سا ملک سے باہر جا رہا ہے، آخر جب وہ دبئی گیا تھا تب بھی ہم نے برداشت کیا تھا۔'' احسان صاحب نے بیوی اور بیٹی کو سمجھا دیا۔

دوسری طرف آسیہ کے گھر والوں نے بیٹی داماد کی وہ خاطریں کیں کہ محسن کا سر ان کے سامنے جھک گیا، آسیہ کے دونوں بھائی ارشاد اور شمشاد اسے اپنا بہنوئی نہیں تیسرا بھائی سمجھتے تھے۔ ایک رنگا رنگ تقریب میں جو حیات خاں کے گھر ہوئی تھی اور جو آسیہ کی سالگرہ کی تقریب تھی محسن نے نئے گھر کے کاغذات آسیہ کو سالگرہ کے تحفے کے طور پر دیے تھے۔ یہ گھر آسیہ کے نام سے ہی خریدا گیا تھا، آسیہ اور اس کے گھر والے بہت خوش تھے، اتنا تابعدار داماد قسمت سے ملتا ہے۔ دوسری طرف وہ تھے جنہوں نے اسے لمحے لمحے جاگ کر پروان چڑھایا تھا، پھر آسیہ نے ایک اور فرمائش کر دی۔

''مجھے اپنا بینک بیلنس بتاؤ اور میرے ساتھ جوائنٹ اکاؤنٹ کھلواؤ۔''

''ارے یہ خیال کیوں آیا؟''

''بس جب ہماری ہر چیز مشترک ہے تو بینک اکاؤنٹ بھی مشترک ہونا چاہیے، اگر تمہیں اعتراض ہے تو۔''

''ارے ارے سرکار کے منہ سے نکلا ہر حکم سرکاری ہوتا ہے، مجال ہے سرتابی کی۔'' محسن نے کہا، یوں محسن نے اپنے اور آسیہ کے نام سے جوائنٹ اکاؤنٹ کھلوایا اور تمام رقم اس میں منتقل کروادی۔ یہ وہ تمام باتیں تھیں جو پروفیسر صاحب کے علم میں ہونا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ ہاں کسی اور نے سے پروفیسر احسان صاحب کو اس نئے گھر کی کہانی معلوم ہوئی تھی۔

''ارے اچھا..... یہ تو خوشی کی بات ہے؟'' پروفیسر صاحب نے کہا۔

''آپ کو نہیں معلوم تھا۔''

''نہیں بچوں میں خود اعتمادی ہونی چاہیے، محسن شادی شدہ ہے اور خود پر اعتماد کر کے سب کچھ کر رہا ہے، میں خوش ہوں کہ وہ ترقی کر رہا ہے۔''

اسی شخص نے جس نے احسان صاحب کو اس گھر کے بارے میں اطلاع دی تھی محسن سے بھی سوال کر ڈالا۔

''تم نے اپنے والدین کو بھی نئے گھر کی خریداری کے بارے میں نہیں بتایا۔''

''کیا تم نے بتادیا ہے؟'' محسن گھبرا کر بولا۔

''ہاں میں نے تو انہیں مبارک باد دی تھی، آخر تمہاری بنیاد تو وہی ہیں۔'' محسن گاہے بگاہے احسان صاحب کے پاس آتا جاتا رہتا تھا، اس نے کہا۔

''ابو تیاریاں کر لیجیے، ہم نئے گھر میں شفٹ ہونے والے ہیں، میں آپ کو سرپرائز دینا چاہتا تھا، وہ گھر کافی بڑا ہے، میں وہیں سے شکیلہ کی شادی کروں گا۔''

''ارے نہیں بیٹے، ہم اپنی اس نگری میں ہی خوش ہیں، یہ ہمارے ہر دور کا ساتھی ہے، ہماری اولاد ہے یہ، ہم اسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں، تم دونوں خوش رہو۔''

پہلی بار محسن کو ماں باپ کے چھوڑنے کا دکھ ہوا تھا، وہ جانتا تھا کہ آسیہ کبھی اس کے ماں باپ کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرے گی، وہ ان سے دور رہنا چاہتی ہے، وہ کافی پریشان ہو گیا تھا۔

وقت گزرتا رہا، محسن خود بھی نئے گھر میں شفٹ نہیں ہوا تھا، آسیہ نے بھی اس پر اصرار نہیں کیا تھا، وہ دونوں اکثر احسان صاحب کے پاس آتے جاتے تھے۔ آسیہ کم آتی تھی، اس دن بھی گھر میں پائے پکے تھے اور سلیمہ نے بیٹے کی پسند کا خیال رکھا تھا کہ اچانک وہ سب ہو گیا تھا۔

شاہ میر نے پروفیسر احسان الٰہی سے پوری تفصیل سنی تھی اور ضروری پوائنٹس نوٹ کیے تھے، احسان کے جانے کے بعد زمان شاہ، صفورا اور شاہ میر دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ انہوں نے کچھ منصوبے بنائے اور ایک عمل پر متفق ہو گئے۔ اسی کے تحت کام شروع کرتے ہوئے شاہ میر نے پہلا فون کسی نامعلوم شخص کو کیا۔

''نوٹ کرو..... غلام پاشا..... چوبیس ایکسل لائن..... آفس ڈین پلازہ..... تھرڈ فلور..... پورا فلور اس کے پاس ہے۔ پاشا کارپوریشن..... پوری احتیاط سے اس کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھو، جہاں جائے اس کا تعاقب کرو، خیال رہے کہ وہ ایک خطرناک اسمگلر ہے۔ خود بھی بے حد چالاک ہے، او کے.....''

دوسرا فون اس نے طارق مفتی کو کیا۔ ''میں ہمیشہ آپ کو مشکلات میں ڈالتا رہتا ہوں مفتی صاحب..... اس بار پھر ایک الجھا ہوا کیس آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔''

''میری خوش نصیبی ہے شاہ صاحب کے آپ جیسے قابل فخر پولیس آفیسر کی توجہ حاصل ہوئی ہے، یقین کریں اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہو گیا ہوں اور مجھے اس بات پر مبارک باد دی جاتی ہے کہ آپ اپنے کام مجھ سے لیتے ہیں جو معمولی نہیں ہوتے۔''

''موقع پاتے ہی مجھ سے مل لیجیے، آپ سے میٹنگ ضروری ہے۔''

''حاضر ہوتا ہوں۔''

☆☆☆

طارق مفتی کو ایک بہت بڑی شخصیت کا فون موصول ہوا، یہ بیرسٹر شہاب الدین تھے، بڑے نامور آدمی تھے، وکلاء برادری ان کی قابلیت اور صلاحیت کی معترف تھی، فوجداری مقدمات لیتے تھے اور کامیابی ان کے قدم چومتی تھی، طارق مفتی نے بڑے احترام سے ان سے بات کی۔

''کیا مصروفیت ہے مفتی صاحب؟''

''حکم فرمایئے۔''

''ملنا چاہتا ہوں۔''

''جیسے آپ پسند فرمائیں، مجھے حکم دیں۔''

''مجھے خود آپ کے پاس آنا ہے۔''

''تشریف لایئے .....'' طارق مفتی نے کہا پھر وہ اس وقت الجھا رہا جب تک شہاب الدین اس کے پاس نہ گئے، طارق نے پراحترام انداز میں ان کا استقبال کیا تھا، رسمی باتوں کے بعد شہاب الدین نے کہا۔

''میرے علم میں آیا ہے کہ آپ میرے ایک مستقل کلائنٹ کے خلاف ایک شخص محسن الٰہی کے قتل کے الزام میں استغاثہ دائر کرنے کی کاروائی کر رہے ہیں۔''

''جی بالکل درست اطلاع ہے۔''

''مجھے علاقے کے تھانہ انچارج رئیس خاں نے بتایا ہے کہ انسپکٹر شاہ میر کسی طرح اس معاملے میں دخل انداز ہو گئے ہیں، حالانکہ چھ سات ماہ پرانا کیس ہے اور پوری طرح داخل دفتر ہو گیا ہے، لیکن آپ کو خود علم ہے کہ شاہ میر صاحب گڑھے مردے اکھاڑنے کے شوقین ہیں۔''

''لیکن یہ آپ بھی جانتے ہیں کہ وہ صحیح لائنوں پر کام کرتے ہیں۔'' طارق مفتی نے کہا۔

''نہیں ایسی بات بھی نہیں ہے، کم از کم اس معاملے میں شاہ صاحب بڑی غلط فہمی کے شکار ہیں، طارق صاحب ہم لوگ ہم پیشہ ہیں۔ ایک دوسرے سے تعاون بھی کرتے ہیں، میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ محسن الٰہی کے قتل کے بارے میں غلام پاشا کے ذہن میں کوئی تصور بھی نہیں تھا، میں ذاتی طور پر اس کا گواہ ہوں۔''

''ایک عاجزانہ عرض کروں شہاب الدین صاحب، غلام پاشا صاحب کوئی نیک نام انسان نہیں ہیں۔''

''بے شک، بہت سارے جرائم کے سلسلے میں پاشا کا نام آتا ہے، لیکن اس نے محسن کو قتل نہیں کرایا، اور اس کا اس سارے قصے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''آپ اتنے وثوق سے یہ بات کیسے کہہ رہے ہیں میں اور آپ جانتے ہیں کہ اس طرح کے لوگ اپنی مرضی سے سب کچھ کر لیتے ہیں اب وہ اپنے قانونی مشیروں کو اپنے جرائم کی فہرست تو نہیں بتاتے پھرتے۔''

''بالکل ٹھیک، ایسا ہی ہے، لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ایک مفروضہ قائم کیا گیا ہے کہ غلام پاشا حیات خاں کی بیٹی کو پسند کرتا تھا۔ اس نے حیات خاں کو شادی کا پیغام بھی دیا اور وہ کسی حد تک تیار بھی ہو گیا، لیکن غلام پاشا جیل چلا گیا، حیات خان نے انتظار نہیں کیا اور آسیہ کی شادی محسن سے کر دی۔ غلام پاشا جیل سے رہا ہو گیا، اور اتفاق سے محسن ڈکیتی کا شکار ہو کر مر گیا، پھر پتا نہیں شاہ میر کو کیا سوجھی کہ وہ ایک سیدھے سادے کیس کو قتل کے کیس میں تبدیل کرنے پر تل گیا۔''

''کچھ عوامل ہیں بیرسٹر صاحب جن کی بناء پر یہ خیال ذہن میں آیا ہے۔'' طارق مفتی نے کہا۔

''میں ان عوامل کے بارے میں جانتا ہوں، آپ کے خیال اور مفروضے کے مطابق غلام پاشا نے محسن کو اس لیے قتل کر دیا کہ وہ اس کی بیوی آسیہ سے شادی کا خواہش مند تھا، یا اس کے علاوہ بھی کوئی اور وجہ ہو سکتی ہے۔''

''بظاہر اور کچھ نہیں۔'' طارق مفتی نے کہا۔

''دیکھیے، آپ بہت اچھے وکیل ہیں، نوجوان ہیں آپ کو اس فیلڈ میں پوری زندگی گزارنی ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ کا ہر قدم کامیابی کی طرف بڑھے، اس خدائی فوجدار کے چکر میں پڑ کر آپ اپنا مستقبل کھو بیٹھیں گے۔ میں شاہ میر کی بات کر رہا ہوں۔''

''جی۔'' طارق مفتی نے مختصراً کہا۔

''کیس دوسرے تھانے کا تھا اس نے اپنے پاس ٹرانسفر کرالیا ہے، جبکہ انسپکٹر رئیس خاں ایک شریف آدمی ہے، خیر یہ ان کا آپس کا معاملہ ہے، میں اور آپ دوسرا رشتہ رکھتے ہیں، میں آپ کو ایک ایسی راز کی بات بتانا چاہتا ہوں جو اصولاً مجھے بتانی نہیں چاہیے، کیونکہ یہ میرے موکل کے لیے ایک بہترین سیف پوائنٹ ہے۔''

طارق مفتی خاموشی سے بیرسٹر کی صورت دیکھتا رہا، کچھ لمحے وہ خاموش رہ کر سوچتے رہے پھر رازدارانہ انداز میں بولے۔

غلام پاشا جیل سے رہا ہو گیا۔ اس دوران اسے لازمی طور پر آسیہ کی شادی کا پتا چل گیا ہو گا لیکن اس نے کوئی ری ایکشن نہ دیا، وہ بے پناہ دولت مند انسان ہے، ایک سے ایک حسین اور تعلیم یافتہ لڑکی اسے مل سکتی ہے، اس کی جیل سے رہائی اور محسن الٰہی کی موت کے بعد خود آسیہ کے گھر والوں نے اس سے رابطہ کیا، میں آپ کو آنکھوں دیکھی تفصیل بتاتا ہوں۔ اس شام میں غلام پاشا کے کچھ ضروری کاغذات کے سلسلے میں اس کے گھر گیا۔ غلام پاشا میری بہت عزت کرتا ہے اس نے مجھے خوش آمدید کہا اور رسمی باتوں کے بعد ہم اپنے کام کا آغاز کرنے ہی والے تھے کہ ملازم نے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔

''کون ہے، کیا نام بتاتا ہے؟''

''حیات خان۔''

''ایں..... حیات خان۔'' غلام پاشا اس نام کو یاد کرنے لگا، پھر جیسے اسے یہ نام یاد آ گیا اور اس نے اسے اندر بلوا لیا، پھر بولا۔ ''ارے حیات خان صاحب کیسے ہیں آپ؟''

''آپ کو دعائیں ہیں پاشا، آپ کی رہائی کی مبارک باد دینے آ گیا۔''

''شکریہ جیل تو ہمارا دوسرا گھر ہے، آتے جاتے رہتے ہیں، آپ سنائیے سب ٹھیک ہے نا۔''

''جی ایک اہم بات کرنے آیا تھا آپ کے پاس..... غلطی ہو گئی، آپ سے وقت نہیں لیا۔''

''چلیں اب آ ہی گئے ہیں تو بتائیے کیا بات ہے۔''

''وہ تنہائی ہوتی تو اچھا تھا۔'' حیات خاں نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ تنہائی ہی سمجھ لیجیے، شہاب احمد سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہتی، یہ میرا آدھا وجود ہیں۔''

''ٹھیک ہے، شاید یہ بات آپ کے علم میں آ چکی ہے کہ میرے داماد یعنی آسیہ کے شوہر کو ڈاکوؤں نے لوٹ کر ہلاک کر دیا اور آسیہ بیوہ ہو چکی ہے۔''

''جی مجھے افسوس ہے۔''

''میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ کی بیگم کا بھی انتقال ہو چکا ہے، آپ نے آسیہ کے لیے رشتہ دیا تھا اور ہم اس کے لیے تیار تھے لیکن.....''

''جی آپ نے سوچا کہ مجھے پھانسی کی سزا ہو جائے گی، چنانچہ آپ نے جلدی سے آسیہ کا رشتہ دوسری جگہ کر دیا۔''

''بس جناب..... بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی جس کا زندگی بھر افسوس رہے گا۔''

''خیر میرے لیے کیا حکم ہے۔''

''بس آسیہ بہت کم عمر ہے، مجھے اس کی شادی کرنی ہے، اگر آپ مناسب سمجھیں تو۔''

''اس سے شادی کر لوں۔''

''جی میں یہی چاہتا ہوں۔'' حیات خاں نے کہا۔

''آپ کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے، آسیہ کیا چاہتی ہے یہ بتائیں۔''

''بالکل سچ بتا رہا ہوں وہ محسن کے ساتھ ایک دن خوش نہیں رہی، اپنے مقدر کو کوستی تھی کہ اتنی اچھی جگہ شادی ہو رہی تھی تقدیر کو منظور نہیں تھا۔''

''ہوں اگر یہ بات ہے تو ٹھیک ہے۔ جانے والے چلے جاتے ہیں، خیر مجھے اعتراض نہیں ہے، میں آپ کو بتاؤں گا کہ نکاح کی کیا تاریخ رکھی جائے، کچھ اہم کاموں میں مصروف ہوں، جلد ہی ان سے فارغ ہو کر آپ کو بتاؤں گا، ویسے ہمارے درمیان یہ رشتہ طے ہے۔''

''آپ یقین کریں مفتی صاحب، حیات خاں خوشی سے پاگل ہو رہا تھا میں سخت حیران تھا کہ یہ شخص کس طرح کا انسان ہے، اس کے ہاں عزت نفس کا کوئی تصور نہیں تھا، وہ ایک جرائم پیشہ اور اسمگلر کے سامنے گڑگڑا رہا تھا کہ اس کی بیٹی سے شادی کر لے، اس سے حیات خاں کی فطرت کا پتا چلتا ہے کہ وہ کس طرح کا انسان ہے، ایک اور اہم بات وہ یہ کہ جس دن محسن قتل ہوا اس سے کوئی آٹھ دن پہلے غلام پاشا کا بیٹا شدید بیمار ہو کر امریکا سے آیا تھا اور غلام پاشا اس کی بیماری میں مصروف تھا، میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ شاہ میر کو بھی صورت حال سے آگاہ کریں، اسے بتائیں کہ غلام پاشا بے شک ایک جرائم پیشہ شخص ہے، لیکن کسی چھوٹے کام کے لیے وہ قتل جیسا جرم نہیں کر سکتا، میں نے جو کچھ بتایا ہے شاہ میر اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔'' بہر حال اس کے بعد کچھ رسمی باتیں ہوئیں اور بیرسٹر شہاب رخصت ہو گئے، بیرسٹر شہاب کے جانے کے بعد طارق مفتی دیر تک گم صم بیٹھا رہا تھا، پھر اس نے گہری سانس لے کر اپنا موبائل فون اٹھا لیا۔

☆☆☆

کبیر احمد کہیں باہر سے آ کر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے کی بیل بجی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا، دروازے کے باہر ایک اجنبی شخص کھڑا تھا اس نے مسکرا کر بڑی شناسائی کے انداز میں سلام کیا تھا۔

''جی فرمایئے.....'' کبیر احمد نے کہا۔

''آپ نے مجھے نہیں پہچانا کبیر صاحب۔''

''جی مجھے یاد نہیں آ رہا۔''

''گیراج پر آتا تھا، میرے پاس بے بی آسٹن تھی جس کی بیماریاں آپ ہی ٹھیک کرتے تھے، محسن صاحب سے بھی میرے بڑے اچھے تعلقات تھے۔''

''جی بس یاد نہیں آ رہا کبیر احمد نے اس کے عقب میں دیکھا جہاں ایک نئی ہنڈا ایکس ایل آئی کھڑی تھی۔''

''آپ سے ایک ضروری کام تھا۔''

''جی فرمایئے۔''

''آیئے گاڑی میں بیٹھ کر بات کریں۔'' اس شخص نے کہا۔

''نہیں میں ڈرائنگ روم کھولتا ہوں۔'' کبیر احمد نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا، کوئی اچھی حیثیت کا بندہ تھا۔ پتا نہیں کیا کام ہے، وہ اس اجنبی کو ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ''جی فرمایئے۔'' اس نے کہا۔

''میرا نام ناصر حسین ہے، میں آپ سے ارشاد اور شمشاد کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں، حیات خاں کے بیٹے ارشاد اور شمشاد، آپ کے ان سے گہرے تعلقات ہیں، اصل میں حیات خاں نے میری بہن کے لیے اپنے بیٹے شمشاد کا رشتہ دیا ہے، میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، آپ براہ کرم میری مدد کریں۔''

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ میرے اس گھرانے سے گہرے تعلقات ہیں۔''

''اوہو، محسن صاحب سے میری گہری دوستی تھی، انہوں نے ہی بتایا تھا کہ اس گھرانے میں ان کا رشتہ ہو رہا ہے، انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ آپ کی اس گھرانے سے گہری دوستی ہے، لیکن بعد میں کوئی کاروباری گڑبڑ ہو گئی تھی، اس لیے آپ علیحدہ ہو گئے، آپ کو اس بات کا علم ہے اس گڑبڑ کرانے میں حیات خاں کا پورا ہاتھ تھا۔''

''کیا مطلب؟'' کبیر احمد نے چونک کر کہا۔

''مرحوم محسن صاحب اکثر فارغ اوقات میں میرے گھر آتے تھے، وہ اپنی ذاتی باتیں مجھ سے نہیں چھپاتے تھے ان دنوں آپ کی بہن رابعہ سے حیات خاں کے بیٹے ارشاد کی بات چل رہی تھی۔''

''اوہ، ہاں آپ کو تو بہت سی باتیں معلوم ہیں۔''

''افسوس آپ کو نہیں معلوم۔''

''کیا مطلب؟''

''شاید آپ کو علم نہیں کہ حیات خاں اس رشتے کو پسند نہیں کرتے تھے انہوں نے آپ کی بہن کے کردار پر بھی انگلی اٹھائی تھی، اور کہا تھا کہ رابعہ کسی شریف گھرانے میں آنے کے قابل نہیں ہے، بھائی نے دبئی کی کمائی کھلا کر پورے گھرانے کو خراب کر دیا ہے۔''

''یہ آپ کو محسن نے بتایا تھا؟''

''ہاں محسن مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتا تھا، ناصر حسین نے کہا۔ ''محسن نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ آپ کو گیراج سے نکالنے کا مشورہ بھی حیات خاں نے ہی دیا تھا بلکہ محسن کو انہوں نے ہی مجبور کیا تھا جبکہ محسن نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کے لیے ایک مشکل فیصلہ ہے، کبیر احمد سے اس کے دبئی سے تعلقات ہیں، بڑی مشکل سے اس نے آپ کو گیراج سے نکالنے کا فیصلہ کیا تھا۔''

کبیر احمد کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں، صاف لگ رہا تھا کہ وہ مشکل سے خود کو سنبھالے ہوئے ہے، ناصر حسین نے پھر کہا۔ ''محسن کے استفسار پر حیات خان نے کہا کہ انہیں کبیر احمد سے کچھ خطرات ہیں۔''

''خطرات۔'' کبیر احمد چونک کر بولا۔

''ہاں حیات خاں نے محسن کو بتایا کہ آپ ان کے گیراج پر قبضہ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں، چونکہ محسن ان کے داماد بننے والے ہیں اس لیے وہ انہیں اس خطرے سے آگاہ کر رہے ہیں۔''

''ہوں۔'' کبیر احمد کی کیفیت کا ناصر حسین کو اچھی طرح ہو رہا تھا۔ پھر اس نے شدید طیش کے عالم میں کہا۔

''خدا کی قسم پھانسی چڑھائے جانے کے قابل ہیں وہ لوگ، انتہائی بدکردار اور فراڈ ہیں، اب وہ اپنی بیٹی کی تیسری شادی کی کوششوں میں مصروف ہیں، بیٹی کو انہوں نے کاروبار بنا رکھا ہے۔''

''تیسری شادی؟'' ناصر حسین چونک پڑا۔

''جی ناصر صاحب، آسیہ کی پہلی شادی انہوں نے فیض الدین نامی ایک تاجر سے کی تھی، یہ شادی ایک سال تک رہی، فیض الدین کو انہوں نے جی بھر کر لوٹا، پھر جب ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں فیض الدین کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے اس کی ساری دولت پر قبضہ جما لیا، اس وقت یہ ایک اور شہر میں تھے، فیض الدین کی موت کے بعد یہ یہاں آ گئے، اپنی بیٹی وہ ہمیشہ غیر شادی شدہ بتاتے تھے، اس کے بعد انہوں نے محسن کو پھانس لیا اور آسیہ نے بڑے ہتھکنڈوں سے محسن پر قبضہ جما لیا اور ان کی شادی ہو گئی، یہ شادی انہوں نے آسیہ کو کنواری ظاہر کر کے ہی کی تھی، جبکہ وہ بیوہ تھی، لیکن بے چارہ محسن بھی ایک حادثے کا شکار ہو گیا اور تم دیکھ لینا اس کا گھر گیراج اور دوسرے اثاثے کس طرح ہضم ہو جائیں گے، انہوں نے ابھی تک صبر کیا ہے لیکن بہت جلد آسیہ کی شادی ایک کروڑ پتی سے ہونے والی ہے۔''

''خدا کی پناہ لوگ کس طرح اپنے مکروہ چہرے چھپا لیتے ہیں، میں تو دل سے آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری بہن کو بچا لیا۔'' ناصر حسین نے مشکور لہجے میں کہا۔

''مشکور تو میں بھی ہوں آپ کا..... حیات خاں مردود نے میری بیٹی کے بارے میں ایسا کہا، میں نے ویسے ہی اس مردود کے بیٹے سے رشتہ نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔'' کبیر احمد نے کہا۔

☆☆☆

شاہ میر، صفورا اور زمان شاہ سر جوڑے بیٹھے ہوئے تھے، صفورا مسکراتی نظروں سے شاہ میر کو دیکھ رہی تھی، پھر اس نے کہا۔

''ہمیشہ یہی ہوتا ہے، ہم لوگ بھرپور محنت کر کے کچھ کلیو تلاش کرتے ہیں اور آپ ایک ہی داؤ مار کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتے ہیں، وہ کون تھا جسے آپ نے ناصر حسین بنا کر بھیجا تھا۔''

''اسپیشل فورس کا نواب احمد۔'' شاہ میر نے جواب دیا۔

''اور اس نے کبیر احمد سے سارا کچا چٹھا معلوم کر لیا۔'' صفورا بولی۔

''سب سے زیادہ توجہ والی بات یہ ہے مس صفورا کہ شاہ جی نے ان معلومات کے لیے کتنے کار آمد مہرے کا انتخاب کیا جس کی طرف ہماری کوئی توجہ نہیں تھی۔'' زمان شاہ نے کہا۔

''اس طرح کے واقعات عام ہیں دولت کے لالچی لوگ زندگیاں لینے سے بھی باز نہیں آتے، تھوڑی سی گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔ حیات خاں، اس کے دونوں بیٹے ارشاد اور شمشاد..... معہ اس کی بیٹی آسیہ حیات بھی باقاعدہ جرائم پیشہ ہیں، حیات خاں کی بیٹی خوب صورت اور نوجوان ہے، وہ اسے ہر بار کنواری ظاہر کر کے کسی کھاتے پیتے گھرانے میں اس کی شادی کر دیتا ہے اور پھر..... کوئی حادثہ کر کے اس کے شوہر کی جائداد پر قبضہ کر لیتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ فیض الدین کو بھی قتل ہی کیا گیا ہو۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں، حیات خاں نے سارے کام مکمل کیے اور پھر محسن کو قتل کر دیا دس ہزار کی بات بھی اس نے اس کیس کو ڈکیتی کیس ظاہر کرنے کے لیے کی۔''

''شاہ صاحب نے زبردست داؤ مارا ہے، دوسری صورت میں کبیر احمد کسی طرح یہ پوری کہانی نہ سناتا۔'' زمان شاہ نے کہا اور شاہ میر سوچ میں ڈوب گیا، پھر اس نے کہا۔

''صفورا..... آپ اور زمان شاہ پہلے جایئے وہاں متعلقہ اداروں سے رابطہ کر کے فیض الدین تاجر کی موت کی پوری تفصیل حاصل کریں، ایک ایک پوائنٹ نوٹ کر کے لائیں کہ فیض الدین کی موت کس طرح واقع ہوئی اس کا حادثہ کیسے ہوا، یہ لوگ تو پروفیشنل قاتل ثابت ہو رہے ہیں ہم انہیں کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔''

''او کے سر.....''

شاہ میر نے ان لوگوں کی باقاعدہ تربیت کی تھی اور وہ مشکل سے مشکل کام آسانی سے کر لیتے تھے، چنانچہ صرف دو دن صرف ہوئے اور فیض الدین کی موت کی مکمل رپورٹ پیش کر دی گئی۔

ریکارڈ کے مطابق ٹریفک حادثے کی تفصیل یہ تھی کہ فیض الدین کی گاڑی کے بریک اچانک فیل ہو گئے تھے اور اس کی گاڑی بے قابو ہو کر سامنے والے ٹرک کے پچھلے حصے میں جا گھسی تھی جو فیض الدین کی گاڑی کے آگے تھا۔ ٹرک ڈرائیور کا کہنا تھا کہ ایک سائیکل سوار..... اچانک اس کے ٹرک کے سامنے آ گیا تھا جس کو بچانے کے لیے اس نے بریک لگائے تھے۔ پیچھے سے فیض الدین کی کار پوری تیز رفتاری سے آئی تھی، چنانچہ وہ نہ رک سکی اور ٹرک میں گھس کر چکنا چور ہو گئی، فیض الدین کی لاش ٹکڑوں کی شکل میں نکالی گئی تھی۔

''ہم نے خاص طور سے گاڑی کے تجزیے کی رپورٹ نکلوائی تھی اور جس کی تفصیل یوں ہے کہ گاڑی بالکل نئی تھی، ہر چیز پرفیکٹ تھی، اس لیے بریک فیل ہونے کی وجہ نامعلوم تھی، تاہم اور کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہو سکی جس سے اس حادثے کو کوئی اور رنگ دیا جا سکتا۔''

''میں نے فیض الدین کے اہل خاندان کو تلاش کیا اس کی ایک بیوہ بہن ہے اور کوئی نہیں۔''

''ٹھیک.....'' شاہ میر نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔ ''اس سے زیادہ کچھ اور کیا بھی نہیں جا سکتا تھا، ویسے اب ہمارا اگلا ٹارگٹ کون ہونا چاہیے۔'' شاہ میر نے سوالیہ نظروں سے شاہ زمان اور صفورا کو دیکھا تو صفورا پھٹ سے بول اٹھی۔

''آسیہ.....'' صفورا کے انداز پر شاہ میر بے

اختیار ہنس پڑا، پھر اس نے کہا۔
''بالکل ٹھیک سر۔'' زمان شاہ نے کہا۔
''میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے۔'' شاہ میر بولا۔

☆☆☆

رات کے کوئی بارہ بجے کا وقت ہوگا کہ اچانک حیات خاں کے سیل کی بیل بج اٹھی، حیات خان سو رہا تھا، لیکن اس کی بیوی ناہید جاگ رہی تھی، اس نے ایک نگاہ حیات خاں پر ڈالی اس کے جاگنے کے آثار نہ پا کر اس نے سیل اٹھالیا اور اسے آن کر کے بولی۔
''ہیلو۔''
''حیات خان کہاں ہے؟'' دوسری طرف سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔
''کون بول رہا ہے؟'' ناہید نے پوچھا۔
''حیات خاں کہاں ہے؟'' آواز نے پھر کہا۔
''سو رہے ہیں۔''
''جگادو۔'' آواز نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔
''آپ کون ہیں؟''
''سنا نہیں تم نے..... جگادو اسے۔ اس دوران حیات خاں بھی جاگ گیا، بیوی نے اسے فون کے بارے میں بتایا اور بولنے والے کے لہجے کے بارے میں بھی بتایا حیات خاں کے بدن میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ دو دن پہلے اسے ایک نکاح نامے تصدیق شدہ کاپی موصول ہوئی تھی جو فیض الدین اور آسیہ کے نکاح کی تھی اور وہ دنگ رہ گیا تھا۔ یہ بات تو اس نے کسی کو نہیں بتائی تھی، پھر یہ کون اور اس کا مطلب کیا۔ تاہم اس نے فون سنبھال لیا۔''
''حیات خاں بول رہے ہو۔'' اجنبی آواز میں کہا۔
''ہاں آپ کون ہیں؟''
''کالا چور..... ویسے تمہیں فیض الدین اور آسیہ کے نکاح نامے کی کاپی مل گئی ہوگی، اس کے علاوہ بھی میری زنبیل میں بہت کچھ ہے، مثلاً فیض الدین کی گاڑی کے بریکوں کا معاملہ..... اور بے چارے محسن کے وحشیانہ قتل اور اب..... ویسے یار تم اور تمہارے بیٹے بیٹی بڑے چالاک قاتل ہیں۔''
''تم کیا بکواس کر رہے ہو؟'' حیات خاں کے پورے بدن پر لرزش طاری ہوگئی تھی۔
''تمام ثبوت موجود ہیں ہمارے پاس، تصویری ثبوت، جن میں فیض الدین کی گاڑی کے بریک فیل کرنے والے کی تصویریں اسے عمل کرتے ہوئے یا محسن کی گردن دبانے والے کی تصویریں اس کی لاش کو جھاڑیوں میں پھینکنے والے کی تصویریں وغیرہ۔''
''کک کون ہو تم اور کیا بکواس کر رہے ہو؟''
''کل شام چھ بجے، پیپل گراؤنڈ میں آجاؤ باقی باتیں وہیں ہوں گی اور ہاں کوئی چالاکی کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ جو نقصان اٹھاؤ گے اس کے ذمے دار خود ہوگے۔''
فون بند ہوگیا لیکن حیات خان پر مسلسل کپکپی طاری تھی، اس کی کنپٹیوں میں خون کی گردش بہت تیز ہوگئی تھی، آخر کار دوسرے دن وہ پیپل گراؤنڈ پہنچ گیا، شہر سے کافی دور جگہ تھی، جہاں ایک بہت پرانا قبرستان تھا جس کے بیچوں بیچ پیپل کا ایک انتہائی پرانا درخت تھا، حیات خاں نے بلیک میلر کی بات کا خیال رکھا تھا اور کسی کو ساتھ نہیں لے گیا تھا، اس نے دور سے ہی وہ پرانی آسٹن دیکھ لی تھی، قرب و جوار میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی، دور دور تک کسی انسان کا وجود نہیں تھا، دفعتہً آسٹن کے پاس ایک ٹارچ روشن ہوئی اور اس سے حیات خاں کو اشارہ دیا گیا، حیات خاں اس طرف بڑھ گیا، اس نے ایک سیاہ پوش وجود کو دیکھا جو تاریکی میں بے حد پراسرار نظر آرہا تھا۔
''آگئے حیات خاں۔''
''ہاں اور میں تم سے خوف زدہ نہیں ہوں کیونکہ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔''
''جھوٹ بول رہے ہو حیات خاں تم باقاعدہ جرائم پیشہ ہو، فیض الدین اور محسن کے قاتل۔''
''بکواس کر رہے ہو تم، ہم نے کسی کو قتل نہیں کیا۔''
''سودا کر لو حیات خاں، لاکھوں روپے کمائے

ہیں تم نے، فیض الدین کی کار کا حادثہ تمہارے ایماء پر ہوا۔ محسن کو تمہارے بیٹوں نے قتل کیا، تمہیں اجتماعی پھانسی پر چڑھنا ہوگا۔ یہ آخری موقع ہے تمہارے لیے زندہ رہنے کا صرف پچیس لاکھ روپے صرف پچیس لاکھ، تمہارے جرائم کے سارے ثبوت تمہیں واپس کر دیے جائیں۔ ورنہ کل دو بجے تمہیں تمام ثبوتوں کے ساتھ پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔''

''لل ..... لیکن، لیکن۔'' حیات خاں ہکلا کر بولا۔

''تمہاری مرضی میں چلتا ہوں۔''

''مگر پچیس لاکھ ..... اتنے پیسے میں نہیں کر سکتا۔''

''کر سکتے ہو، تمہاری ذاتی بینک بیلنس ہی سوا کروڑ روپے ہے اور پھر تم نے اس گھر کی رقم بھی ہضم کر لی ہے جو محسن نے آسیہ کو دیا تھا، تاریکی میں کھڑے بلیک میلر نے حیات خاں کو ایسے ایسے حوالے دیے کہ اس کے حوصلے پست ہو گئے آخر میں پندرہ لاکھ میں سودا طے ہو گیا۔

☆☆☆

سب کے چہرے اترے ہوئے تھے، حیات خاں نے اپنے بیٹوں اور بیٹی کو اس افتاد کے بارے میں بتا دیا تھا اور صاف کہہ دیا تھا کہ بلیک میلر کو پندرہ لاکھ ادا کیے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔

رات بھر سب جاگتے رہے تھے، کسی کو نیند نہیں آ رہی تھی، دوسری صبح بھی بے حد بوجھل تھی، ارشاد اور شمشاد مسلسل کہتے رہے تھے کہ ان سے کوئی ایسی غلطی نہیں ہوئی اس پورے کیس میں جس کی بناء پر وہ پھنس جائیں۔ مگر حیات خاں نے غصے سے کہا تھا کہ بلیک میلر ایک ایک بات سے واقف ہے۔

اس وقت دن کے نو بجے تھے، جب پولیس نے حیات خان کے گھر پر ریڈ کیا تھا، زمان شاہ کے ساتھ متعلقہ تھانے کا انچارج بھی تھا، حیات خان اور اس کے اہل خاندان ہکا بکا رہ گئے تھے۔

تھانے میں ان لوگوں کے استقبال کی تیاریاں مکمل تھیں، شاہ میر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم نے یقیناً پندرہ لاکھ کا انتظام کر لیا ہوگا حیات خاں، لیکن زندگیاں اتنی سستی فروخت نہیں ہوتیں، اور ویسے بھی تم غلط سمت چل پڑے تھے، تم نے بے چارے فیض الدین اور محسن الٰہی کو تو آسانی سے ہلاک کر دیا لیکن تمہارا تیسرا شکار اتنا نرم نہیں تھا وہ تمہیں ٹھیک کر دیتا، اس بے چارے کو تو موقع ہی نہیں ملا اور تم۔'' شاہ میر نے آسیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''سب سے بڑی مجرم تم ہو آسیہ، مشرقی روایات کی قاتل ..... مشرقی عورت تو شوہر کے لیے ستی ہو جاتی تھی لیکن تم، کتنی شادیاں کرو گی ان بے غیرت باپ اور بھائیوں کے لیے تم تو عورت ہو۔''

پوری تفصیل سامنے آ چکی تھی، فیض الدین کی گاڑی کے بریک خود ارشاد نے خراب کیے تھے اور ٹرک بھی وہ خود چلا رہا تھا، لیکن ٹرک ڈرائیور کے طور پر جس شخص کو پیش کیا گیا تھا وہ کرائے کا آدمی تھا جسے بھاری معاوضہ دیا گیا تھا۔ اس طرح انہوں نے فیض الدین کو راستے سے ہٹا کر اس کے سارے اثاثے قبضے میں کیے اور وہ شہر چھوڑ دیا، ان کا دوسرا شکار اصل میں غلام پاشا تھا، لیکن وہ اسمگلنگ کیس میں پھنس گیا اور اس طرح بچت ہو گئی اور اس کی جگہ محسن الٰہی پھنس گیا۔

محسن کو بھی ارشاد اور شمشاد نے اس لیے قتل کیا تھا، اسے گردن دبا کر ہلاک کر دیا گیا اور بعد میں اس کی لاش وہاں جھاڑیوں میں ڈال دی گئی۔

اس گھرانے کے خلاف تفصیلی رپورٹ پیش کر دی گئی، اور ان دہرے قتل اور جعلسازی کا مقدمہ قائم کیا گیا، لیکن چند روز کے بعد اطلاع ملی کہ آسیہ نے خودکشی کر لی، آخر کار وہ ایک مشرقی عورت تھی جو ابھی اس قدر بے ضمیر نہیں ہوئی ہے۔

☆☆

کالے چور

ایم اے راحت

ایک حسینہ کا قصہ جو اپنے گروپ کے ساتھ تفریح کی غرض سے اس پہاڑی مقام پر آئی تھی۔ ایک حادثے میں ان کی گروپ لیڈر اپنی جان سے ہاتھ دھوبیٹھی تھی۔ اس نے ایک رات اپنی ایک ساتھی کی جان بچائی تو اس پر انکشاف ہوا کہ وہ خفیہ محکمے سے تعلق رکھتی ہے اور ایک راز اپنے ہیڈ کوارٹر تک پہنچانے کے لیے اس کی مدد کی طالب ہے۔

ایک ایسے راز کی داستان جس کے لیے بہت سے لوگوں نے اپنی جان کی بازی لگا رکھی تھی مگر یہ معلوم نہ ہوپارہا تھا کہ کون محب وطن ہے اور کون غدار.....!

یک ایسی ہولناک سازش جو ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کردیتی۔ جب وطن سے سرشار چند جیالوں کی کہانی۔

نوشین کی آنکھ اچانک کھل گئی تھی۔ دریچے سے آنے والی چاندنی میں کمرے کی ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ سامنے پہاڑ کی بلند چوٹیوں اور ڈھلوانوں پر برف کی سفید چادر بچھی ہوئی تھی جس پر پڑنے والی چاند کی کرنیں چکاچوند پیدا کررہی تھیں۔

نوشین نے دبیز کمبل اور بھی زیادہ زور سے جسم پر لپیٹ لیا۔ شدید سردی میں ہر چیز جمی ہوئی سی محسوس ہورہی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ اچانک اس کی آنکھوں کیوں کھل گئی؟ برابر کے کمرے سے کھڑکھڑ کی آواز پر وہ ایک لمحہ کے لیے چونکی لیکن فوراً ہی اسے خیال آیا کہ لکڑی کے بنے ہوئے ہوٹل میں چوہوں کی موجودگی کچھ حیرت انگیز نہیں اور پھر اس کا دل انجانے خوف سے دھڑک اٹھا۔

برابر والے کمرے میں اب کوئی نہیں تھا۔ سوائے میڈم مارٹینا کی لاش کے۔ بے چاری میڈم مارٹینا۔ وہ کتنی خوش اخلاق تھیں۔ نوشین کو اس نے پورے سفر میں بیٹیوں کی طرح پیار سے ہر کام میں مدد دی تھی۔ اور کسے معلوم تھا کہ وہ صحت مند بیوہ یوں اچانک حادثے کا شکار ہوجائے گی۔

اسکیٹنگ کلب آف انڈیا کی جانب سے کل تیس افراد پر مشتمل یہ ٹیم برف پر اسکیٹنگ کے لیے چند روز قبل ہی گلمرگ پہنچی تھی۔ میڈم مارٹینا سب سے عمر رسیدہ ہونے کی حیثیت سے لڑکیوں کی نگراں تھیں۔ حالانکہ تمام لڑکیاں جن میں بیشتر انگیز اور عیسائی تھیں، آزاد خیال تھیں اور چند کے سوا سب شادی شدہ تھیں اور اپنے صاحب لوگوں کے ساتھ کشمیر آئی تھیں کیونکہ ان کے خیال کے مطابق ہندوستان میں ان کے قیام کا یہ آخری سال تھا اور برطانیہ جانے سے پہلے کشمیر کی برف پوش پہاڑیوں پر اسکیٹنگ کا آخری موقع تھا۔ اچھی بھلی تفریح میں میڈم مارٹینا کی موت نے اداسی پیدا کردی تھی۔ میڈم مارٹینا کی لاش بلبورن کی گھاٹی میں صبح ایک مزدور کو ملی تھی۔ وہ خاصی ماہر اسکیٹر تھیں

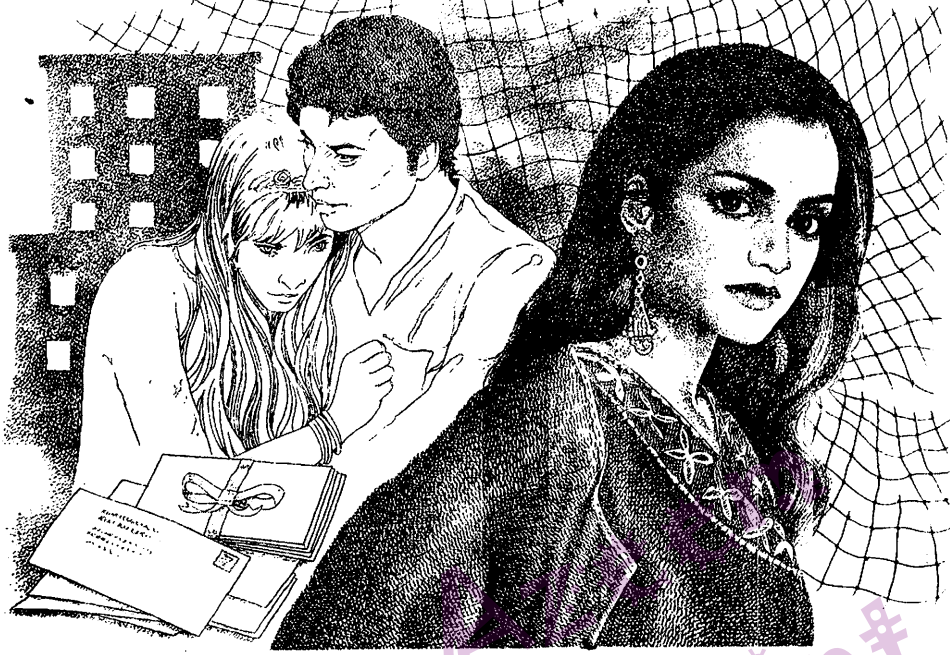

اور اس طرح حادثے کا شکار ہونے پر سب ہی کو تعجب اور افسوس ہوا تھا۔ اس وقت ہنستی ہنساتی میڈم مارٹینا برابر والے کمرے میں ابدی نیند سو رہی تھیں۔

کشمیریوں ہوٹل گلمرگ کی تمام دوسری عمارتوں کی طرح لکڑیوں کا بنا ہوا تھا۔ ہر کمرے سے متصل باتھ روم کا ایک دروازہ بالکونی میں کھلتا تھا۔ جو عمارت کے چاروں سمیت ایک گیلری کی طرح بنی ہوئی تھی۔ ہوٹل کا بھنگی اسی راستے سے آ کر صفائی کرتا تھا۔ اس لیے نوشین نے بالکونی میں کھلنے والا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ شاید اسی لیے اس کا کمرہ سرد ہو رہا تھا۔ لیکن اس وقت اٹھ کر دروازہ بند کرنے کی ہمت اسے نہیں ہو رہی تھی۔

کھڑ کھڑ کی آواز پھر سنائی دی۔ ہوٹل میں مکمل سناٹا طاری تھا اور معمولی سی آہٹ بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ کمروں کی پارٹیشن وال بھی لکڑی کی تھی لیکن نوشین نے غور کیا تو آواز میڈم مارٹینا کے کمرے سے نہیں۔ بالکونی سے آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور غور سے سننے لگی۔

آواز اب بالکل واضح تھی۔ جیسے کوئی آری سے کچھ کاٹ رہا ہو۔ خوف کی ایک سرد لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ شاید کوئی چور ہے جسے خبر نہیں کہ برابر کے کمرے میں لاش کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس کے دائیں جانب والے کمرے میں آرمی میڈیکل کارپس کے میجر ہوٹ مقیم تھے اور میڈم مارٹینا کے بعد والے کمرے میں ہلیر اتھیں۔

نوشین بزدل نہیں تھی۔ بچپن سے اس نے فوجی ماحول میں زندگی بسر کی تھی۔ ماں بچپن میں ہی مر گئی تھی۔ اس کی نانی نے اسے پالا تھا لیکن اصل پرورش اس کے باپ میجر غیاث الدین نے کی تھی۔ جن کا سایہ اس سے جنگ عظیم نے چھین لیا تھا۔ وہ برما کے علاقے میں لڑتے ہوئے ایک جاپانی کی گولی کا شکار ہو گئے تھے اور اس کے بعد سے وہ بالکل تنہا تھی۔ اسی لیے اس کو گلمرگ اس کی ٹیم کے ساتھ آنے کی اجازت دے دی گئی تھی تاکہ اس کا دل بہل جائے ویسے بھی ٹیم میں بیشتر فوجی افسران کے خاندان والے تھے۔ جو میجر غیاث الدین کے واقف کار تھے اور ان کی وجہ

سے نوشین کی بڑی عزت کرتے تھے۔

نوشین اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے برابر سے اپنی اونی شال اٹھا کر اوڑھی اور پھر آہستہ روی کے ساتھ باتھ روم میں داخل ہوئی۔ سوئچ پر ہاتھ رکھ کر اس نے ہٹا لیا۔ روشنی جلانے سے وہ جو کوئی بھی تھا۔ ہوشیار ہو جائے گا۔ بالکونی والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ دبے قدموں آگے بڑھی اور آہستہ سے باہر جھانکا۔ اس کا شبہ غلط نہیں تھا۔

لیکن وہ میڈم مارٹینا کا کمرہ نہیں ہے۔ چاندنی میں ہلیرا کے کمرے کے سامنے کھڑا ہوا شخص صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ بہت احتیاط کے ساتھ اس کے کمرے کی کھڑکی میں لگے ہوئے آہنی کنڈے کو ریتی سے کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ نوشین نے سوچا کوئی مقامی چور ہے لیکن اسی لمحے رک کر اس شخص نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جیسے ہی وہ مڑا۔ نوشین کانپ اٹھی کیونکہ اس شخص کا چہرہ ندارد تھا۔ لیکن غور سے دیکھنے پر نوشین نے اندازہ کیا کہ اس نے اپنے چہرے پر کوئی بھیانک نقاب چڑھا رکھی تھی جس پر بنے ہوئے دائرے نما سوراخوں سے اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ اس جیب سے ہاتھ باہر نکالا تو ریوالور کی نال چمک اٹھی۔ وہ اگر چور تھا تو خطرناک ارادے سے آیا تھا۔

نوشین نے سوچا کہ چیخ کر سب کو بیدار کر دے لیکن اس طرح تو وہ بہ آسانی بھاگ جائے گا۔ نہ جانے اسے کیوں یہ محسوس ہوا کہ مس ہلیرا خطرے میں ہے۔ وہ دبے قدموں کمرے سے واپس آ گئی۔ آہٹ کے خوف سے اس نے بالکونی والا دروازہ بھی بند نہیں کیا۔ اور بڑی آہستگی سے اپنا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ راہداری مین بچھی ہوئی کارپٹ پر اس کے ننگے بے آواز قدم ہلیرا کے کمرے کے دروازے پر جا کر رک گئے۔

اس نے بہت آہستہ سے دستک دی لیکن ہلیرا شاید بے خبر سو رہی تھی۔ دو تین مرتبہ دستک دینے کے بعد اس نے آہستہ سے آواز دی۔

''مس ہلیرا۔'' ذرا دیر بعد کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

''کون ہے؟'' ہلیرا نے بھی بہت آہستہ سے سرگوشی کی۔

''دروازہ کھولو۔ میں نوشین ہوں۔ جلدی کرو جلدی۔''

ہلیرا نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ کمرہ بالکل تاریک تھا۔ شاید ہلیرا نے تمام کھڑکیوں کے پردے گرا رکھے تھے۔ نوشین جلدی سے کمرے میں داخل ہوئی۔

''کیا بات ہے؟'' ہلیرا نے آہستہ سے پوچھا۔

''کوئی تمہارے کمرے میں بالکونی کی طرف سے داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔'' نوشین نے کہا۔

''میں نے اسے کھڑکی کے آہنی کنڈے کو کاٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ ہلیرا! وہ بہت خطرناک ہے۔''

کمرے کا دروازہ بند کر کے ہلیرا پلٹی۔ تاریکی میں نوشین کو وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

''خبردار خاموش کھڑی رہو۔'' اچانک ہلیرا نے کہا اور دوسرے ہی لمحہ پستول کی ٹھنڈی نال نوشین کی کنپٹی پر جا لگی۔ نوشین کو ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔

''خدا کے لیے یہ کھیل ختم کر دو۔'' اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ''جلدی سے باہر نکلو تم خطرے میں ہو۔''

''تم کو کیسے معلوم؟'' مس ہلیرا نے چونک کر پوچھا۔ اس کی آواز مین خوف نمایاں تھا۔

''اوہ...... ہلیرا وہ کوئی چور نہیں معلوم دیتا۔''

''پھر کون ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم کیونکہ اس نے چہرے پر ایک بھیانک نقاب پہن رکھی ہے اور پستول سے مسلح ہے۔'' نوشین کو اب غصہ آ رہا تھا۔

''تم بلاوجہ وقت ضائع کر رہی ہو۔ ایک تو تم کو خبردار کرنے آئی اوپر سے تم مجھ پر پستول تانے کھڑی ہو۔'' مس ہلیرا نے پستول ہٹا لیا۔

Waqar Azeem Pakistanipoint

''مجھے افسوس ہے نوشین۔ لیکن تم نے مجھے خوف زدہ کردیا، امید ہے معاف کردو گی بات یہ ہے کہ مجھے پہاڑی علاقے میں ہمیشہ ڈر لگتا ہے۔ اس لیے پستول ساتھ رکھتی ہوں یہاں چوری بہت ہوتی ہے۔''

''تم خواہ مخواہ جھوٹ بول رہی ہو۔'' نوشین نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ''یہاں چور پستول لے کر نہیں آتے اور تم نے چور سمجھ کر مجھ پر پستول نہیں تانا تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ یقیناً تم کو کسی سے خطرہ ہے۔''

''نوشین نے کہا۔'' ورنہ اس طرح کانپ نہیں رہی ہوتیں۔''

مس ہلیرا نے لائٹ اچانک جلائی تھی۔ روشنی ہوتے ہی اس نے باتھ روم کا دروازہ کھولا اور بالکونی کی طرف جھانکا۔ جو کوئی بھی تھا فرار ہو چکا تھا۔ لیکن کھڑکی کا کٹا ہوا کنڈا نوشین کی بات کی تصدیق کررہا تھا۔ مس ہلیرا نے وہ دروازہ بند کیا اور اندر آکر یہ اطمینان کرلیا کہ کھڑکی اندر سے بند تھا۔ نوشین نے اتنی دیر میں آگ دان میں دو موٹی لکڑیاں ڈال دی تھیں۔ جن کے شعلوں سے سردی کم ہوگئی تھی۔

''مجھے افسوس ہے کہ چائے کا سامان نہیں ہے۔ ورنہ تمہارے لیے.....''

''گرمی کی ضرورت مجھ سے زیادہ تم کو ہے۔'' نوشین نے کہا۔ ''ادھر آگ کے پاس بیٹھ جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ چکر کیا ہے۔''

''تم میجر غیاث الدین کی لڑکی ہو۔'' مس ہلیرا نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں لیکن کیوں؟'' مس ہلیرا کا چہرہ زرد ہورہا تھا۔ وہ بے حد خوف زدہ تھی ''تم نے کیسے اندازہ کیا کہ میں خطرے میں ہوں۔''

''کوئی چور اس طرح نقاب پہن کر یہاں چوری کرنے نہیں آسکتا۔ کم از کم عام چور اور نہ اس کو پستول سے مسلح ہونے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اگر تم کو غیر معمولی خطرے کا خدشہ نہ ہوتا تم مجھ پر شک نہ کرتیں۔ نہ پستول تان کر کھڑی ہوتیں۔ یقیناً کوئی غیر معمولی بات ہے۔''

مس ہلیرا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''میڈم مارٹینا مرچکی تھی۔ اور دل چاہتا ہے کہ میں تم پر اعتماد کرلوں۔''

''اس کا میڈم مارٹینا سے کیا تعلق؟''

''تمہارا خیال صحیح ہے نوشین وہ کوئی عام چور نہیں تھا اور نہ میڈم مارٹینا کی موت قدرتی یا اتفاقی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''میڈم مارٹینا کو قتل کیا گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' نوشین نے چونک کر پوچھا۔

''میں تم کو راز دار نہ بناتی۔ لیکن پتا نہیں مجھے بھی کب ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ تم پر اعتماد کرلوں۔'' مس ہلیرا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اگر ایسا ہوگیا تو کم از کم تم یہ کام کرسکو گی۔ کیونکہ ان کو تم پر شک نہیں ہوسکتا۔''

''نجانے تم کیا کہہ رہی ہو۔'' نوشین نے کہا۔ ''آخر بات کیا ہے۔ تم کو کیسے معلوم کہ میڈم مارٹینا کو قتل کیا گیا ہے۔''

''تم نے ملٹری انٹیلی جنس کا نام تو سنا ہے۔'' مس ہلیرا نے کہا۔ ''میرا اور میڈم مارٹینا کا تعلق اسی محکمہ سے ہے۔ لیکن یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی کہ میڈم مارٹینا کا مجھ سے کوئی تعلق ہے۔ نجانے کیسے ان کو خبر ہوگئی تم یوں سمجھ لو کہ ہم یہاں ایک مشن پر آئے ہیں۔ اس گینگ پارٹی میں ہماری شمولیت کا مقصد یہی ہے کہ کسی کو ہم پر شبہ نہ ہوسکے پھر کسی طرح ان کو یہ راز معلوم ہوگیا۔ میڈم مارٹینا کو وہ آسانی سے ٹھکانے لگانے میں اسی لیے کامیاب ہوگئے کہ ان کو یقین تھا کہ ہماری آمد کا مقصد کسی کو نہیں معلوم اور اب وہ مجھے ختم کرکے دم لیں گے۔''

نوشین حیرانی کے ساتھ اس نرم و نازک اور

چھریرے بدن والی خوب صورت ہلیرا کو گھور رہی تھی۔ واقعی کون اس پر یا میڈم مارٹینا جیسی بظاہر بے ضرر بیوہ پر شبہ کرسکتا ہے۔''

تم مجھ پر مکمل اعتماد کرسکتی ہو۔ ہلیرا۔'' نوشین نے جذباتی انداز میں کہا۔

''میں اور میڈم مارٹینا اس تنظیم کے بہت معمولی پرزے ہیں۔ اور تم یہ سمجھ لو کہ تنظیم کا کوئی ممبر ایک دوسرے سے واقف نہیں ہوتا تاوقتیکہ اس کو کسی سے رابطہ قائم کرنے کا حکم نہ دیا جائے۔ ہم کو ایک راز حاصل کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ مجھے اس خوب صورت وادی میں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا تھا کہ مارٹینا میری ساتھی ہیں اور مجھے ان کی ہدایات پر عمل کرنا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ یہاں آنے کے تیسرے ہی دن ہم نے وہ اہم راز معلوم کرلیا لیکن ہماری معلومات نامکمل ہیں اور اور یہ راز کتنا اہم اور کتنا بھیانک ہے اس کا ہمیں بالکل اندازہ نہیں تھا۔ میڈم مارٹینا جیسی عورت بھی اس کی حقیقت جان کر کانپ اٹھی تھی۔ اس نے فوراً ہیڈ کوارٹر کو پیغام بھیج دیا تھا اور انتظار کررہی تھی کہ اچانک پرسوں ہمیں اس راز کی آخری کڑی بھی مل گئی۔''

''تب پھر تم دونوں یہاں سے روانہ کیوں نہ ہوگئیں؟'' نوشین نے پوچھا۔

''اوہ..... نہیں ہم کو انتظار کرنا تھا۔ ہم یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے کیونکہ ہماری اچانک روانگی لوگوں کو مشکوک کردیتی۔ اس کے علاوہ ہم نے ارجنٹ پیغام روانہ کیا تھا۔''

''تمہارے خیال میں یہ پیغام کسی کے ہاتھ لگ گیا ہے؟''

''نہیں یہ اس قسم کا پیغام نہیں تھا جس پر کوئی شک کرسکتا۔'' مس ہلیرا نے کہا۔

''پیغام موصول کرنے والے نے ہمیں جواب بھی دے دیا تھا کہ وہ فوراً یہاں پہنچ رہا ہے اور ہمیں اس کا انتظار کرنا ہے اور اپنی اہم دریافت کا راز اس کو زبانی بتلانا ہے۔ لیکن وہ اب تک نہیں آیا ہے اور اور اور خدایا میں کتنی خوف زدہ ہوں۔''

''سنو ہلیرا۔'' نوشین نے کہا۔ ''جب تم نے اتنی راز داری برتی ہے تو ممکن ہے، تمہارا خیال غلط ہو اور مسز مارٹینا کی موت واقعی ایک اتفاقی حادثہ ہو۔''

''نہیں نوشین کسی کو ضرور شبہ ہوگیا ہے۔ سنو میڈم مارٹینا بہت محتاط عورت تھی۔ وہ ہر وقت میری طرح مسلح رہتی تھی۔ لیکن جب میں نے اس کی لاش کی تلاشی لی۔ تو پستول غائب تھا۔''

''ممکن ہے لاش لانے والوں کو ملا ہو اور انہوں نے اپنے پاس رکھ لیا ہو۔''

''لاش سب سے پہلے مجھے ملی تھی۔ لہٰذا اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''نہیں وہ مزدور۔''

''وہ بعد کی بات ہے۔ میڈم مارٹینا کل رات سے غائب تھی۔ میں نے سمجھا کہ شاید صبح سویرے شیمان گڑی جانے والی پارٹی کے ساتھ اسکیٹنگ کے لیے چلی گئی ہو۔ لیکن جب وہ سہ پہر تک واپس نہیں آئی تو میں تنہا اس کی تلاش میں نکل گئی اور پھر گرین وے کی ڈھلوان پر مجھے وہ مل گئی۔ پستول اس کے پاس نہیں تھا۔ ہولسٹر سمیت غائب تھا۔ اور مرنے سے قبل اس نے برف پر ایک مخصوص نشان بنادیا تھا۔ جو شدید خطرے کی علامت ہے۔ میں دوسرے راستے سے واپس آگئی۔ تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ لیکن تم نے ذرا دیر قبل جو دیکھا وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ مجھے پہچان بھی چکے ہیں۔''

''کیوں نہ پولیس کو مطلع کردوں۔''

''پاگل ہوئی پولیس کچھ نہیں کرسکتی۔ میرے لیے اب انتظار کرنے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔''

''لیکن کس کا انتظار؟''

''میں نے بتلایا نا، میڈم مارٹینا نے کسی کو پیغام بھیجا تھا۔ اسے یہاں آخر مجھ سے ملنا اور اس کی آمد تک میں کہیں نہیں جاسکتی۔''

''تم یہ سب لکھ کر ڈاک سے کیوں نہیں روانہ کردیتی ہو۔ یا کم از کم۔''

''تم کو ہماری تنظیم کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے۔نوشین۔''ہلیر انے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔''ہم اپنا کوئی راز تحریر میں نہیں لا سکتے، تاوقتیکہ کوئی اور صورت حال باقی نہ رہے۔''

''اور اگر تم کو بھی.....''نوشین رک گئی۔

''اگر مجھ کو بھی قتل کر دیا گیا تو کیا ہوگا؟''ہلیر ا نے جملہ مکمل کر دیا۔''تم ٹھیک کہتی ہو۔اسی لیے میں نے تم پر اعتبار کر لیا ہے۔پہلے مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید تم کوئی چال چل رہی ہو۔''

''میں؟''

''ہاں تم،تم مجھے دھوکا دے کر بھی باہر لا سکتی تھیں جہاں وہ منتظر ہوتے۔اسی لیے میں نے تم پر پستول نکال لیا تھا۔لیکن بعد میں میرا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔اسی لیے میں تم کو یہ سب کچھ بتلا رہی ہو۔''

''تمہارے خیال میں میں اس سلسلے میں کچھ کر سکتی ہوں؟''

''ہاں۔''ہلیر انے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔''اس کے علاوہ چارہ بھی کیا ہے۔اگر میں بھی میڈم مارٹینا کی طرح.....!اور تم خاصی ذہین اور دلیر لڑکی ہو اور یقیناً تم کو اپنی قوم اور اپنے وطن سے محبت ہوگی۔''

''میں ایک سپاہی کی بیٹی ہوں ہلیرا۔''نوشین نے فخریہ انداز میں کہا۔

''میں جانتی ہوں لیکن تم کو حلفیہ راز داری کا وعدہ کرنا ہوگا۔''

''میں حلفیہ وعدہ کرتی ہوں تم۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔''ہلیر انے جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی۔''سنو نوشین کل صبح تم کو یہ ڈاک سے میرے بتلائے ہوئے پتے پر روانہ کرنا ہے۔یہ میڈم مارٹینا کی گھڑی ہے۔''اس نے گھڑی نوشین کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔''وہ یقیناً میری نگرانی کر رہے ہوں گے۔اس لیے میں خود یہ کام نہیں کر سکتی۔لیکن تم پر کوئی شبہ نہیں کرے گا۔یہ گھڑی ایک قسم کا اہم پیغام ہے،ہم میں سے ہر ایک کے پاس ایک مخصوص گھڑی ہے۔''اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دکھائی۔

''اس کے اندر کندہ نمبر دراصل ہمارے شناختی کارڈ نمبر ہیں۔اس گھڑی کے ملنے پر وہ سمجھ جائیں گے کہ ہم شدید خطرے میں ہیں۔''

''یہ کس پتے پر بھیجنا ہے؟''

''ہر ایک کو اپنا پیغام مختلف پتے پر بھیجنا ہوتا ہے۔مجھے یہ گھڑی ناظم واچ کمپنی مال روڈ کے پتے پر بھیجنا ہے۔پتا یاد کر لو۔''ہلیر انے کہا۔''ساتھ میں ایک پرچا تحریر کر دینا۔مرمت کے بعد فوراً واپس کر دیجیے۔ہلیر ا اور اگر مجھے کوئی حادثہ پیش آجائے تو۔''

''تم خواہ مخواہ پریشان ہو۔کوئی حادثہ وادثہ پیش نہیں آئے گا۔''نوشین نے تسلی دی۔

''پھر بھی ممکن ہے۔مجھے بہت عجلت میں جانا پڑے۔کیا تم مجھے اپنا پتا دے سکتی ہو؟''

''کوئی کاغذ ہے میں لکھ دوں؟''

''ہلیر انے اپنے اوور کوٹ کی جیب سے ایک بند لفافہ نکالا۔جس پر کوئی پتا تحریر نہیں تھا۔

''کاغذ تو نہیں ہے اس پر لکھ لوں۔''اس نے قلم نکال کر کہا۔

''لاؤ میں لکھ دوں؟''نوشین نے لفافے کی پشت کے ایک کونے پر اپنا پتا لکھ کر لفافہ اسے واپس کر دیا۔

''مجھے یہ لفافہ بھی کسی محفوظ جگہ پر چھپانا ہوگا۔''ہلیر انے سوچتے ہوئے کہا۔''خیر میں یہ کام کر لوں گی۔''

''صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔نوشین نے نیند سے بوجھل آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے انگڑائی لی۔''

''اگر تم کہو تو میں یہیں لیٹ جاؤں؟''اس نے ہلیر اسے پوچھا۔

''صبح ہوگئی ہے۔''ہلیر انے کہا۔''اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔تم جا کر آرام کرو۔''

نوشین جانے کے لیے کھڑی ہوئی۔

''نوشین۔''ہلیر انے پیار سے کہا۔''میں بے

حد ممنون ہوں۔''

نوشین نے محبت اور گرم جوشی کے ساتھ اس کے ہاتھ دبائے۔ اور باہر نکل آئی۔ ہلیر انے دروازہ بند کرلیا وہ اپنے کمرے کی جانب روانہ ہوئی پھر اچانک چونک پڑی۔

راہداری کے قالین پر ہلیرا کے دروازے کے بالکل سامنے کسی کے پیروں کے تازہ نشان واضح تھے کوئی دروازے پر کھڑا ان کی باتیں سنتا رہا۔ نوشین خوف سے لرز گئی۔

☆☆☆

میڈم مارٹینا کی لاش ان کے آبائی علاقے میں روانہ کردی گئی۔ نوشین نے ہیرا کی دی ہوئی گھڑی میں روڈ پر واقع ڈاک خانے سے اس کے بتلائے ہوئے پتے پر روانہ کردی اور اسے یقین تھا کہ کسی نے اس کا تعاقب نہیں کیا ہے۔''

اس نے ڈائننگ ہال میں ناشتے کی میز پر ہلیر اکو بتلا بھی دیا کہ کام ہوگیا ہے۔ اناشتے کے بعد تمام لوگ ہوٹل کے ہال میں اسکیٹنگ کے لیے جانے کی تیاری کررہے تھے۔ اور ٹیم کے نگراں کاردار نے سب کو خبردار کیا کہ کوئی بھی گرین وے کی طرف نہ جائے۔ اس نے بتلایا کہ گرین وے کی طرف ڈھلوان کے کنارے پر برف کچی ہے اور وہاں اسکیٹنگ کرنا خطرناک ہے۔

نوشین ہوٹل سے کافی دیر بعد نکلی کیونکہ تمام رات جاگنے سے وہ تھکی ہوئی تھی اور چند گھنٹے بعد ہی وہ اس قابل ہوسکی کہ باہر جاسکے۔ جب وہ شیمان گڑھی پہنچی تو لوگ اسکیٹنگ کے لیے دور جاچکے تھے۔ سامنے پھیلے ہوئے برفیلے میدان میں شیمان گڑھی آئے ہوئے لوگوں کی خاصی تعداد برف پر اسکیٹنگ کررہی تھی۔ نوشین بہت آہستہ رفتار سے اسکیٹنگ کرتی ہوئی جب ڈھلوان پر پہنچی تو کرنل الیگزینڈر نے اسے آواز دی۔

''ہیلو نوشین۔''

''نوشین جب الیگزینڈر کے پاس پہنچی تو اس کی بیوی مسز کیتھین نے پیار سے اپنے پاس بٹھالیا۔ کرنل الیگزینڈر بہت سے نوآموز اسکیٹرز کو مشق کرارہا تھا جن میں ہیلوٹ بھی شامل تھا جو بار بار پھسل رہا تھا۔

''تم بہت دیر سے آئیں ڈیئر۔'' مسز کیتھین نے کہا۔

''طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے میں آرام کرتی رہی۔'' نوشین نے جواب دیا۔ ''یہ میجر ہیلوٹ کہیں اپنی ٹانگ نہ توڑ بیٹھے۔''

''اوہ ڈیئر یہ میجر بھی اسکیٹنگ نہیں کرسکتا۔ اس عمر میں اس کا یہ حال ہے۔'' کیتھین نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ٹیم میں ایک مسخرہ بھی ہونا چاہیے۔'' الیگزینڈر نے کہا۔

وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ نوشین کی طبیعت بوجھل تھی۔ اس لیے وہ بیٹھی رہی اور حد نگاہ اسکیٹرز کو پہاڑی پر اسکیٹنگ کرتے دیکھتی رہی۔ نوشین کی نگاہ اچانک کاردار پر پڑی۔ جو پہاڑی کی بلندیوں سے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ پھسلتا ہوا ان کی سمت آرہا تھا وہ بڑا ماہر اسکیٹر تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ برف پر اڑتا ہوا ان کے پاس آکر رک گیا۔

''ہیلو کاردار۔'' الیگزینڈر نے کہا۔ ''تم نے رات کے قیام کا بندوبست مکمل کرلیا؟''

''ہاں ہٹ میں سارا سامان پہنچادیا گیا ہے اور میرا خیال ہے شام تک سب کو پہنچ جانا چاہیے ورنہ تاریکی میں راستہ خطرناک ہوجائے گا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میں ساتھ نہیں دے سکوں گا۔'' الیگزینڈر نے کہا۔

''کیوں؟''

''میرے پیر میں موچ آگئی ہے۔'' الیگزینڈر نے کہا۔ ''مرے خیال میں مس نوشین تمہارا ساتھ دیں گی۔''

''ہاں میں یقیناً ساتھ دوں گی۔'' نوشین نے کہا۔

رات کو ان کا پروگرام پہاڑ پر بنی ہوئی ہٹ میں

قیام کرنے کا تھا تاکہ صبح سویرے ہی وہ شیمان گڑھی کے ڈھلوانوں میں اسکیٹنگ کرسکیں۔ ہٹ پہاڑی پر سطح سمندر سے پندرہ سو فٹ کی بلندی پر واقع تھی اور رات بھر برفباری کے بعد گردوپیش کی پہاڑیوں پر بہترین اسکیٹنگ ہوتی تھی۔

''میرا خیال ہے ہمیں ہوٹل پہنچ کر تیاری کرنا چاہیے۔'' کاردار نے کہا۔ ''آپ لوگ چلیں میں سب کو لے کر آتا ہوں۔''

نوشین نے اپنے کمرے میں پہنچ کر ناشتے کا آرڈر دیا جب بیرا چائے لے کر آیا تو وہ اپنے اسکیٹ صاف کررہی تھی۔

''کیا آپ بھی رات ہٹ پر گزاریں گی بی بی؟'' جگجیت سنگھ نے پوچھا۔

''ہاں جگجیت۔'' نوشین نے جواب دیا۔ ''میں بھی پارٹی کے ساتھ جارہی ہوں۔''

جگجیت نے چائے بنا کر کے اس کے سامنے رکھی۔ ''تب آپ جانے کی تیاری کریں موسم کچھ خراب ہورہا ہے۔''

''کیا برف باری کا امکان ہے۔''

''طوفان آنے کے آثار ہیں۔'' جگجیت نے کہا۔ ''آپ کو بہت بلندی پر جانا ہے۔ ایسے میں اکثر خطرناک حادثے بھی ہوجاتے ہیں۔''

''لیکن جگجیت کی پیش گوئی کے برخلاف جب وہ شیمان گڑھی سے ڈھلوانوں پر سے ہوتے ہوئے پہاڑوں کی چوٹی پر پہنچے تو اچانک سورج نکل آیا۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی نرم روشنی میں گردوپیش کا تمام علاقہ جگمگا اٹھا۔ بلند وبالا چوٹیوں پر جمی ہوئی برف چمک اور روشنی میں نہائی ہوئی برفیلی وادیوں کا خاموش منظر اتنا دلکش تھا کہ نوشین دم بخود رہ گئی۔ وہ شمتی اور لیزا کے ساتھ کرسچن گلی میں اسکیٹنگ کرتی ہوئی ہٹ کے قریب ایک بلند ٹیلے پر کھڑی ہوکر ڈوبتے ہوئے سورج کا خوب صورت منظر دیکھ رہی تھی کہ اچانک کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''بڑا خوب صورت منظر ہے۔''

نوشین نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

''ارے ہلیر! تم کب آئیں۔'' وہ خوش ہوکر بولی۔

''بس چلی آرہی ہوں۔ تم سب کے آنے کے بعد تنہا دل گھبرا رہا تھا۔ اس لیے میں سوچا رات تمہارے ساتھ ہٹ میں گزاری جائے۔''

ہٹ کی طرف واپس آتے ہوئے نوشین نے سرگوشی میں پوچھا۔

''کوئی خاص بات تو نہیں ہلیرا؟''

''نہیں بس یہ سوچ رہی کہ یہاں آکر میں نے کوئی خطرہ مول تو نہیں لیا۔''

''تم خواہ مخواہ وہم میں مبتلا ہو۔'' ہلیرا ہنس پڑی۔

''میں نے بھی میڈم مارٹینا سے یہی کہا تھا۔'' نوشین کے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔

ہٹ کے دروازے پر وکی، جونسن، کیرن اور دراز قد ابوذر کھڑے تھے کاردار، انتہائی تیز رفتار کے ساتھ اسکیٹنگ کرتا ہوا آیا اور ان کے سامنے آکر رک گیا۔

''کہاں سے آرہے ہو۔'' جونسن نے پوچھا۔

''میں گوجر گلی میں اسکیٹنگ کررہا تھا۔'' کاردار نے کہا اور اسکیٹ کھولنے لگا۔

''اندر چلو دیکھیں تمام سامان آگیا یا نہیں۔''

''باقی تمام لوگ کہاں ہیں؟'' ابوذر نے پوچھا۔

''آرہے ہیں۔''

وہ ہٹ کے اندر داخل ہوگئے۔ جو دو بڑے بڑے لکڑی کے بنے ہوئے کمروں پر مشتمل تھی، رات کو نوشین کی آنکھ اچانک کھلی تھی۔ ہر سمت موت کا سناٹا طاری تھا۔ لوگوں کے سانس لینے تک کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ نوشین اٹھ کر بیٹھ گئی۔ برابر والے کمرے میں سوئے ہوئے مرد اپنے بستروں میں لپٹے ہوئے بے خبر سو رہے تھے اور تب اچانک نوشین

کی نظر ہلیرا کے بستر پر پڑی۔
بستر خالی تھا اور ہلیرا لاپتا تھی۔ نوشین کا دل کسی انجانے خوف سے لرز اٹھا۔ وہ جلدی سے بستر سے باہر نکلی اوور کوٹ پہنا اور بہت آہستہ چلتی ہوئی ننگے پیر ہٹ سے باہر نکلی۔ اندر داخل ہونے کا صرف ایک ہی دروازہ تھا۔ نوشین نے ہاتھ لگایا تو وہ کھل گیا۔ اس کا مطلب ہے۔ ہلیرا باہر گئی تھی۔ وہ باہر نکلی اور بہت آہستگی سے دروازے کو بند کر کے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ پوری کائنات دودھیا چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ ہٹ کی دیوار کے پاس کوئی سایہ سا لرز انوشین اچھل پڑی۔
''نوشین، کسی نے سرگوشی کی۔''
نوشین نے چونک کر دیکھا ہلیرا اسکیٹ باندھ رہی تھی۔ وہ لپک کر قریب پہنچی۔
''تم نے مجھے ڈرا دیا تھا۔'' اس نے کہا۔
''پاگل تم ننگے پیر باہر کیا کرنے آگئیں۔ اندر آجاؤ ورنہ نمونیہ ہو جائے گا۔''
''غالباً دروازہ کھلنے کی آہٹ سے میری آنکھ کھلی تھی۔'' نوشین نے کپکپاتے ہونٹوں سے کہا۔ ''تمہارا بستر خالی دیکھ کر میں گھبرا گئی۔''
ہلیرا آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔
''اب اندر جاؤ اور خاموشی سے سو جاؤ۔''
''لیکن تم کہاں جا رہی ہو؟'' آخر کیا بات ہے؟''
''ہش.....'' ہلیرا نے کہا۔ ''آہستہ بولو وہ آگیا ہے اور اب سب ٹھیک ہو جائے گا اور کل شاید میں اس منحوس جگہ سے چلی جاؤں ادھر آؤ وہ روشنی دیکھ رہی ہو؟'' اس نے دستانے میں لپٹے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔
''کہاں؟''
''ادھر بائیں جانب درختوں کے جھنڈ میں۔''
''شیمان گڑھی کے بائیں جانب کی پہاڑی پر برف پوش درختوں کے درمیان نوشین کو روشنی کی ہلکی سی جھلک نظر آئی۔
''یہ سرخ روشنی؟''
''ہاں۔ میں کئی دن سے اسی اشارے کی منتظر تھی۔'' ہلیرا نے کہا۔ ''میڈم مارٹینا کا پیغام پہنچ گیا۔ وہ آگیا ہے میں اسی خیال سے یہاں آئی تھی۔'' ہلیرا نے بتلایا۔
''ہوٹل کے کمرے میں بھی یہ روشنی میں دیکھ سکتی تھی۔ لیکن اتنی رات کو وہاں سے باہر آتی تو کسی کو شک بھی ہو سکتا تھا۔''
''لیکن ہلیرا! تم اتنی رات کو وہاں تنہا کیسے جاؤ گی؟'' نوشین نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔ ''اتنے گھنے جنگل اور تاریکی میں راستہ خطرناک ہے۔''
''آہستہ بولو کیا سب کو جگانے کا ارادہ ہے؟'' ہلیرا نے کہا۔ ''میں سالم ہل کی طرف سے گرین وے کے راستے سے جاؤں گی۔ تم جانتی ہو میں اچھی اسکیٹر ہوں۔''
''میں بھی ساتھ چلوں گی۔'' نوشین نے کہا۔ ''تم کو خطرے کا اندازہ نہیں ہے۔''
''ہلیرا نے آگے بڑھ کر نوشین کے رخساروں کو چوم لیا۔
''پاگل وہاں کوئی قاتل میرا انتظار نہیں کر رہا ہے۔ تم جا کر سو جاؤ اگر مجھے دیر ہو گئی تو میں سیدھی ہوٹل چلی جاؤں گی۔ تم سے وہیں ملاقات ہو گی۔''
ہلیرا نے اسٹک سنبھالی اور نوشین کو ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا اور پھر اتنی تیز رفتاری سے برف پر پھسلتی ہوئی آگے بڑھی کہ چند لمحوں میں نظروں سے دور ہو گئی۔ نوشین سامنے کی بلند چوٹیوں کو گھورتی رہی۔ نجانے کیوں اسے یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے ہلیرا ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی ہو۔
اور جیسے ہی وہ پلٹی دروازہ بند ہونے کی ہلکی سی چرچراہٹ نے اسے چونکا دیا۔ نوشین نے دروازے کی درز میں کسی سائے کی جھلک دیکھی۔ خوف سے وہ منجمد ہو گئی۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے تیزی کے ساتھ

اندر داخل ہوئی۔

اندر کوئی بھی نہ تھا۔ سب اپنے اپنے بستروں میں دبکے سو رہے تھے۔ لیکن نوشین کو یقین تھا کہ کوئی دروازے کی آڑ میں کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔

نوشین ان کی آوازوں سے ہی بیدار ہوئی تھی۔ ہٹ کے باہر وہ زور زور سے باتیں کر رہے تھے، لیکن جب وہ باہر نکلی تو وہ برف پر تیزی سے پھسلتے ہوئے دور جا چکے تھے۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ وہ ہٹ میں آئی، جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا اور کچن میں پہنچی، ناشتا تیار رکھا تھا۔ کافی کا پانی انگیٹھی پر کھول رہا تھا۔ لیکن وہ بالکل تنہا تھی نوشین نے حیرت زدہ ہو کر دوسرے کمرے میں دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ ناشتا کر کے وہ کافی پی رہی تھی کہ اچانک اسے خیال آیا۔ سب کی عدم موجودگی اور پھر ذرا دیر قبل ان کا زور زور سے باتیں کرنا میرے خدا کہیں۔

دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے اسکیٹ باندھے اور برف پر برق رفتاری سے پھسلتی ہوئی شیمان گڑھی کی سمت روانہ ہوئی۔ ناگا پربت کی چوٹیوں کی سمت سے سیاہ بادلوں کا دھواں فضاء میں پھیل رہا تھا۔ موسم کے خراب ہونے کے آثار نمایاں تھے۔ نوشین نے ہر سمت نظریں دوڑائیں لیکن اسے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ آخر سب کہاں غائب ہو گئے۔ ہلیرا نے سالم ہل اور گرین وے کا ذکر کیا تھا۔ نوشین اسی سمت مڑی۔

سالم ہل کے قریب ڈھلوانوں میں اس نے گرین وے کی سمت دیکھا وہ سب وہاں تھے ان کے علاوہ بھی دوسرے لوگ تیس چالیس کے قریب کھڑے نیچے دیکھ رہے تھے۔ نوشین کے لبوں سے ایک سسکی نکل گئی۔ ''ہلیرا'' اس نے غم زدہ آواز میں کہا۔

نوشین جب ان کے قریب جا کر رکی تو لیزا کیلاش کے شانوں پر سر رکھے سسکیاں لے رہی تھی۔ کیرن کے رخسار بھی آنسوؤں سے تر تھے۔ سب ہی غم زدہ نظر آ رہے تھے۔

''کک..... کک کیا ہوا؟'' نوشین نے پوچھا حالانکہ وہ سب جانتی تھی۔

''ہلیرا'' کیرن نے کہا اور رونے لگی۔ نوشین گرین وے کی سماعت بڑھی۔

''نوشین!'' کیلاش چیخا۔ ''ادھر مت جاؤ''

لیکن نوشین نے کچھ نہیں سنا۔ ڈھلوانوں پر گرین وے کے قریب کھڑے تھے کاردار ابوذر کسی چیز پر جھکے ہوئے تھے نوشین کی اسکیٹنگ کی آواز پر کاردار نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''تم یہاں کیوں آ گئیں؟'' اس نے نوشین کو روکتے ہوئے کہا۔ ''واپس جاؤ''

''لیکن نوشین اسے دھکا دے کر آگے بڑھی۔ برف پر ہلیرا اس طرح ایک کروٹ پڑی تھی جیسے آرام سے سو رہی ہو۔ اس کے دونوں پیر اکڑے ہوئے تھے ایک ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ جس میں اس نے اپنی اسکیٹنگ اسٹک اب تک پکڑ رکھی تھی۔ سر کے نیچے اگر جمے ہوئے خون کا نشان نظر نہ آ رہا ہوتا تو اسے مردہ سمجھنا مشکل تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لبوں پر اسرار سی مسکراہٹ تھی۔

مسز تھین نے اسے زبردستی گھسیٹ کر پیچھے ہٹا لیا۔

''ہٹ جاؤ نوشین ڈارلنگ ہٹ جاؤ'' اس نے غم زدہ لہجے میں کہا۔

کرنل الیگزینڈر نے غور سے نوشین کے چہرے کو دیکھا جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن نوشین یہ دیکھ چکی تھی کہ کھلے ہوئے سوئٹر کے نیچے سے ہلیرا کا پستول اور ہولسٹر غائب ہے۔

نوشین نے ہوٹل کے لاؤنج میں کھڑے ہو کر پیروں سے اسکیٹ باندھے اور جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ آسمان اب سیاہ بادلوں کے ہجوم میں روپوش ہو چکا تھا۔ تیز ہواؤں کے جھونکے برف باری کی ابتداء کی خبر دینے لگے۔

''ارے تم اس وقت کہاں جا رہی ہو نوشین؟''

”نوشین نے چونک کر دیکھا تو میجر کریم اس کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔
”بس ذرا شیمان تک ایک چکر لگاؤں گی۔“ نوشین نے کہا۔
”ہوش میں ہو کسی بھی لمحے طوفان آنے والا ہے۔“
”میں دور نہیں جاؤں گی میجر اطمینان رکھو۔“
میجر کریم برف پر پھسلتی ہوئی نوشین کو اس وقت تک گھورتا رہا جب تک وہ نظروں سے دور نہ ہوگئی۔
نوشین نے گرین وے کے اوپر پہنچ کر محسوس کیا کہ ہوائیں تیز ہوگئی ہیں۔ لیکن وہ رکی نہیں۔ ڈھلوان کے اوپر پہنچ کر اس نے جگہ پر نظر ڈالی جہاں ہلیرا کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بے ساختہ بھر آئیں۔ اس نے غور سے اسکیٹنگ کے نشانات دیکھنا شروع کیے۔ جمی ہوئی برف پر ہلیرا کی اسکیٹنگ نے بڑی واضح لکیر چھوڑی تھی۔ جو سالم ہل کے اوپر اوپر درختوں کے جھنڈ میں جا کر گم ہوگئی تھی۔
اس کا مطلب ہے۔ ہلیرا پر وہاں سے واپسی پر حملہ ہوا تھا لیکن کیا وہ اس سے ملاقات کرسکی تھی۔ جس کا اسے انتظار تھا؟ نوشین نے سامنے دیکھا۔ ہوٹل کی عمارت کی پہلی منزل صاف نظر آرہی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ ہلیرا اپنے کمرے کے دریچے سے بھی یہ روشنی دیکھ سکتی تھی۔
نوشین جب پہاڑی پر درختوں کے درمیان پہنچی تو ہلیرا اسکیٹنگ کے چھوڑے ہوئے نشانات اچانک کم ہوگئے۔ لیکن وہ تھوڑی دور آگے گئی تو پھر نظر آنے لگے۔ پندرہ منٹ بعد وہ پہاڑی کی بلندیوں پر تھی اور تب اچانک اس کی نگاہ درختوں کے درمیان چھپی ہوئی ایک ہٹ پر پڑی۔ جس کی چھت برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور ہٹ کے گیٹ کے سامنے رک گئی۔ برف پر اسکیٹنگ کے نشانات سے واضح تھا کہ کم از کم تین افراد اس ہٹ میں آئے اور گئے ہیں۔
نوشین نے اپنی اسکیٹ کھول کر پاؤں سے الگ کیے اور گیٹ کے اندر داخل ہوئی تیز ہواؤں کے جھکڑ سیٹیاں بجاتے دیوار کے بلند درختوں پر سے گزر رہے تھے۔ اور طوفان کی آمد آمد تھی۔ تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ ہٹ پر موت کا سا سکوت طاری تھا اور نوشین کے بڑھتے ہوئے قدم اس نے انجانے خوف سے رک گئے۔ وہ قاتل اب تک یہاں نہیں ہوگا۔ اس نے سوچا۔ لیکن پھر اچانک ہلیرا کا خیال آتے ہی اس کو زبردست غصہ آیا اور وہ ہمت کرکے اندر داخل ہوئی۔
دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اندر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ نوشین جس کمرے میں داخل ہوئی وہ خاصا بڑا تھا تاریکی میں اس کی آنکھیں عادی ہوگئیں۔ تو اس نے دیکھا کہ برابر میں ایک اور دروازہ تھا وہ آہستہ آہستہ قدموں سے جس کمرے میں داخل ہوئی وہ مختصر سا تھا۔ بڑے کمرے میں اسے تمباکو کی بو محسوس ہوئی تھی۔ جیسے کچھ دیر قبل وہاں کسی نے سگریٹ پیا ہو۔ لیکن دوسرے کمرے میں اسے تمباکو کے ساتھ کسی اور چیز کی بو بھی محسوس ہوئی میٹھی میٹھی بھینی سے بو جسے وہ پہچان نہ سکی۔
فرش پر پڑے ہوئے سگریٹ کے ایک ٹکڑے کو اس نے اٹھایا۔ دروازے کی آڑ میں رکھی ہوئی کرسی کے برابر کئی اور جلے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے تھے کوئی یہاں بیٹھا رہا تھا اور پھر کرسی پر اسے وہ سرخ نشان نظر آیا۔ اس کا دل خوف سے لرز گیا۔ خون اس نے بے ساختگی میں ہاتھ بڑھا کر اسے چھوڑا۔ لیکن وہ خون نہیں تھا۔ باریک ربڑ کا ایک ٹکڑا تھا۔ جیسے کوئی غبارہ پھٹا ہوا ہو۔
سامنے کا دروازہ بظاہر بند تھا۔ لیکن دھکا دینے سے کھل گیا۔ یہ بہت مختصر سا کمرہ تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی۔ کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ جس پر ایک پرانا پیٹرومکس گیس رکھا تھا اور اس کا شیشہ سرخ تھا۔ تو وہ یہاں بیٹھا ہوا تھا جس سے ہلیرا ملنے آئی تھی اور تب اس نے بارود کی واضح اور تیز بو محسوس کی، جو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی، کسی نے یہاں حال ہی میں گولی چلائی تھی۔ لیکن۔

ہلیرا؟ اس نے میز پر سے ماچس اٹھا کر جلائی اور تب اسے لکڑی کے فرش پر پڑا ہوا خون نظر آیا۔ کسی کو اس کمرے میں قتل کیا گیا تھا۔ لیکن ہلیرا کی لاش کو اتنی دور لے جا کر پھینکنا آسان نہ تھا۔ پھر کیسے؟ اور تب اچانک اس کے ذہن میں پورا منظر واضح ہوگیا۔

کسی نے ہلیرا کی آمد سے پہلے اسے قتل کر دیا تھا جس سے ملنے ہلیرا یہاں آرہی تھی اور جب ہلیرا اسے یہاں نہ پا کر خطرے کی بو محسوس کر کے واپس ہوئی تو قاتل اس کا منتظر تھا تاریکی میں ہلیرا کو یہ اندازہ بھی نہ ہوسکا کہ موت اس کے ساتھ چل رہی ہے۔ گرین وے کی ڈھلوان پر پہنچتے ہی قاتل نے اپنی اسکیٹنگ اسٹک سے ہلیرا پر وار کیا ہوگا۔ یہ سارا منظر اس کی منظروں میں گھوم گیا اور تب اسے خیال آیا کہ قاتل یقیناً اس جگہ کی نگرانی کر رہا ہوگا۔ تاکہ اگر ہلیرا کا کوئی اور ساتھی ہے تو اسے پہچان لے خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ بدحواسی میں اس نے بادلوں کی تیز گرج کی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ لیکن گرنی پڑتی وہ جب باہر نکلی تو۔ اندھیر پھیل چکا تھا۔ اور برف باری شدت سے ہو رہی تھی۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی گیٹ تک آئی۔ گیٹ سے باہر نکل کر وہ پیروں سے اسکیٹ باندھنے کے لیے جھکی تو سامنے برف میں کچھ چمکتا ہوا نظر آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر دیکھا برف میں نصف دبی ہوئی رسٹ واچ ہلیرا کی تھی۔ غالباً جلدی میں بھاگتے ہوئے گر گئی ہوگی۔ نوشین نے گھڑی جیب میں رکھ لی بادل گرجا اور اسی لمحہ ہٹ میں لکڑی کے تختوں کے چرچرانے کی آواز سنائی دی جیسے کوئی دبے قدموں آرہا ہو۔

نوشین اس طرح بھاگ رہی تھی جیسے موت اس کا تعاقب کر رہی ہو۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ یقیناً پہلے سے منتظر تھا۔ لیکن ایک بات یقینی تھی کہ اس نے اسکیٹ نہیں پہن رکھے تھے۔ اور جتنی دیر وہ اس کام میں لگائے گا۔ اتنے ہی وقت میں نوشین اس سے دور نکل جانا چاہتی تھی خوف سے اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ برف بڑی شدت سے گر رہی تھی اور چند قدم آگے دیکھنا بھی ممکن نہ تھا۔ وہ صرف اندازے سے برف پر برق رفتاری کے ساتھ پھسل رہی تھی۔

اور پھر اچانک سامنے ایک سایہ نمودار ہوا۔ قبل اس کے کہ وہ سنبھل سکتی، کوئی زور سے اس کے شانوں سے ٹکرایا۔ اگر وہ مضبوطی کے ساتھ نوشین کا بازو نہ پکڑ لیتا تو یقیناً گر جاتی۔

''کون؟'' کسی نے بھاری لہجے میں پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

نوشین کو اپنی سانس گھٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ برف سے اس کا چہرہ ڈھک چکا تھا۔ اس لیے کچھ نظر بھی نہیں آرہا تھا۔

''کیا گونگے ہو۔ جواب کیوں نہیں دیتے؟'' کسی نے غصے میں کہا اور پھر دستانے پہنے ہوئے ہاتھ سے اس کے چہرے کی برف صاف کی۔ ''میرے خدایا تم؟''

حیرت کے باعث نوشین کے بازوؤں پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ نوشین نے ایک جھٹکے سے خود کو آزاد کیا اور اس سے پہلے کہ وہ اس کو دوبارہ پکڑتا وہ تاریکی میں گم ہوگئی۔ ایک لمحے کے لیے جب اس نے نوشین کے چہرے پر سے برف صاف کی تھی۔ تو وہ اس کی ہلکی سی جھلک دیکھ سکی تھی۔ لیکن وہ دراز قد اور مضبوط جسم والا کون تھا؟ نوشین اسے پہچان نہیں سکی تھی۔

نوشین کو کچھ پتا نہیں کہ وہ کس طرح ہوٹل پہنچی۔ لیکن گیٹ میں داخل ہونے کے بعد ہی اسے یہ اندازہ ہوا کہ وہ بچ گئی ہے۔ خوف سے ہانپتی ہوئی وہ بمشکل اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور بستر پر گر پڑی۔ باہر شدید طوفان سے ہوٹل کی عمارت بھی لرز رہی تھی۔

☆☆☆

نوشین کو شہر آئے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ وہ اسکیٹنگ پارٹی کے ساتھ دوسرے ہی دن شہر کے لیے روانہ ہوگئی تھی کیونکہ یہاں اس کے ماموں بریگیڈیر اکرام اللہ پہلے سے موجود تھے وہ ان دنوں اسی شہر

میں تعینات تھے اور نوشین نے وعدہ کیا تھا کہ وہ شیمان گڑھی سے وہیں واپس آئے گی۔ اس کے علاوہ کرنل الیگزینڈر، اس کی بیوی کیتھین، کیرن اور دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ ہی آئے تھے۔ کرنل الیگزینڈر کا قیام بھی اسی شہر میں تھا اور وہ بریگیڈیر اکرام اللہ کے قریب ہی رہتا تھا۔ لیکن ان دونوں اپنے ملک واپسی کے خیال سے اپنا سامان وغیرہ آہستہ آہستہ ٹھکانے لگا رہا تھا۔

نوشین ایک لمحے بھی ہلیرا کو نہ بھول سکی تھی اس کی نگاہوں میں ہلیرا کے ساتھ ایک ایک منظر پھر تار ہتا تھا اور جب بھی اس کو گرین وے پر پڑی ہوئی ہلیرا کی لاش کا خیال آتا۔ وہ کانپ اٹھتی۔ رات کو وہ دیر تک شیمان گڑھی میں گزرے ہوئے واقعات کا جائزہ لیتی رہی۔ اسے یہ سب ایک بھیانک خواب کی طرح محسوس ہوتا اور وہ ہر لحہ یہ سوچتی رہی کہ ہلیرا نے اس پر اعتماد کیا تھا۔ اس کو پورا کرنے کے لیے وہ کس طرح اس پراسرار مشن کی تکمیل کرے جس کے لیے ہلیرا نے اپنی جان دے دی، اس وقت بھی تاریک کمرے میں بیٹھی ہوئی انہی خیالات میں گم تھی۔

''نوشین!''

مسز اکرام اللہ کی آواز پر وہ چونک پڑی۔

''جی ممی۔'' وہ اپنی ممانی کو پیار سے ممی کہتی تھی۔

''یا اللہ بیٹی تم یہ اندھیرے میں کیا کر رہی ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''جی بالکل ٹھیک ہے ممی۔'' اس نے گھبرا کر سوئچ آن کرتے ہوئے کہا۔ کمرہ روشن ہوگیا۔

''لڑکی تمہیں ہوش ہے۔ آٹھ بج گئے ہیں مہمان آنے والے ہوں گے۔''

نوشین کو اچانک یاد آگیا کہ اس کے ماموں نے نوشین کے آنے کی خوشی میں تمام دوستوں کو ڈنر پر بلا رکھا تھا۔ وہ شرمندہ ہوگئی۔

''اوہ..... ممی آئی ایم سوری۔'' اس نے آگے بڑھ کر اپنی ممانی کے گلے میں پیار سے بانہیں ڈال دیں۔ ''آپ اکیلے تھک گئی ہوں گی۔''

''نہیں بیٹی..... انتظام تو سب ہوگیا۔ لیکن تم جلدی سے لباس بدل لو تم کو یہ بھی ہوش نہیں کہ فرخ بھی آرہا ہے۔''

نوشین کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی کیپٹن فرخ روزانہ کسی نہ کسی بہانے اس کے قریب آنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس نے یہ بھی اندازہ کرلیا تھا کہ اس کی یہ کوشش بلا سبب نہیں تھی۔ اس کے ماموں اور ممانی دونوں کی ہمت افزائی کو اس میں خاص دخل تھا۔ ممانی کئی بار اسے بتلا چکی تھیں کہ فرخ بہت اعلا خاندان کا چشم چراغ تھا۔ اس کے والد کروڑوں کی جاگیر کے مالک تھے اور فرخ کا اپنا مستقبل بھی بہت روشن تھا۔ خود فرخ نے بھی نوشین میں اپنی دلچسپی کو پوشیدہ نہیں رکھا تھا۔ لیکن نوشین کو کیا اس سے دلچسپی تھی وہ اب تک یہ فیصلہ نہ کرسکی تھی۔

''میں ابھی آتی ہوں ممی۔ بس دس منٹ۔'' اس نے جلدی سے کہا اور غسل خانے میں گھس گئی۔

نوشین ہال میں پہنچی تو انتظامات دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ہر سمت بیرے بھاگتے پھر رہے تھے۔ لان بھی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ ہال میں بینڈ والے اپنے ساز درست کرنے میں مصروف تھے۔ میزوں پر جدید طرز کی مکمل سجاوٹ تھی۔ مسز اکرام اللہ اسے دیکھ کر جلدی سے قریب آئیں۔

''آپ نے تو حد کردی تھی۔'' نوشین نے کہا۔

''اوہ..... تم جانتی ہو ان کے تمام انگریز دوست بھی آرہے ہیں۔ بیٹی مہمان آنا شروع ہوگئے ہیں۔ تم ذرا ان کو ریسو کرو۔''

''او کے ممی۔''

کیپٹن فرخ سائے کی طرح نوشین کے ساتھ تھا۔ کھانے کے بعد بینڈ نے میوزک چھیڑ دیا اور لوگ رقص میں مصروف ہوگئے۔ نوشین کھوئی کھوئی سی تھی۔ فرخ کی بھرپور کوششوں کے باوجود ماحول کی دلچسپیوں سے بے نیاز نظر آرہی تھی۔

''کیا بات ہے نوشین۔ آج تم کس فکر میں کھوئی ہو؟'' کیپٹن فرخ نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' نوشین نے جواب دیا۔ ''آؤ باہر لان میں بیٹھیں گے۔''

''تم نے کچھ کھایا بھی نہیں۔''

''اوہ..... آپ میری ہر بات پر اتنی نظر رکھتے ہیں؟'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''تمہیں اعتراض ہو تو۔''

''یہ بات نہیں۔'' نوشین نے کہا۔ ''بس آج کچھ طبیعت بوجھل ہے۔ گرمی بھی تو غضب کی ہے۔

''تم بیٹھو میں کچھ پینے کو لے آؤں۔''

نوشین کے روکنے سے پہلے وہ جا چکا تھا۔ ذرا دیر کے بعد کولڈ رنک کے دو گلاس لیے ہوئے وہ واپس آیا۔ نوشین نے ابھی دو ہی گھونٹ لیے تھے کہ سامنے سے کرنل الیگزینڈر اور مسز کیتھین انہیں دیکھ کر ادھر آ گئے۔ فرخ نے دو کرسیاں اور گھسیٹ لیں اور بیرے کو ان کے لیے ڈرنک لانے کا آرڈر دیا۔

''یہ تم دونوں یہاں کیوں چھپے بیٹھے ہو؟'' مسز کیتھین نے کہا۔

''بس میں ذرا شور و غل سے گھبراتی تھی اور گرمی سی محسوس کر رہی تھی۔''

''شیمان کے بعد یہاں شہر میں آ کر ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے جنت سے جہنم میں آ گئے ہوں۔'' کرنل الیگزینڈر نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔

نوشین غور سے کرنل کے لائیٹر کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے اتنا بڑا لائیٹر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شیمان گڑھی کے نام پر وہ چونک پڑی۔

''کرنل میرا خیال ہے شیمان گڑھی کا ہر لمحہ جہنم سے زیادہ عذاب تھا۔'' اس نے کہا۔ کرنل الیگزینڈر نے اسے غور سے گھورا۔

''ہاں مسلسل دو موتیں اور وہ بھی اتفاقیہ حادثے میں۔'' اس نے کہا۔

''پتا نہیں۔'' نوشین نے آہستہ سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' کرنل الیگزینڈر نے چونک کر کہا۔ لیکن اسی لمحے ایک ملازم نوشین کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

''بی بی جی شام کو آپ کا یہ خط آیا تھا۔ میں کام میں بھول گیا۔''

نوشین نے پلٹ سے ایک لمبا سا لفافہ اٹھا کر دیکھا اس میں چائنا ویو ہوٹل شیمان گڑھی کا نام چھپا ہوا تھا۔ اس نے احتیاط سے لفافہ پھاڑا تو اندر سے ایک اور لفافہ اور اس کے ہمراہ ایک خط ہوٹل کے لیٹر پیڈ پر لکھا ہوا تھا۔ منیجر نے مختصراً لکھا تھا کہ ہوٹل کے ایک کمرے کی الیکٹرونک وائرنگ درست کرتے ہوئے ایک تختے کے نیچے سے یہ لفافہ برآمد ہوا تھا۔ چونکہ اس پر نوشین کا پتا لکھا ہوا تھا۔ اس لیے خط اسے احتیاط کے ساتھ روانہ کیا جا رہا ہے نوشین نے منیجر کا خط میز پر رکھ کر لفافہ اٹھایا اور اس پر اپنی ہی تحریر دیکھ کر چونک گئی وہ ایک لمحے تک دم بخود اس لفافے کو گھورتی رہی۔ اس آنکھوں میں اس رات کا منظر گھوم رہا تھا۔

ہلیر انے نوشین کا پتا لکھنے کا کاغذ نہ پا کر یہ لفافہ جیب سے نکالا تھا اور پھر نوشین نے اپنے ہاتھ سے یہ پتا اس لفافے کی پشت پر تحریر کر دیا تھا۔ ہلیر انے کہا تھا ''مجھے یہ لفافہ کسی محفوظ جگہ چھپانا ہوگا۔'' نوشین کی نگاہوں میں ہلیر اکا خوب صورت چہرہ گھوم گیا تھا نوشین نے لفافہ چاک کیا۔ اندر سے ایک چھوٹا سا ایک لفافہ نکلا جس پر کسی کے دستخط نہیں تھے نوشین غور سے پڑھنے لگی۔

''جے پور میں گزشتہ سال سے میں نے ایک ہاؤس بوٹ کرائے پر لے رکھی ہے جس کا نام شری ناتھ ہے۔ اس ہاؤس بوٹ کا مالک جمیل ہے۔ جسے میں نے جون تک کا پیشگی کرایہ ادا کر دیا۔ میری اچانک موت کی صورت میں جے پور جا کر اس بوٹ پر قیام کرو میں نے پہلے ہی جمیل کو بتلا دیا ہے کہ اگر میرا کوئی دوست کرایہ کی رسید لے کر آئے تو اسے بوٹ پر قیام کرنے دیا جائے میں اور کچھ نہیں لکھ سکتی۔ لیکن وہ راز بوٹ پر محفوظ ہے۔''

خط پر نہ تو دستخط تھے نہ اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کس کو تحریر کیا گیا ہے۔ اگر نوشین نے اس پر اپنا پتہ نہ لکھا ہوتا یہ خط کسی کو بھی نہ مل سکا۔ ہوٹل والے

اسے ضائع کر دیتے لیکن وہ اس خط کا کیا کرے۔ پھر اسے اچانک ہلیرا کے الفاظ یاد آ گئے۔ ''اگر تم کو اپنی اور اپنے وطن سے محبت ہے۔'' نوشین کو بلاشبہ اپنے وطن سے محبت تھی۔

''کس کا خط ہے مس نوشین؟'' کرنل الیگزینڈر نے پوچھا۔ ''جج جی، وہ میری ایک سہیلی کا خط ہے۔'' مس نوشین نے چونک کر خط کو اپنے پرس میں رکھ لیا۔ ''ہم لوگ پرسوں جے پور جا رہے ہیں نوشین تمہارا کیا ارادہ ہے؟'' کرنل نے پوچھا۔

نوشین جے پور کے نام پر چونک پڑی۔ ''جے پور اور کرنل میں ضرور چلوں گی۔'' اس نے کہا۔ ''اس گرمی میں تو مرادم گھٹ جائے گا۔'' لیکن درحقیقت اس کا دم اس خیال سے گھٹ رہا تھا کہ مس ہلیرا کی ہاؤس بوٹ پر کون سا راز محفوظ ہے۔ جے پور پہنچ کر نوشین نے کرنل الیگزینڈر اور اس کی بیوی کیتھین کے ساتھ ان ہاؤس بوٹ میں قیام کیا تھا دوسری صبح ناشتے کے فوراً بعد ہی وہ شری ناتھ کی تلاش میں نکل پڑی۔ پدما گھاٹ سے ایک شکارے میں بیٹھ کر وہ ہلیرا کی ہاؤس بوٹ کی تلاش میں نکلی شکارہ اس چھوٹی کشتی کو کہتے ہیں جو سیر کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ چھوٹے ناگم پر اسے شری ناتھ مل گئی۔ خلاف توقع یہ صاف ستھری اور خوب صورت سی ہاؤس بوٹ تھی۔

جمیل نے بغیر کسی پس وپیش کے نوشین کو کشتی کا قبضہ دے دیا۔ شری ناتھ ایک پرسکون جگہ پر لنگر انداز تھی۔ اس کے برابر ہی تھوڑے فاصلے پر ہاؤس بوٹ کے ماجھی کی کشتی لنگر انداز تھی۔ جس میں اس کے رہنے اور کچن کا بندوبست تھا۔ شری ناتھ کے دروازے پر لکڑی کا ایک چوڑا تختہ رکھا ہوا تھا۔ جس کے ذریعے کنارے تک آنا جانا آسان تھا۔ وہ جمیل کے ساتھ کشتی میں داخل ہوئی تو دل دھڑک رہا تھا۔ ہاؤس بوٹ ایک بیڈ روم، ایک ڈائننگ روم اور ایک چھوٹے سے اسٹور پر مشتمل تھا۔ جسم میں لکڑی کے بنے ہوئے زینے سے چھت پر جانے کا راستہ تھا۔ مختصر سا بیڈ روم بالکل سادہ تھا۔ کھڑکیوں پر سستے سوتی کپڑے کا پردہ تھا ایک پرانا سا صوفہ، تین صاف ستھری کشن دار کرسیاں اور ایک کشادہ سی میز کونے میں ایک گدے والی مسہری جس کے سرہانے کھلنے والی کھڑکی پر باریک سا پردہ پڑا ہوا تھا۔ صوفے کے دائیں جانب ایک بڑا سا ریک جس میں ان گنت پرانی کتابیں اور رسالے رکھے ہوئے تھے۔ بیشتر کتابیں جس میں ان گنت انگریزی کی کتابیں تھیں۔ بیڈ روم اور ڈائننگ روم کے درمیان کوئی دروازہ نہیں تھا۔ بلکہ چھوٹے بڑے منکوں کی لڑیوں کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ ڈائننگ روم خاصا کشادہ تھا جس میں کھانے کی میز کے علاوہ بہت سی کرسیاں، ایک واشن بیسن، اور باتھ روم بنا ہوا تھا۔ اس کے برابر اسٹور روم تھا۔ جس میں ایک کپ بورڈ اور ہینگر وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ زینے کے اوپر کشادہ چھت تھی۔ جس پر پڑی ہوئی آرام کرسیوں پر بیٹھ کر جھیل کے خوب صورت مناظر سے لطف اندوز ہوا جا سکتا تھا۔

ہاؤس بوٹ کے ہر کونے میں ہلیرا کی یاد نوشین کے ذہن میں تازہ تھی لیکن وہ راز کہاں پوشیدہ تھا۔ جس کا اشارہ ہلیرا نے اپنے خط میں کیا تھا؟ اور اسے کس طرح تلاش کیا جائے یہ نوشین کی سمجھ میں اب تک نہ آسکا تھا۔ جب اس نے کرنل الیگزینڈر اور کیتھین کو یہ بتلایا کہ اس نے ایک ہاؤس بوٹ کرائے پر لے لی تو وہ بہت حیران ہوئے۔

''آخر تم کو ضرورت کیا تھی؟'' مسز کیتھین نے کہا۔ ''تم نے ہم کو غیر کیوں سمجھا؟''

''یہ بات نہیں مسز کیتھین۔'' نوشین نے کہا۔ ''میں یہاں آرام کرنے آئی ہوں اور اس کے لیے تنہائی ضروری ہے۔''

''تمہاری ہاؤس بوٹ ہے کہاں؟'' کرنل الیگزینڈر نے پوچھا۔

''چھوٹے ناگم پر لنگر انداز ہے۔ وہ جگہ بڑی پرسکون ہے۔''

''ہاں میں نے دیکھا ہے ایسی صورت میں ہم اپنی ہاؤس بوٹ بھی وہیں لے چلتے ہیں۔ تم کو یہاں

تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔ اکرام اللہ صاحب نے تمہیں ہماری ذمہ داری پر بھیجا ہے۔''

کرنل الیگزینڈر نے کہا۔

''اوہ تھینک یو۔'' نوشین نے کہا وہ خود بھی یہی چاہتی تھی۔ کیونکہ تنہا شری ناتھ میں رہنے کے خیال سے اسے جانا خوف محسوس ہو رہا ہے۔ جو لوگ اس راز کے لیے مسز ڈیسوز اور ہلیر اکو قتل کر سکتے تھے۔ ان کے لیے وہ راز حاصل کرنے کی راہ میں حائل ہر رکاوٹ دور کرنا مشکل نہیں خواہ وہ نوشین ہی کیوں نہ ہوا اور وہ ہاؤس بوٹ پر تنہا ہوگی۔ اس نے جلدی سے اپنے ننھے سے کتے کو آواز دی ''چیکو، چیکو۔''

کرنل الیگزینڈر کا ہاؤس بوٹ شری ناتھ سے تیس چالیس قدم کے فاصلے پر لنگر انداز تھا۔ نوشین ان کے ساتھ چائے پی رہی تھی کہ خانساماں نے کارڈ لا کر کرنل کو دیا۔

''کیا ہے بشیر؟'' کرنل نے پوچھا۔

''صاحب یہ ریزیڈینسی کا چپڑاسی دے گیا ہے۔'' بشیر نے جواب دیا۔ کرنل نے اسے کھول کر دیکھا۔

''اوہ..... تو ریزیڈینسی والوں کو ہماری آمد کا علم ہو گیا۔'' اس نے کہا۔ ''تو بھئی آج ہم سب کی دعوت ہے۔''

''کہاں ہے؟'' مسز کیتھین نے پوچھا۔

''ریزیڈنٹ صاحب نے آج تمام دوستوں کو کھانے پر بلایا ہے۔''

''ضرور کیرن نے بتایا ہوگا۔'' مسز کیتھین نے کہا۔ ''صبح وہ مجھے گھاٹ پر ملی تھی۔ ہیلن یہاں ہے؟'' نوشین نے پوچھا۔

''ہاں بھئی۔ وہ جے پور کے ریذیڈنٹ کی پرسنل اسسٹنٹ ہے۔'' وہ جب ریزیڈنسی پہنچے تو نوشین دیکھ کر حیران رہ گئی کہ شیماں گڑھی کے تمام ساتھی وہاں موجود تھے۔ میجر ہیلوٹ نوشین سے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ملا کیرن ان کو ہال میں چھوڑ کر چلی گئی اور نوشین لیزا کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھیں کہ اچانک کاردار وہاں آ پہنچا۔ ارے مس نوشین آپ کب آئیں؟''

''میں کل یہاں پہنچی ہوں اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ بھی یہیں موجود ہیں۔''

''بات یہ ہے کہ شیماں گڑھی کے قیام نے ساری تفریح خاک میں ملا دی تھی'' کاردار نے کہا۔

''خصوصاً ہلیر ا کی اچانک موت نے مجھے بہت صدمہ پہنچایا تھا وہ ہماری ٹیم کی بہترین اسکیٹر تھی۔''

ہلیر ا کے ذکر پر سب ہی تبصرہ کرنے لگے لیکن نوشین نے محسوس کیا تھا کہ کاردار نے اس کا تذکرہ دانستہ شروع کیا تھا۔ ''مجھے ہلیر ا کی موت پر اب تک شبہ ہے کہ وہ اتفاقی حادثہ نہ تھا۔'' کاردار نے کہا۔ نوشین چونک پڑی۔

''ہشت.....'' میجر ہیلوٹ نے کہا'' کاردار تم بھی وہی ہوتے جا رہے ہو۔'' کاردار نے بڑے غور سے نوشین کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ تمہاری بھی تو قریبی دوست تھی مس نوشین کاردار نے کہا۔

''میری دوست؟'' نوشین نے جلدی سے کہا۔

''نہیں تو۔''

''اچھا حالانکہ وہ تمہارے برابر والے کمرے میں مقیم تھی۔''

''ہاں لیکن میری اس سے یہ پہلی ملاقات تھی۔'' نوشین حیران تھی کہ کاردار کے تجسس کا کیا سبب تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بھی اس تنظیم سے تعلق رکھتا ہو یا پھر وہ ..... دشمنوں میں سے ہو اور نوشین پر شبہ کر رہا ہوں۔ نوشین کا دل دھڑکنے لگا۔

''میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔'' کاردار نے کہا۔ ''بڑی دلیر لڑکی تھی گزشتہ سال وہ جے پور میں تھی تو ہمارا کافی ساتھ رہا میں اکثر اس کی ہاؤس بوٹ پر جاتا تھا بھلا سا نام تھا اس کا شری ناتھ اس نے مجھے بتایا اس کی لیز اس سال تک کے لیے لے چکی ہے۔ مجھے وہ بوٹ پسند تھی اس لیے سوچا کہ ہلیر ا کی موت کے بعد وہ خالی ہوگی۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ تم نے کرائے پر لے لیا ہے۔''

نوشین خاموش رہی کاردار کی ہر بات پر اسرار اور معنی خیز ہوتی جارہی تھی۔

''بات یہ ہے کہ..... پتا نہیں تم اس کا کیا مطلب سمجھو..... بس یوں سمجھو مجھے ہلیرا سے دلی لگاؤ تھا کیا یہ ممکن نہیں کہ اس کی ہاؤس بوٹ مجھے دے دو تمہیں اس سے اچھی بوٹ مل سکتی ہے اور کم کرایہ پر۔'' اب نوشین نے اسے گھور کر دیکھا کاردار کو یہ سب کیسے معلوم ہوا وہ کیوں ہلیرا کی بوٹ حاصل کرنا چاہتا تھا کاردار اس رات شیمان گڑھی کی ہٹ میں موجود تھا جب وہ حادثے کی جگہ پہنچی تو وہ ہلیرا کی لاش پر جھکا ہوا تھا کیا یہ سب اتفاق تھا۔'' کیا خیال ہے نوشین۔'' وہ اس کے دوبارہ سوال پہ خیالوں سے چونک پڑی۔

''مجھے افسوس ہے کاردار مجھے بھی ہلیرا کی بوٹ بہت پسند آئی ہے۔ میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتی۔''

''اوہ کوئی بات نہیں وہ تمہاری بھی تو دوست تھی۔''

''میں نے کہہ دیا کہ یہ میری اس سے پہلی ملاقات تھی۔'' نوشین نے جھنجلا کر کہا۔

''اوہ میں بھول گیا تھا لیکن جمیل نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے پاس کرایہ کی رسید بھی یقیناً ہلیرا نے تم کو دی ہوگی۔'' لیکن اسی لمحے ابوذر کی آمد نے نوشین کو اس گفتگو سے نجات دلا دی۔

''ہیلو مس نوشین تم یہاں کیا کر رہی ہوں کرنل الیگزینڈر تمہیں ہال میں ڈھونڈ رہے ہیں۔'' نوشین جیسے ہی ہال کی طرف چلی اسے کیرن نے پکار لیا۔

''کہاں جارہی ہوں ڈیئر؟ وہاں کرنل انتظار کر رہے ہیں۔''

''تم شاید کرنل کے ساتھ ہی ٹھہری ہو۔''

''نہیں ان کے برابر ہی میری ہاؤس بوٹ ہے شری ناتھ۔

لیکن وہ ہلیرا کے پاس تھی۔''

''ہاں۔'' نوشین نے جواب دیا۔

''ہلیرا تمہاری دوست تھی؟''

''دوست تو نہیں..... بس شناسا سا کہہ لو گزشتہ سال وہ یہاں تھی تو ملاقات ہوجاتی تھی کیا کاردار اور ہلیرا پرانے دوست تھے۔''

''مجھے پتا نہیں کیوں؟'' لیکن نوشین جواب دیے بغیر رخصت ہوگئی دوسرے دن ناشتے کے فوراً بعد ہی نوشین نے ہاؤس بوٹ کی تلاشی لینی شروع کردی تمام الماریوں اور ممکن جگہوں پر دیکھنے کے بعد جب کچھ نہ ملا تو وہ کتابوں کے ریک کی طرف متوجہ ہوئی اسے یقین تھا کہ ہلیرا نے کوئی تفصیلی رپورٹ یا پیغام چھپایا ہوگا ممکن ہے کوئی ڈائری یا خط اس نے ایک ایک کرکے تمام کتابیں دیکھنا شروع کیں بعض کتابوں پر ہلیرا کے دستخط تھے ان کو نکال نکال کر وہ الگ رکھتی گئی۔ وہ احتیاط کے ساتھ کتابوں کی جلد اور صفحات دیکھ رہی تھی کہ اچانک کار کے ہارن نے اسے چونکا دیا برابر رکھی ہوئی کتاب کو اس نے جلدی سے صوفے کے نیچے چھپا دیا وہ جیسے ہی دروازے پر پہنچی مس کیرن آتی ہوئی نظر آئی۔

''اوہ نوشین میں سمجھی تم نہیں ہو۔

''اندر آجاؤ۔'' نوشین نے کہا۔ وہ کافی دیر تک باتیں کرتی رہی خاصی خوب صورت بوٹ ہے کیرن نے جائزہ لیتے ہوئے کہا گفتگو کا موضوع گھوم پھر کر ہلیرا پر آجاتا مجھے آج نہ جانے کیوں بڑی پیاس لگ رہی ہے کیرن نے کہا۔

''میں بے حد شرمندہ ہوں۔'' نوشین نے جلدی سے کہا ''باتوں میں خیال ہی نہ رہا کیا پیو گی؟''

''اگر کولڈ کافی مل جائے تو لیکن تم زحمت نہ کرو۔

ارے زحمت کس بات کی میں ابھی منگواتی ہوں۔''

نوشین کے کھانے پینے کا انتظام کرنل الیگزینڈر نے بضد اپنے ساتھ کیا تھا۔ اس لیے وہ جلدی سے بھاگ کر کرنل کی ہاؤس بوٹ تک گئی اور بشیر کو کافی کا آرڈر دے کر فوراً واپس آئی لیکن اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹک گئی کیرن ان کتابوں کو دیکھ رہی تھی جسے نوشین نے صوفے کے نیچے چھپایا تھا.....

''اوہ تم آگئیں۔'' کیرین نے چونک کر کہا۔''

یہ صوفے کے نیچے کتابیں کس نے چھپائیں تھیں۔ تمہارا کتا انہیں بچوں سے باہر نکال رہا تھا۔'' نوشین نے چیکو کی طرف دیکھا جو معصومیت سے کھڑا دم ہلا رہا تھا۔

''شاید مانجھی نے صفائی کرتے ہوئے نیچے ڈال دی ہوں۔'' نوشین نے کہا۔

''لیکن یہ ساری کتابیں ہلیرا کی ہیں شاید وہ نیچے رکھ کر بھول گئی ہو۔''

نوشین نے کوئی جواب نہ دیا سوچ رہی تھی کہ اچانک سب کو بوٹ سے دلچسپی کیوں ہونے لگی بشیر کافی لے کر آ گیا وہ دیر تک جے پور کے قدرتی حسن کے بارے میں گفتگو کرتی رہیں پھر اچانک کیرن نے کہا۔

''میرے دوست نے صبح مجھ سے اس ہاؤس بوٹ کے بارے میں پوچھا ہلیرا نے اس سے معاہدہ کیا تھا کہ ڈیز ختم ہونے کے بعد وہ اس بوٹ کو اسے دے دے گی۔ لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ بوٹ تم نے لے لی ہے تو اسے بڑی مایوسی ہوئی لیکن میں نے اس سے کہا کہ نوشین کو اس بوٹ سے کوئی دلچسپی نہیں اگر وہ کسی دوسرے اچھی بوٹ کا.....''

نوشین کو اب واقعی غصہ آ گیا۔

''نہیں میں یہ بوٹ چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی'' نوشین نے بات کاٹ کر کہا۔ ''آخر کاردار کو اس بوٹ سے کیا دلچسپی ہے؟''

''کاردار کو؟ کیرن نے حیران ہو کر کہا۔ ''کیا وہ بھی اسے حاصل کرنا چاہتا ہے؟''

''کیا مطلب؟'' نوشین نے حیرت سے کہا۔ ''تم کسی اور کے لیے اوہ۔ آئی ایم ساری کیرن۔''

''نہیں کوئی بات نہیں۔'' کیرن نے جلدی سے کہا ''کاردار یہ بوٹ کیوں چاہتا ہے؟''

''پتا نہیں اس نے رات مجھ سے بہت اصرار کیا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔

''اور تم اسے کسی دوسرے کو بھی نہ دو گی؟''

''مجھے افسوس ہے کیرن لیکن یہ بوٹ مجھے پسند آ گئی ہے۔

''لیکن کیوں؟'' کیونکہ یہ بوٹ میں نے ایک ایسی دوست سے لی ہے جو مر چکی ہے۔ ہلیرا۔''

''اوہ ہلیرا! یہ بوٹ اس کی تھی؟''

''ہاں..... میں صرف چند روز یہاں رہوں گی اس کے بعد جس کی مرضی ہو اسے لے لے۔''

''اوہ کوئی بات نہیں۔'' کیرن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''تم کو اس بوٹ پر ڈر نہیں لگتا''

''ڈر کس بات سے؟''

ہلیرا کی موت جس انداز میں واقع ہوئی اس کے بعد تو یہاں میں کبھی نہ رہتی سوچو نا کیا یہ خطرناک نہیں ہے۔'' نوشین نے غصے سے اسے گھورا۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟''

کیرن معنی خیز انداز میں ہنسی۔ ''چلو جانے دو لیکن اگر تمہارا ارادہ بدل جائے تو ریزیڈینسی میں مل سکتی ہوں۔'' کیرن چلی گئی نوشین کئی منٹ تک بیٹھی سوچتی رہی کیا کیرن نے اسے دھمکی دی تھی؟ وہ حیران تھی کہ یہ اسرار کیا ہے۔ جب تک یہ بوٹ خالی تھی کسی نے اس میں دلچسپی نہ لی لیکن اس کے یہاں آنے کے بعد پھر اچانک وہ سمجھ گئی۔

اس کی آمد کے بعد ہی ان کو یہ احساس ہوا ہوگا کہ وہ راز یہیں پوشیدہ ہے۔ خوف کی ایک تیز لہر نوشین کے بدن میں دوڑ گئی۔ جھیل کی ہموار سطح پر چمکی ہوئی سورج کی آخری کرنیں بھی شام کے دھندلکے میں غائب ہو گئیں۔ ایک پرسکون سا سناٹا ہر سمت طاری ہو گیا دور اکا دکا تیرتے ہوئے شکاروں کے بادبانوں کے علاوہ ہر چیز ساکت نظر آ رہی تھی۔ نوشین نے کافی کا آخری گھونٹ لے کر ایک انگڑائی لی آج وہ واقعی بہت تھک گئی تھی تمام دن شالیمار گارڈن، جہلم کے کنارے اور دوسرے مقامات پر انہوں نے سیر کی دوپہر کا کھانا کرنل کی ہاؤس بوٹ کے پر کھایا اور اب وہ کرنل کی ہاؤس بوٹ کے عرشے پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''کیا نیند آرہی ہے ڈیئر۔'' مسز کیتھین نے پوچھا۔

''ہاں آج میں بہت تھک گئی ہوں۔'' نوشین نے جواب دیا۔ ''اب آرام کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ تم رات میں اکیلی گھبراتی ہوگی میرا خیال ہے آج یہیں سو جاؤ۔''

''شکریہ نوشین نے کہا۔'' میں بچپن سے تنہائی کی عادی ہوں۔''

مسز کیتھین نے شفقت سے نوشین کا ہاتھ دبایا۔

''ہم جانتے ہیں ڈارلنگ بریگیڈیر اکثر تمہارے والدین کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔''

''اب چلوں گی.....'' نوشین نے کہا۔

''ارے کھانا تو کھالو.....''

''بھوک بالکل نہیں ہے۔'' نوشین نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے دن بھر تو کھلایا ہے۔ چیکو..... چیکو.....'' اس نے آواز دی۔

چیکو جھاڑیوں کے درمیان سے بھاگتا ہوا آیا تو زبان سے منہ چاٹ رہا تھا۔ اوہ بدتمیز گندے تو نے آج پھر کچھ کھایا ہے وہاں جھاڑیوں میں کیا تھا؟'' لیکن کتا شرمندگی سے دم ہلاتا رہا۔

☆☆☆

نوشین اچھل کر بستر پر بیٹھ گئی اس کی آنکھ اچانک کھل گئی تھی آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور تیز ہواؤں کے جھکڑ سے کشتی ہل رہی تھی اور اچانک نوشین کو خیال آیا کہ بوٹ میں مکمل تاریکی تھی۔ حالانکہ اس نے بیٹری کی لائٹ جلتی ہوئی چھوڑی تھی۔ شاید بجلی فیل ہوگئی ہو۔ خوف سے اس کا دل زور زور سے اچھل رہا تھا وہ حیران تھی کہ اچانک آنکھ کیوں کھل گئی۔ اور دوسرے ہی لمحے اسے معلوم ہوا کہ کشتی ہلی تھی اور پھر اس کے بعد ڈرائنگ روم کی کھڑکی کھلنے کی آواز آئی آواز بہت آہستہ تھی لیکن نوشین کے منتظر کانوں نے اسے سن لیا کوئی اندر داخل ہو رہا تھا وہ سانس روکے ہوئے سنتی رہی اور پھر کھڑکی سے کوئی اندر کود الکڑی کے فرش پر ہلکی سی چرچراہٹ ہوئی نوشین دہشت زدہ ہو کر فرش سے اٹھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یا کرے۔ کرنل الیگزینڈر کی بوٹ صرف چند قدم کے فاصلے پر لنگر انداز تھی اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا لیکن خوف سے آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ کوئی دبے قدموں چل رہا تھا اچانک اسے کتے کا خیال آیا۔ وہ بھونک کیوں نہیں رہا۔ گھبرا کر اس نے صوفے پر ٹٹولا۔ چیکو کا ملائم جسم اس کے ہاتھوں سے ٹکرایا۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے زور سے چیکو کو جھنجھوڑا لیکن وہ ساکت پڑا رہا۔

میرے خدایہ بھی بے ہوش ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ شام کو چیکو جھاڑیوں میں سے منہ چاٹتا ہوا برآمد ہوا تھا۔ کسی نے اسے کچھ کھلا دیا ہے گھبرا کر وہ آگے بڑھی تاریکی میں وہ اندازے سے ڈرائنگ روم کی سمت بڑھ رہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا باقاعدہ تیاری سے آیا تھا اور نوشین کی نگاہوں میں ہلیر اکا انجام رقص کر رہا تھا۔ اس کے پیر کسی چیز سے ٹکرائے اور وہ سہم کر وہیں کھڑی ہوگئی۔

''مجھے ذرا بھی جنبش نہیں کرنی چاہیے ورنہ اسے میری موجودگی کا علم ہوجائے گا۔'' نوشین نے سوچا اور پھر کوئی بیڈروم میں داخل ہوا۔ درمیان میں منکوں کی لڑیوں والا پردہ ہلکی سی آواز سے ہلا تھا۔ وہ دم بخود کھڑی رہی۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ کوئی بالکل قریب کھڑا ہے اور پھر اس سے پہلے کہ نوشین پیچھے ہٹتی کسی کا مضبوط ہوتھ اس کے ننگے بازوؤں سے ٹکرایا۔

نوشین کی گھٹی ہوئی خوف زدہ چیخ فضا میں بلند ہوئی۔

اچانک ٹارچ کی تیز روشنی اس کے چہرے پر پڑی اور کسی نے اپنے بازوؤں میں گھسیٹ کر منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''خدا کے لیے نوشین چپ رہو۔''

نوشین نے خود کو چھڑانے کی جدوجہد کی لیکن گرفت اتنی مضبوط تھی کہ کامیاب نہ ہوسکی۔ اس نے حملہ آور کے بازو میں مچلتے ہوئے اس کے ہاتھ پر دانت گاڑھ دیے۔

درد سے کراہ کسی نے اس کے سر کا جھٹکا دیا اور دوسرے ہی لمحے تارچ کی روشنی حملہ آور کے چہرے پر پڑی۔ نوشین حیرت سے ساکت رہ گئی۔

''تم۔''

''ہشت..... خاموش رہو۔'' کیپٹن فرخ نے سرگوشی کی۔ خوف سے نڈھال نوشین کیپٹن کے شانے پر سسکیاں لے رہی تھی۔ کیپٹن فرخ نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ نوشین کو اپنے ہونٹوں پر اس کے لبوں کی گرمی محسوس ہوئی اور چند لمحے تو وہ ہر خوف سے بے نیاز ہوگئی۔ ''کاش تم یونہی ہمیشہ میرے بازوؤں میں سمائی رہو۔'' فرخ نے آہستہ سے کہا۔ نوشین کو اچانک ہوش آیا اور وہ کسمسا کر جلدی سے الگ ہوگئی۔

''تم..... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

پہلے کچھ پہن لو ورنہ سردی لگ جائے گی۔'' فرخ نے جواب دیا اور اسے بستر پر بٹھا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس بوٹ پر ٹھہری ہوئی ہو۔'' فرخ نے کہا۔

نوشین کے ذہن میں اچانک ایک شبہ نے جنم لیا۔

''تم اگر سچ بتلا دو تو کوئی حرج ہے؟'' اس نے غصے میں کہا۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟'' فرخ نے کہا۔

''ضرورت نہ ہوتی تو بولتے کیوں۔'' نوشین نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ سرد تھا۔ ''تم ہلیرا کو کیسے جانتے ہو؟'' اس نے اچانک سوال کیا۔

فرخ چند لمحہ خاموش رہا۔

''اوہ..... تو تم اس کو جانتی ہو۔ ٹھیک ہے سنو۔ میں نے یہ بات اس وقت سمجھ لی تھی۔ جب تم اپنے ماموں جان کے گھر اس کا خط پڑھ رہی تھیں۔ میں اس کی تحریر بخوبی پہچانتا ہوں پھر میں نے تمہارے متعلق پتا چلایا۔ تم شیمان گڑھی میں تھیں۔ تمہارا کمرہ اس کے برابر تھا۔ میڈم مارتینا کی گھڑی پر بھی تمہاری انگلیوں کے نشانات تھے اور پھر تم نے یہاں آ کر اس کی ہاؤس بوٹ میں قیام کیا۔ کیا یہ سب ثبوت کافی نہیں تھا؟''

''ٹھہرو۔'' نوشین نے کہا۔ وہ میز تک اٹھ کر گئی اور پھر اپنے پرس سے کچھ نکال کر واپس آئی اور پھر اس نے کیپٹن کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ اس پر ہلیرا کی ریسٹ واچ چمک رہی تھی۔

''ہلیرا کی ہے تم اسے لے سکتے ہو۔''

''تو تم کو سب معلوم ہے۔'' اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ''لیکن اس طرح تو تمہاری زندگی کو خطرہ ہے۔ میرے خدا تم یہاں تنہا اس طرح پڑی ہوئی ہو۔''

''مجھے نہیں معلوم۔'' نوشین نے کہا۔ ''سوائے چند ان باتوں کے جو ہلیرا نے مجھے بتائی تھیں۔'' اس نے تفصیل کے ساتھ ساری باتیں کیپٹن فرخ کو بتائیں۔ اور پھر صوفے پر پڑے ہوئے بے ہوش چیکو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اگر تم نے اسے کچھ نہیں کھلایا تو پھر یقیناً یہاں کوئی اور آنے کا ارادہ کرتا ہے اور.....''

''ہشت۔'' فرخ نے کہا۔ ''آہستہ بولو۔''

''میں پاگل ہو جاؤں گی۔ فرخ'' نوشین نے کہا۔ ''آخر یہ سب کیا ہے؟ ایک دو افراد بوٹ کو حاصل کرنے کی کوشش کر چکے ہو۔ آخر اس میں کیا راز ہے۔ ہلیرا کس مہم پر گئی تھی اور ان دونوں کو کیوں اور کس نے قتل کیا؟'' فرخ سوچتا رہا۔

''اس اس معاملے میں بہت گہرائی تک پھنس چکی ہو۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اور اب وہ تمہیں بھی اہم لوگوں میں شمار کرنے لگے ہیں۔ اس لیے تم سے کچھ چھپانا فضول ہوگا۔ سنو تقریباً ایک سال قبل ہمارے ایک ایجنٹ نے اطلاع دی تھی کہ ایک خطرناک سازش کا پتا چلا ہے۔ اس نے کوئی تفصیل نہیں بتلائی تھی۔ صرف ایک مخصوص اشارہ دیا تھا۔

ایک قسم کا ایس او جس کا مطلب ہے کہ انتہائی خطرہ ہے اور فوراً رابطہ قائم کیا جائے۔ جتنی جلدی ممکن ہو۔''

''مجھے معلوم ہے اس نے اپنی گھڑی بھیجی ہوگی۔'' نوشین نے جواب دیا۔''

''ہاں۔'' فرخ نے کہا۔

''پہلی گھڑی گزشتہ سال دسمبر میں جے پور سے موصول ہوئی تھی۔ ہم نے اپنے بہترین آدمی کو روانہ کیا۔ وہ میرا بہت پیارا دوست تھا۔ لیکن وہ جے پور نہیں پہنچ سکا۔ راستے میں اس کی کار کا حادثہ ہوگیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ یہ حادثہ اتفاقی نہیں لیکن خاموش رہنا پڑا۔ کیونکہ ہماری تنظیم کا انحصار مکمل راز داری پر ہے اگر ہم میں سے کوئی بھی پہچان لیا جائے تو پھر تنظیم کے لیے بے کار ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہم ایک دوسرے سے بھی رابطہ نہیں رکھتے۔ اپنے دوست کی موت کے بعد ہم کچھ دنوں کے لیے بالکل خاموش رہے پھر اسلینگ ٹیم کے ساتھ ہم نے میڈم مارٹینا کو اور ہلیرا کو دونوں کو روانہ کیا۔

میڈم ہماری بہترین ایجنٹ تھی۔ جس نے میرے دوست کی جگہ لینی تھی۔ پھر میڈم مارٹینا نے وہ اشارہ دیا۔ جس کا مطلب تھا کہ اس نے راز معلوم کر لیا ہے۔ اور کسی کو فوراً ثبوت حاصل کرنے کے لیے بھیجا جائے۔ میڈم مارٹینا کا پیغام ملتے ہی ایک ایجنٹ کو روانہ کر دیا گیا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق میڈم مارٹینا اور ہلیرا کو سرخ روشنی کا اشارہ دیا جانا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ملاقات کہاں ہونی ہے۔ ہر چیز بڑی احتیاط کے ساتھ انجام دی گئی تھی پھر بھی پتا نہیں ان کو کیسے معلوم ہوگیا۔''

''اور وہ کون تھا جسے اس ہٹ میں قتل کر دیا گیا تھا۔ ہلیرا کی اس سے ملاقات ہوگئی ہوگی۔''

''نہیں ہمارے ایجنٹ کے پہنچنے کے ایک دن قبل ہی ہلیرا قتل کر دی گئی تھی۔

تو پھر وہ جس سے ملنے گئی تھی وہ کون تھا۔''

''نہیں معلوم لیکن وہ جو کوئی بھی تھا وہی ہلیرا کا قاتل تھا۔ پتا نہیں ان کو روشنی کے اشارے کا راز کیسے معلوم ہوگیا۔''

''لیکن فرخ اس ہٹ میں کوئی آیا ضرور تھا میں نے اپنی آنکھوں سے گولی کا نشان اور خون کا دھبہ دیکھا تھا۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں نے بھی دیکھا تھا۔ لیکن وہ ہمارا آدمی نہیں تھا۔''

''تم نے دیکھا۔ تم لیکن تم؟'' فرخ مسکرایا۔

''ہاں وہاں پہنچ کر ہلیرا سے رابطہ قائم کرنے کا فرض مجھے سونپا گیا تھا اور طوفان میں جس سے تم ٹکرائی تھیں وہ میں ہی تھا۔''

''تم؟'' نوشین حیران ہو کر بولی۔ ''خدایا تم نے ہر بار مجھ سے اتنے خوف ناک انداز میں ملنے کا تہیہ کیوں کر لیا ہے؟'' فرخ مسکرایا۔

''ممکن ہے کبھی خوش گوار انداز میں ملنے کا موقع بھی آجائے گا۔'' اس نے جواب دیا۔

نوشین کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ وہ دونوں خاموش ہوگئے اور خاموشی میں اچانک وہ آواز دوبارہ سنائی دی۔ دروازہ کھلنے کی ہلکی سی چرچراہٹ ..... ہوئی وہ دونوں دم بخود ہو گئے۔ کئی لمحے بالکل خاموشی طاری رہی۔ پھر بوٹ آہستہ سے ہلی اور کوئی باہر جانے والے پختہ راستے پر آہستہ سے آگے بڑھا۔ کیپٹن پھرتی سے اٹھا اور دبے قدموں آگے بڑھا۔

دریچے کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور پھر تاریکی میں شعلہ سا لپکا۔ نوشین بھاگ کر دروازے کی سمت بڑھی اور پھر کیپٹن فرخ نے آہستہ سے کسی کو گالی دی۔

''خدا غارت کرے کمبخت انسان تھا یا چھلاوہ۔''

اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''مجھے افسوس ہے نوشین۔ باتوں میں بالکل خیال نہیں رہا تھا۔''

''کون تھا؟ کس کا خیال نہیں رہا تھا۔'' نوشین نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''کون تھا یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں لیکن ممکن ہے میری گولی نے اسے زخمی کر دیا ہو۔ کمبخت تاریکی میں

چھلاوے کی طرح تاریکی میں غائب ہوگیا۔'' اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اپنی ہتھیلی پر باندھنا شروع کیا۔ نوشین نے دیکھا کہ رومال خون سے تر ہو رہا تھا۔

''ارے تم زخمی ہوگئے ہو؟''

''کچھ نہیں شیشے سے کٹ گیا ہے فکر نہ کرو۔ بوٹ پر کوئی لالٹین نہیں ہے؟'' موم بتی کی روشنی میں نوشین نے ڈرائنگ روم کی الماری میں رکھی ہوئی لالٹین نکال کر جلائی۔

''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ کوئی ضرور آئے گا۔'' نوشین نے کہا۔

''وہ یہاں پہلے ہی موجود تھا۔'' فرخ نے لالٹین لے کر نیچری کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''ادھر دیکھو کوئی یہاں چھپا ہوا تھا۔''

اسٹور روم کے فرش پر کسی کے کیچڑ بھرے جوتوں کے واضح نشان موجود تھے فرخ نے کچھ سونگھنے کی کوشش کی۔

''تم کو کچھ محسوس ہو رہا ہے۔ نوشین..... بو۔''

نوشین نے پہلی بار کمرے میں پھیلی ہوئی بو محسوس کی میٹھی میٹھی بھینی بھینی سی بو..... اس نے پہلے کبھی بھی کہیں پھر اچانک اسے سالم ہل کی وہ ویران ہٹ یاد آئی بالکل ایسی ہی بو اس نے وہاں بھی محسوس کی تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

''اوہ ..... میرے خدا میرے دل کانپ رہا ہے۔'' اس نے فرخ کے بازوؤں کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

''بالکل ایسی ہی بو جیسی اس ہٹ میں تھی۔''

''ہاں.....'' نوشین نے آہستہ سے کہا۔ وہ دونوں بیڈ روم میں آگئے۔

''تم پستول چلانا جانتی ہو؟'' فرخ نے پوچھا۔

''ہاں..... ماموں جان نے باقاعدہ سکھایا تھا۔''

''تو اس کو اپنے پاس رکھو۔ سائیلنسر چڑھا ہوا ہے۔ میں بھی آتا ہوں۔'' نوشین بستر پر لیٹ گئی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد کیپٹن واپس آگیا اس کے کپڑوں پر جگہ جگہ گھاس اور مٹی لگی ہوئی تھی۔

''کچھ پتا چلا؟''

''ہاں تمہاری بجلی کا تار کٹا ہوا ہے۔ ناگم برج پر ایک کار کھڑی تھی جو ذرا دیر قبل بڑی تیزی سے جے پور روڈ پر جاتی ہوئی دیکھی گئی تھی۔ لیکن ضروری نہیں کہ وہ اس کار میں گیا ہو سوال یہ ہے کہ وہ کب سے یہاں چھپا ہوا ہے اور اس نے ہماری کتنی گفتگو سنی ہے۔''

''پتا نہیں لیکن ان کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہلیرا نے اس بوٹ میں کچھ چھپا رکھا ہے۔'' نوشین نے کہا۔ ''اگر وہ جانتے تھے تو میرے آنے سے پہلے تلاش کر لیتے۔''

''ہاں مجھے خود بھی یہی خیال آیا تھا۔'' فرخ نے کہا۔ ''لیکن میرا خیال ہے انہوں نے ہلیرا کے مرنے کے بعد اس بوٹ کی تلاشی ..... لی ہوگی۔ لیکن اس وقت ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہاں کوئی چیز پوشیدہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس بوٹ کا ایک ایک تختہ اکھاڑ ڈالتے۔ اس بوٹ کی اہمیت کا احساس انہیں تمہاری آمد کے بعد ہوا تھا۔ کیونکہ تم پہلے سے ان کی نظر میں تھیں۔

''ہلیرا نے اپنے خط میں کچھ نہیں لکھا کہ وہ کیا چیز ہے اور کہاں پوشیدہ ہے۔ نوشین نے کہا۔ ''اور یہ راز اب کسی کو بھی نہیں معلوم۔''

''سوائے اس ہاؤس بوٹ کے۔'' فرخ نے کہا۔ ''یہ بتلاؤ ہلیرا نے جو خط تم کو بھیجا تھا اس کا لفافہ کھلا ہوا تھا؟''

''نہیں اور مجھے یقین ہے کہ اس کا علم کسی کو نہیں کیونکہ وہ ہوٹل سے براہ راست آیا تھا لیکن تم کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ خط ہلیرا کا ہی تھا؟''

''تم اس کو پڑھنے میں اتنی محو تھیں کہ میں دلچسپی لیے بغیر نہ رہ سکا اور میں نے قریب آکر دیکھ لیا۔ ہلیرا کی تحریر میں پہچانتا ہوں۔''

''اوہ.....خدایہ سب کچھ کتنا الجھا ہوا ہے کہ میرا سر چکرا رہا ہے۔''

''تم اب آرام کرو۔'' فرخ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''پستول اپنے پاس ہر وقت رکھنا ڈرنا نہیں۔ میرے آدمی ہر سمت سے تمہاری بوٹ کی نگرانی کر رہے ہیں۔ تمہاری ایک آواز پر پہنچ جائیں گے۔ میں بعد میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ کل ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔''

کنارے پر جھاڑیوں میں سے کسی نے سیٹی بجائی۔ ''کریم تمہارے بالکل قریب ہے۔'' اس نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

کرنل الیگزینڈر اس دن خرید وفروخت کا پروگرام بنایا تھا۔ جے پور میں قاسم خان نوادرات کا سب سے بڑا تاجر ہے۔ راستے میں کلب سے ابوذر اور کاردار بھی ان کے ہمراہ ہو لیے تھے۔ قاسم خان کے یہاں علاقائی دستکاری کے خوب صورت نمونوں کا بڑا نادر ذخیرہ تھا۔ کشیدہ کار، نقش ونگار والے لکڑی کے برتن اور فرنیچر سنہری کام والے جیکٹ اور چپل ان تمام چیزوں کے انبار میں وہ گم ہوگئے۔

نوشین کو ان چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ہاتھی دانت کے کام کا ایک بڑا ڈبا اور چند دوسری چیزوں کو پسند کیا۔ وہ ابھی خریداری میں مصروف تھے کہ کیپٹن فرخ اور کیرن بھی وہاں پہنچ گئے۔ نوشین کو دیکھ کر فرخ نے زور سے کہا۔

''ہیلو نوشین تم یہاں کب آئیں؟''

''ہیلو فرخ۔'' نوشین نے بظاہر خوش ہو کر جواب دیا۔ ''میں تو کئی دن قبل کرنل کے ہمراہ آئی ہوں۔''

''کرنل خوش قسمت ہیں۔'' فرخ نے کہا۔

''اے کیپٹن! آج کل نوشین میری نگرانی میں ہے۔'' مسز لیتھین نے ہنس کر کہا۔ وہ سب ہنسنے لگے۔ قاسم خان نے ان کے لیے قہوہ منگوالیا تھا۔ کرسیوں پر بیٹھ کر وہ قہوہ پینے لگے تھے۔ اسی دوران قاسم خان ایک پیکٹ لے کر آیا۔

''یہ مہمانوں کو میری طرف سے تحفہ ہے۔'' اس نے لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے ماچس کیس سب کو پیش کیے۔ جن پر ہاتھی دانت کے نقش پھول بنے ہوئے تھے۔ نوشین مہکتی ہوئی برابر والے کمرے میں داخل ہوئی جہاں مختلف اشیاء کا انبار تھا۔ سامنے منکوں کی لڑیوں کا خوب صورت پردہ پڑا ہوا تھا۔ نوشین پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئی۔ یہ ایک مختصر سا کمرہ تھا۔ جس میں لکڑی کی دستکاری کے مختلف سامان ریک میں سجا کر رکھا گیا تھا۔ کمرے کا ایک بلند دریچہ سامنے پل کی سمت کھلتا تھا اور سامنے ایک اور دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ اس کے اندر نیم تاریکی میں۔ اسے ایک زینہ نظر آرہا تھا۔ جو اوپر جاتا تھا۔ اچانک نوشین کا دل خوف سے لرز اٹھا وہ بوٹسیماں گھڑی کی ہٹ میں رات کو اسٹور روم میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں بھی تھی ہلکی لیکن واضح۔ ایک لمحہ کو نوشین کانپ اٹھی۔ یہاں وہ بالکل تنہا تھی اور کسی کو پتا نہیں تھا کہ وہ یہاں ہے۔

پشت پر ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ نوشین اچھل کر پلٹی دوسرے ہی لمحے وہ کیپٹن کے بازوؤں میں تھی۔

''فرخ وہ بو یہاں بھی ہے۔'' جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی فرخ نے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ دیے۔ اچانک کوئی زور سے کھنکارا نوشین تڑپ کر فرخ کے ہاتھوں سے الگ ہوئی۔ میجر ہیلوٹ تاریک کمرے سے باہر نکلا اور مسکراتا ہوا ان کے برابر سے گزر گیا۔

''تم بہت بدتمیز ہوتے جارہے ہو۔'' نوشین نے غصے میں کہا۔

''تم کو اس طرح یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' فرخ نے آہستہ سے کہا۔

''یہ جگہ خطرناک ہے چلو سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' نوشین مزید کچھ نہ پوچھ سکی اوپر پہنچ کر اسے اچانک یاد آیا۔

''اوہ.....میرا پرس میں کہیں بھول گئی۔''

''یہ تو نہیں ہے؟'' کرنل الیگزینڈر تے میز کے

پیچھے سے ایک سفید پرس اسے نکال کر دیا۔
''اوہ تھینک یو۔'' نوشین نے کہا۔
قاسم خان کے شوروم سے وہ سیدھے نیڈ ورز ہوٹل پہنچے۔ لنچ پر ان کو ابوذر مدعو کیا تھا۔ کھانے کے بعد جب وہ کافی پی رہے تھے۔ تو نوشین ٹہلتی ہوئی ہال روم میں آگئی۔ اسے آج ہلیرا بہت یاد آرہی تھی۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو شاید فرخ کے ساتھ نوشین کے بجائے وہ ہوتی۔ ہال روم اس وقت بالکل خالی تھا۔ اسٹیج پر رکھے ہوئے بینڈ کے سامان کے پیچھے ایک دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ اچانک پردے کو جنبش ہوئی نوشین چونک پڑی۔ کوئی پردے کے پیچھے موجود تھا۔ بالکل غیر ارادی طور پر وہ تیزی سے آگے بڑھی کسی کے قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ نوشین نے پردہ ہٹایا۔ ایک زینہ پیچھے کی طرف گیا تھا۔ اور آخری سیڑھی سے اترتے ہوئے اس شخص نے اچانک اوپر دیکھا۔
نوشین نے اسے فوراً پہچان لیا ذرا دیر قبل وہ اسے دیکھ چکی تھی۔ سر پر پگڑی باندھے ذرا شلوار اور کرتے میں ملبوس یہ قاسم خان کا وہ ملازم تھا جسے اس نے دکان پر دیکھا تھا۔
''نوشین۔'' وہ اچھل پڑی برابر میں فرخ کھڑا تھا۔ ''وہ، وہ۔''
''ہشت.....!'' فرخ نے آہستہ سے کہا۔ ''باہر چلو تم یہاں کیوں آگئی تھیں؟''
''لیکن وہ ملازم وہ یہاں کیا کر رہا تھا۔'' فرخ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد نوشین کرنل کے ہمراہ اپنی بوٹ پر واپس آگئی۔
شام کو جب وہ چائے پی رہے تھے۔ خلاف توقع کیپٹن فرخ بھی کرنل کے ہاؤس بوٹ پر پہنچ گیا۔ اس کو دیکھ کر مسز کیتھین معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔
''مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گے۔'' مسز کیتھین نے نوشین کی طرف دیکھ کر کہا۔ نوشین کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔
''میں آپ لوگوں کو دعوت دینے آیا ہوں۔''
کیپٹن نے کہا۔ ''آج رات میں نے کلب میں دوستوں کو دعوت دی ہے جس کے بعد رقص کا پروگرام ہے۔'' اس نے کہا۔ ''آپ سب کو شرکت کرنا ہے۔''
''بھئی میں تو معذرت چاہوں گا۔'' کرنل الیگزینڈر نے کہا۔ ''آج کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہاں کیتھین اور نوشین کو لے جاؤ۔''
''اوہ نو پلیز۔'' مسز کیتھین نے کہا۔ ''میں تم دونوں کو تنہائی میں مخل نہیں ہوں گی تم نوشین کو لے جاؤ۔''
''یہ آپ نے مشورہ دیا ہے یا حکم۔'' نوشین نے مسکرا کر پوچھا۔
''اس وقت تم حکم ہی سمجھو۔'' مسز کیتھین نے پیار سے کہا۔ شیر چائے لے آیا۔ وہ کچھ دیر عرشے پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر کیپٹن نے نوشین کی طرف دیکھا۔ ''تم لباس تبدیل کر لو تو چلیں۔'' نوشین جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو چیکو بھی تیار ہوگیا۔
''کرنل آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن چیکو کو اپنے پاس رکھ لیجیے۔ میں واپس آکر لے جاؤں گی۔ یہ تنہائی میں بھونک بھونک کر مصیبت کر دیتا ہے۔''
گھاٹ سے پل کی طرف جاتے ہوئے کیپٹن نے نوشین کی طرف دیکھا وہ سیاہ لباس میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔
''میں ڈر رہا تھا کہ کہیں کرنل دعوت قبول نہ کرلیں۔''
''کیوں؟''
''آج رات مجھے تمہاری واقعی ضروری ہے۔''
''کیا مطلب ہوش میں تو ہو؟''
''نجانے لڑکیاں ہر بات کا ایک ہی مفہوم کیوں لیتی ہیں۔'' فرخ نے ہنس کر کہا۔ ''بات یہ ہے کہ آج مجھے جھیل میں واقع ٹاپو پر جانا ہے۔ اگر میں تنہا جاؤں گا تو لوگوں کو شبہ ہوگا۔ لیکن اگر ہم دونوں شکارے پر چاندنی رات میں جھیل پر تفریح کریں گے تو لوگ شک نہ کریں گے۔''
''ٹاپو پر کیا کام ہے؟'' نوشین نے دلچسپی لیتے

ہوئے پوچھا۔

"میرا ایک آدمی جس سے تم مل چکی ہو۔ ملاقات کرنا چاہتا ہے۔"

"میں مل چکی ہوں؟"

"ہاں ......تم نے اسے ڈرا دیا تھا۔ نیڈوز ہوٹل کے اسٹیج کے پردے پر وہ مجھ سے ملنے آیا تھا...... قاسم خان کی دکان پر بلا سبب نہیں گیا تھا۔ قیوم نے مجھے ملنے کا اشارہ کیا تھا۔ اسی لیے میں نے نیدوز ہوٹل میں لنچ کا ذکر کیا تھا۔"

"اور اگر کسی نے اسے آتے ہوئے دیکھ لیا ہو تو؟"

"ہم نے ہر ممکن احتیاط کی تھی۔ وہ کھانے کے وقفے میں آیا تھا۔ قیوم بڑے کام کا آدمی ہے۔" فرخ نے کہا۔ "اس نے بتلایا کہ آج قاسم خان کی دوکان پر کوئی اہم پیغام پہنچانے کی بات ہو رہی تھی۔ لیکن وہ پوری بات نہ سن سکا۔ قاسم خان کی دوکان بہت سے ناجائز کاموں کا مرکز ہے۔ قیوم رات کو گیارہ بجے ٹاپو پر میرا انتظار کرے گا۔"

کلب میں سب ان کے منتظر تھے۔ نوشین وہاں کی چہل پہل میں گم ہو کر ایک لمحہ کو تمام پریشانیوں بھول گئی۔ ڈنر کے بعد جب ڈانس شروع ہوا۔ تو وہ لاونج میں فرخ کے ساتھ کافی پینے بیٹھ گئی۔ فرخ نے گھڑی دیکھی دس بج رہے تھے۔

"تم رقص میں شریک نہیں ہوگی؟"

"نہیں مجھے الجھن ہوتی ہے۔" نوشین نے اپنا پرس کھول کر رومال نکالا کوئی چیز نیچے گری۔ فرخ نے اسے جھک کر اٹھالیا۔ یہ وہی ماچس کیس تھا۔ جو قاسم خان نے سب کو تحفے میں دیا تھا۔ فرخ اسے غور سے دیکھنے لگا۔

"تم پر اس نے خاص عنایت کی ہے۔" فرخ نے کہا۔ "کیس میں ماچس بھی موجود ہے ہم سب کے کیس خالی تھے۔"

نوشین نے ماچس کیس لے کر غور سے دیکھا۔

"لیکن یہ میرا نہیں۔" اس نے کہا۔ "مجھے جو کیس اس نے دیا تھا وہ خالی تھا اور اس پر یہ پھول نہیں پرندہ بنا ہوا تھا۔"

"تو پھر؟" اچانک فرخ نے کیس اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ "کہیں ایسا تو نہیں۔" اس نے ماچس کی ڈبیہ کھولتے ہوئے کہا۔ "مائی گاڈ۔ نوشین نے حیرت سے دیکھا ڈبیہ کے اندر سے تیلیوں کے بجائے ایک چھوٹا سا پرچا برآمد ہوا تھا۔" کیا بات ہے۔ اس میں کیا لکھا ہوا ہے؟" نوشین نے جلدی سے پوچھا۔

"بتوں سے تجھ کو امیدیں۔ خدا سے ناامیدی۔ لیکن اس کا کیا مطلب ہوا؟" فرخ نے حیرانے کے ساتھ کہا۔

"کیا یہ پیغام ہے؟"

"بلاشبہ۔ لیکن ان الفاظ میں کیا مطلب پوشیدہ ہے۔ بظاہر یہ کوڈ معلوم ہوتا ہے لیکن یہ کس کے لیے ہے؟" فرخ نے اچانک پوچھا۔

"کچھ پتا نہیں۔ اور حیرت یہ ہے کہ میرے بیگ میں کیسے آ گیا۔" نوشین نے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ دکان میں غلطی سے بدل گیا ہے۔ تمہیں یاد ہے سب نے اپنے اپنے تحفے میز پر رکھ دیے تھے۔ تم نے نادانستگی میں کسی اور کا کیس اٹھا لیا ہوگا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہ ہم لوگوں میں سے کسی ایک کے لیے تھا۔" نوشین نے کہا۔ "میرے خدا اس کا مطلب تو یہ ہوا۔"

"بلاشبہ ہم میں سے کوئی ایک ہے۔ لیکن کون؟ وہاں ہم دونوں کے علاوہ۔ میجر ہیلوٹ کاردار، کیرن ......کرنل الیگزینڈرر......مسز تھین کے علاوہ اور کون تھا۔" فرخ نے کہا۔ "اور جو بھی تھا اب تک یہ اندازہ کر چکا ہوگا کہ یہ پرچا غلطی سے ہم مین سے کسی کے پاس پہنچ چکا ہے۔"

"لیکن اسے یہ کیسے معلوم ہوگا کہ کس کے پاس؟"

"خدا نہ کرے۔ اسے معلوم ہو جائے۔" فرخ نے فکر مند لہجے میں کہا۔ "لاؤ یہ مجھے دے دو تمہارے

WaqarAzeem Pakistanipoint

پاس اس کا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔'' ساڑھے دس بجے فرخ نے گھڑی دیکھی۔ ''اب ہمیں چلنا چاہیے راستہ کم از کم بیس منٹ کا ہے۔ اور قیوم وقت کا بہت پابند ہے۔''

''میں ایک میں آئی ذرا باتھ روم میں ہو آؤں۔''

☆☆☆

''شکارا آہستہ آہستہ جھیل کے سینے پر تیر رہا تھا۔ وہ دونوں گدے دار آرام دہ کرسیوں پر ایک دوسرے کے بالکل قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ چاندنی میں جھیل کی سطح چاندنی کی طرح چمک رہی تھی۔ ہر سمت پر سکون خاموشی طاری تھی۔ اکا دکا شکارے ان کے قریب سے گزرتے رہے گھاٹ سے گزر کر ایک مزار کے قریب سے ہوتے ہوئے جھیل کے درمیان جا رہے تھے۔ جب کنارے سے کافی دور پہنچ تو کیپٹن فرخ نے شکارے کو تیز رفتاری سے چلانے کا حکم دیا۔ چپوؤں کا شور اس رومان پرور ماحول میں نوشین کو بڑا خوش گوار لگ رہا تھا۔

''اتنی رات کو تمہارا وہاں تنہا جانا خطرناک نہیں ہوگا۔'' نوشین نے آہستہ سے پوچھا۔

''ہم تنہا نہیں ہیں۔'' فرخ نے کہا۔ ''شکارے پر تمام لوگ میرے تربیت یافتہ آدمی ہیں۔'' تھوڑی دیر کے بعد انہیں جھیل کے درمیان ایک تاریک سا دھبہ نظر آنے لگا۔ جیسے جیسے وہ قریب پہنچ رہے تھے۔ نوشین کا دل کسی انجانے خوف سے لرز رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس بار بار خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ ذرا دیر بعد ٹاپو صاف نظر آنے لگا۔ فرخ بہت انہماک کے ساتھ کچھ سن رہا تھا۔ اچانک کسی موٹر بوٹ کے انجن کی آواز سنائی دی۔ فرخ نے آہستہ سے کچھ ہدایت دی۔ چپوؤں کی آواز مدھم پڑ گئی۔ کنارہ اب بالکل قریب آچکا تھا نوشین نے کچھ فاصلے پر ایک اور شکارے کو لنگر انداز دیکھا۔ ان کا شکارا جیسے ہی کنارے سے لگا۔ کیپٹن کود کر نیچے اترا نوشین نے اس کی تقلید کی اپنے آدمیوں کو انتظار کی ہدایت دے کر فرخ نے نوشین کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھا۔ ایک بہت مختصر سا ٹاپو تھا۔ جو مشکل سے تین چار سو گز کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ چاروں طرف چنار اور دیوار کے بڑے بڑے درخت تھے۔ خوب صورت سے پارک اور پھولوں کی کیاریوں کے درمیان مغلیہ طرز کی ایک چھوٹی سی دو منزلہ عمارت بنی ہوئی تھی۔ سیاحوں کی تفریح کے لیے یہ بڑی خوب صورت جگہ تھی۔

لیکن پورے ٹاپو پر انہیں کوئی بھی نہ ملا۔ قیوم کا کہیں پتا نہ تھا۔

''تعجب ہے۔'' فرخ نے سوچتے ہوئے گھڑی دیکھی۔ قیوم وقت کا بہت پابند ہے۔

''ہم بیس منٹ لیٹ ہیں۔'' نوشین نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ انتظار کر کے چلا نہ گیا ہو۔''

''فرخ نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی اور اس کی گھڑی دیکھنے لگا۔

''مائی گاڈ۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''کیا ہوا۔'' نوشین نے گھبرا کر کہا۔

''کسی نے میری گھڑی لیٹ کر دی ہے۔'' اس نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

''لیکن کیسے؟''

''کچھ پتا نہیں میں نے گھڑی کہیں اتاری بھی نہ تھی۔ کرنل الیگزینڈر کی ہاؤس بوٹ پر جب میں باتھ روم گیا تھا۔ لیکن.....''

''تمہارے خیال میں قیوم واپس چلا گیا۔''

''نہیں میرے خیال میں اب وہ کبھی واپس نہ جائے گا۔ تم یہیں ٹھہرو۔''

کیپٹن فرخ کا خیال غلط نہیں تھا۔ چنار کے ایک درخت کے نیچے ان کو قیوم کی لاش مل گئی۔ وہ منہ کے بل گرا ہوا تھا اور پشت پر دستے تک خنجر اس کے جسم میں پیوست تھا۔ کیپٹن فرخ نے نبض دیکھی۔ وہ مر چکا تھا لیکن اس کا جسم ابھی گرم تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے ابھی مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اچانک فرخ کو موٹر بوٹ کا خیال آیا۔

فرخ جب نوشین کے قریب پہنچا تو وہ دہشت زدہ کھڑی تھی اس کے چہرے کا رنگ بالکل سفید ہو رہا

تھا۔ فرخ اسے سہارا نہ دیتا وہ چکرا کر گر پڑتی۔ اس نے آہستہ سے نوشین کو لان پر بٹھایا۔

''مجھے تم کو یہاں نہیں لانا چاہیے تھا۔'' فرخ نے کہا۔ ''کیوں۔''

''نہیں میں ٹھیک ہوں۔'' نوشین نے آہستہ سے کہا۔ ''نجانے میرا دل یہ کہہ رہا تھا کہ قیوم ہمیں زندہ نہ ملے گا۔''

''تم دو منٹ ٹھہرو پھر چلتے ہیں۔'' فرخ نے کہا۔

وہ لاش کے پاس جا کر قیوم کے لباس کی تلاشی لینے لگا لیکن قیوم کے پاس اگر کچھ تھا بھی تو وہ پہلے ہی ہاتھ صاف کر چکے تھے۔ اچانک فرخ کی نگاہ قیوم کے پھیلے ہوئے بائیں بازو پر پڑی۔ جس کی مٹھی بند تھی۔ اس نے آہستہ سے مٹھی کھولی قیوم کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی تصویر تھی جس پر اقبال کا یہ شعر درج تھا۔

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نا امیدی۔

کیپٹن فرخ نے وہ تصویر جیب میں رکھ لی اور نوشین کے پاس واپس آیا۔

''آؤ ہم واپس چلیں۔''

نوشین اٹھی تو اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ قیوم کی موت نے اسے بے حد خوف زدہ کر دیا تھا۔ فرخ اس کو سہارا دے رہا تھا۔

''اب کیا کرو گے فرخ۔''

''لاش کو ٹھکانے لگانے کا انتظام کرنا ہے لیکن پہلے کو تم کو ہاؤس بوٹ تک پہنچا دوں۔''

''کیا پولیس کو اطلاع نہیں دو گے۔''

''نہیں یہ راز جب تک پوشیدہ رہے بہتر ہے۔''

''فرخ! انہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ تم یہاں ملنے والے ہو۔''

''میری حماقت سے۔''

''کیا مطلب۔''

''میں احمق تھا جواب تک یہ سمجھ رہا تھا کہ ان کو مجھ پر شبہ نہیں ہے لیکن اب مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ مجھے پہچان گئے ہیں۔''

''لیکن آخر وہ ہیں کون؟ کیا تم نے اب بھی کوئی اندازہ نہیں کیا؟''

''تم مجھے احمق کہہ لو لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے وہ جو کوئی بھی ہے بلا کا شاعر ہے۔''

ان کا شکار خاموشی کے ساتھ چھوٹے گھاٹ کی طرف رواں تھا۔ چپوؤں کی آواز کے علاوہ پوری جھیل پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ چاند ہری پربت کی آڑ میں چھپنے کی تیاری کر رہا تھا۔ فرخ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ تصویر نکالی۔

''بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نا امیدی۔'' وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

''یہ کیا ہے۔''

''قیوم کی مٹھی سے گوتم بدھ کی تصویر ملی ہے اور اس پر وہی شعر تحریر ہے جو تمہاری ماچس سے نکلنے والے پرچے پر لکھا تھا۔''

''لیکن بوٹ پر تو مجھے کوئی بت نظر نہیں آیا۔''

''ہاں میں خود یہی سوچ رہا ہوں۔''

نوشین کی ہاؤس بوٹ کے پاس پہنچ شکارہ آہستہ سے لنگر انداز ہو گیا۔ نوشین نے تمام لائٹس جلتی چھوڑی تھیں لیکن اس وقت بیڈ روم کے علاوہ سب بجھی ہوئی تھیں۔ شاید ماجھی نے بجھا دی ہوں۔ نوشین نے سوچا۔ وہ اندر داخل ہوئے تو عجیب سی ویرانی طاری تھی۔ چیکو نے نوشین کو دیکھا تو اس کے قدموں سے لپٹ گیا۔ نوشین نے اسے پیار سے صوفے پر ڈال دیا۔

''مجھے ٹاپو کا بندوبست کرنا ہے۔ ورنہ یہیں ٹھہرتا۔'' فرخ نے کہا اور گھڑی دیکھی دو بج رہے تھے۔ ''کھڑکیاں اور دروازے اندر سے مقفل کر لینا۔''

''تم جاؤ میں اب آرام سے سو جاؤں گی۔'' نوشین نے کہا۔

''پستول تمہارے پاس ہے۔''

''ہاں یہ رہا۔'' نوشین نے سرہانے سے پستول نکال کر دکھایا اور مسکرا دی۔

''ذرا بھی کوئی خطرہ ہو تو بے دریغ استعمال

کرنا۔'' فرخ نے فکرمند لہجے میں کہا۔ ''ویسے تمہاری ایک آواز پر سب تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔''

''کون؟'' نوشین نے حیران سے پوچھا۔

''میرے آدمی۔ وہ آس پاس موجود ہیں اور تمہاری ہاؤس بوٹ کی نگرانی کررہے ہیں۔ کسی نے اندر آنے کی کوشش کی تو وہ پچھتائے گا۔'' فرخ نے کہا۔ ''ذرا ٹھہرو میں ابھی آیا۔''

وہ بوٹ سے اتر کر نیچے گیا۔ فوراً ہی ایک شخص سامنے کی جھاڑی سے نکل کر باہر آیا۔

''کوئی بوٹ پر تو نہیں گیا تھا۔''

''جی نہیں صاحب۔ صرف ماجھی گیا تھا اور کوئی نہیں۔''

''ٹھیک ہے ہوشیار رہنا۔''

نوشین بستر پر کروٹیں بدلتی رہی لیکن نیند آنکھوں سے غائب تھی۔ اس کا ذہن ان پراسرار واقعات میں الجھا ہوا تھا جو اس کی زندگی کا ایک حصہ بن کر رہ گئے تھے۔ اب تک وہ وہ تین بے گناہ افراد کی لاشیں دیکھ چکی تھی اور ہلیرا کی آنکھیں مرنے کے بعد بھی شاید اپنے قاتل کو پہچاننے کے لیے کھلی ہوئی تھیں۔ رات پر موت کا سکوت طاری تھا۔ تمام کھڑکیں اور دروازے بند تھے۔ اسے معلوم تھا کہ فرخ کے آدمی باہر اس کی بوٹ کی نگرانی کررہے ہیں پھر بھی نہ جانے نوشین کا دل کسی انجانے خوف سے بیٹھا جارہا تھا۔ کسی انہونی بات کے ڈر سے وہ کانپ رہی تھی۔ اس کی چھٹی حس کسی بھیانک خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی بارہا اسے یہ احساس ہورہا تھا جیسے وہ تنہا نہیں ہے۔ جیسے کسی بھی لمحے کچھ ہونے والا ہے۔ اچانک اسے ماچس سے برآمد ہونے والے پرچے کا خیال آیا۔ قیوم کے مردہ ہاتھوں سے بھی وہی پیغام ملا تھا۔ بت لیکن کون سا بت بوٹ پر اسے کوئی بت نظر نہ آیا تھا۔

اس نے ایک انگڑائی لی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر اس کے سوچا کہ اب تک کے تمام واقعات کو کاغذ پر تحریر کرے۔ شاید اس طرح سے اس معمہ کا حل نکل سکے۔ شال کو کاندھے پر ڈال کر اٹھی اور کرسی گھسیٹ کر میز کے گرد بیٹھ گئی۔ دراز سے سے کاغذ قلم نکال کر سامنے رکھ لیا اور سوچنے لگی۔ ایک ایک کرکے تمام واقعات کی تصویر اس کے ذہن میں ابھرنے لگی۔ اس کا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔ اچانک چیکو نے صوفے سے گردن اٹھائی اور اپنے کان جھٹک کر کچھ سننے لگا۔ نوشین نے اسے دیکھا اور مسکرادی، چیکو اس کا وفادار ساتھی بھی شاید اس کی بے چینی کو محسوس کررہا تھا اور پھر اچانک نوشین کی نگاہیں میز پر سامنے رکھی ہوئی اس پرانی لالٹین پر پڑیں جسے رات اس نے جلا کر وہاں رکھا تھا۔ خوشی اور حیرت سے اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

لالٹین کے شیشے پر ایک بت کی واضح تصویر تھی۔ بالکل گوتم بدھ کی طرح بالکل وہی تصویر جو قیوم کی مٹھی سے برآمد ہوئی تھی۔ نوشین نے وہ راز حل کرلیا تھا۔ عمیر کے ہاتھ میں دبی ہوئی تصویر دراصل ٹریڈ مارک تھی۔ لالٹین کا شیشہ بنانے والی کمپنی کا ٹریڈ مارک۔ شیشے پر ابھرا ہوا بت بالکل اس کے مشابہ تھا اور ہر شیشے پر کاغذ کی یہ تصویر چپکی ہوئی تھی۔ نوشین کا دل اتنی زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ اس کی سانس پھولنے لگی۔ خدایا۔ تو وہ کاغذات اسی لالٹین میں پوشیدہ ہیں؟ اور سب بیوقوف بنتے رہے؟ وہ اپنے بے ساختہ قہقہے کو نہ روک سکی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے لالٹین اٹھا کر سامنے رکھی۔

چیکو آہستہ سے بھونکا اور پھر غرانے لگا۔ نوشین بھی چونک اٹھی۔ بوٹ آہستہ سے ہلی تھی ممکن ہے مجھے وہم ہوا ہو۔ اس نے سوچا لیکن بوٹ پھر ہلی اور اس مرتبہ جنبش بہت واضح تھی۔ تختے کے چرچرانے کی آواز ہوئی۔ کوئی دبے قدموں آرہا تھا..... آہٹ بالکل واضح تھی لیکن وہ اندر نہیں آسکتا تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ قدموں کی آہٹ پھر سنائی دی اور تب نوشین کو محسوس ہوا کہ آہٹ باہر سے نہیں ڈرائنگ روم سے آرہی تھی اور کوئی ان کی آمد سے قبل ہی بوٹ میں آکر چھپ گیا تھا۔ نوشین کا حلق خوف سے خشک ہوگیا۔ اس کے ہاتھ پیروں میں سکت نہ

رہی۔ فرخ کا دیا ہوا پستول تکیے کے نیچے تھا لیکن اس میں اٹھ کر بستر تک جانے کی ہمت نہ رہی تھی۔

چیکو آہستہ سے پھر غرایا۔ اس نے بھی اجنبی کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ خوف کی شدت سے نوشین کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی وحشت زدہ نظروں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ تاریکی سے دو آنکھیں اسے گھور رہی ہیں لیکن اس میں مڑ کر پیچھے دیکھنے کی سکت نہ رہی تھی۔ تختہ پھر چرچرایا کوئی دبے قدموں آگے بڑھ رہا تھا۔ نوشین کے سامنے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر پڑا ہوا تھا جسے فرخ وہاں بھول گیا تھا۔ ہمت کر کے اس نے پیکٹ اٹھایا وہ سگریٹ کی عادی نہ تھی۔ لیکن خوف کے اس احساس کو ٹالنے کے لیے اس نے لاشعوری طور پر یہ سہارا لیا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے سگریٹ نکال کر لبوں میں دبائی۔ کلک کی آواز کے ساتھ ہی جلتا ہوا لائٹر اس کے سامنے آیا اور سگریٹ جلانے کے بعد نوشین کو اندازہ ہوا کہ یہ لائٹر اس نے نہیں جلایا تھا۔

اس کی پشت پر کسی کی گرم گرم سانسیں محسوس ہو رہی تھی اور برابر سے ایک انتہائی بھیانک ہاتھ جلتے ہوئے سگریٹ کے ساتھ اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ لیکن یہ ہاتھ کسی انسان کا نہیں۔ ڈھانچے کا تھا۔ جس پر گوشت کا نام و نشان تک نہ تھا۔

نوشین نے چیخنا چاہا لیکن حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی اور پھر وہ اچانک سامنے آ گیا۔ الیگزینڈر کرنل الیگزینڈر نوشین چیخ اٹھی۔ ”خدایا۔ تم نے میری جان نکال دی تھی۔“ نوشین کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہہ نکلے تھے اور پھر وہ ہسٹریائی انداز میں ہنسنے لگی۔ ”اوہ کرنل خدا کا شکر ہے تم ہو۔ اگر تم ایک لمحہ اور سامنے نہ آتے تو میرا ہارٹ فیل ہو جاتا۔“

اور پھر اچانک اس کی نگاہ کرنل کے ہاتھ پر پڑی جو اب تک اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا لائٹر کا شعلہ اس کی نگاہوں کے سامنے رقص کر رہا تھا اور ہاتھ پر کہنیوں تک ربڑ کا دستانہ چڑھا ہوا تھا جس پر کٹے ہوئے بھیانک پینٹ کے باعث ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ کسی ڈھانچے کا ہاتھ ہے خوف کی ایک سرد لہر نوشین کے تمام جسم میں سرایت کر گئی اور کمرہ میتھی اور بھینی بو سے بھر گیا۔ پھر وہی بو..... اور تب نوشین کو یاد آیا۔

اس نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے الیگزینڈر کو دیکھا۔

”کرنل، یہ تم مجھے اس طرح گھورے کیوں چلے جا رہے ہو؟ بات کیا ہے؟ آ کر تم بولتے کیوں نہیں؟“ کرنل نے اب تک ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ کسی درندے کی طرح نوشین کو گھورے جا رہا تھا اس کے چہرے پر جنون کی سی کیفیت طاری تھی۔

”تم بولتے کیوں نہیں؟“ نوشین دہشت زدہ انداز میں چیخی۔

کرنل جیسے کسی خواب سے چونکا اس کے لبوں پر بڑی سفاکانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”تم اس لالٹین کو کیوں دیکھ رہی تھیں؟“

”مم..... میں کچھ بھی تو نہیں۔“ اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ کرنل نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔

”جھوٹ مت بولو۔ میں اندر سے تمہاری ہر حرکت دیکھ رہا تھا۔“

کرنل نے لالٹین اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لی اور اسے غور سے دیکھتا رہا۔ نوشین نے اس کے ہاتھ پر چڑھے ہوئے دستانے کو دیکھا اور پھر اسے سالم ہل کی ہٹ میں کرسی پر پڑا ہوا ربڑ کا وہ سرخ ٹکڑا یاد آیا جسے وہ پہلے خون کا دھبہ سمجھی تھی۔ اب سب کچھ واضح ہو گیا۔

”تم..... کرنل تم نے ہلیرا کو.....“ وہ نفرت اور غصے کے باعث اپنا جملہ پورا نہ کر سکی۔

”ہاں نوشین میں نے بھی اسے قتل کیا تھا لیکن اب اس سے کوئی فائدہ نہیں میں نہیں چاہتا تھا..... لیکن تم نے خود اپنی موت کو دعوت دی ہے۔“

”اوہ کرنل تم اتنے درندہ صفت ہو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“

نوشین نے جذبات سے سسکی لیتے ہوئے کہا۔ ”مجبوری سب کچھ کرا دیتی ہے اور پھر مجھ پر کس نے رحم کھایا ہے۔“ وہ نفرت انگیز لہجے میں بولا۔ ”بیس سال

فوج کی ملازمت کے بعد ابھی کرنل ہوں۔ صرف اس لیے کہ محاذ پر ایک معمولی سی غلطی ہوگئی تھی لیکن غلطی دوسرے بھی تو کرتے ہیں۔''

''کیا یہ غلطی نہیں کہ وہ ہندوستان کو چھوڑ کر جانے کی تیار کررہے ہیں۔ لندن میں میرے پاس کیا ہے؟ کیا آخری عمر بھیک مانگ کر گزاروں گا؟'' وہ غصے میں تقریباً چیخ اٹھا۔ ''بولو۔ خاموش کیوں ہو؟ مجھے دولت کی ضرورت تھی مجھے بھی آرام دہ زندگی کا شوق ہے اور اس کے لیے میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔''

نوشین نے غور سے کرنل کو دیکھا۔ یہ وہ کرنل الیگزینڈر نہیں تھا جس کو وہ اب تک جانتی تھی۔ اس کی آنکھیں کسی وحشی جنونی کی طرح چمک رہی تھی۔

''کک..... کیا مسز تیھین یہ سب کچھ جانتی ہیں۔'' نوشین نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''نہیں وہ احمق عورت کچھ نہیں جانتی اسے تو یہ بھی نہیں پتا کہ کتنا بھیانک مستقبل سامنے کھڑا ہے۔ اسے میں نے آرام دہ نیند سلا دیا ہے۔'' وہ پاگلوں کی طرح ہنسا۔ ''وہ سو کر اٹھے تو کچھ نہ سمجھ سکے گی، لیکن تم بھی اب سو جاؤ گی۔''

نوشین کانپ اٹھی اس نے جال میں پھنسے ہوئے شکار کی طرح ادھر ادھر دیکھا پھر اس کی نگاہیں اپنے بستر پر مرکوز ہوگئیں جہاں پستول رکھا تھا کرنل نے اس کا ارادہ بھانپ لیا اور پھر اپنے لائٹر کو گھما کر اس کا بٹن دبایا کلک کی آواز کے ساتھ ایک باریک سی نالی لائٹر سے باہر آگئی اور لائٹر غیر معمولی سائز کا تھا نوشین اسے پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔

''تم پستول تک نہیں پہنچ سکو گی نوشین۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''رات مجھ سے ذرا سی غلطی ہوگئی تھی اور تمہارے کیپٹن نے مجھے رات ہی ختم کردیا ہوتا آج ایسی غلطی نہیں کروں گا اس سے پہلے کہ تم جنبش کرو تمہیں ابدی نیند سلا دوں گا۔''

نوشین کا ذہن بڑی تیزی سے کام کررہا تھا وہ ایک موہوم امید پر کرنل کو باتوں میں لگا کر وقت حاصل کرنا چاہتی تھی۔

''تم کو ہلیر اپر کیسے شبہ ہوا تھا کرنل؟'' نوشین نے آہستہ سے پوچھا۔ ''تم کو شروع ہی سے سب معلوم تھا وہ بہت ہوشیار اور باخبر لوگ ہیں ان کو کیپٹن فرخ کے بارے میں بھی معلوم ہے تمہارے متعلق بھی ہلیر اتو بڑی آسانی سے میرے جال میں آگئی تھی اسے سرخ روشنی کا انتظار تھا اور میں نے اس کا انتظام کردیا تھا۔ تم کو یاد ہے نا؟ اس رات تم سب کے ساتھ شیمان گڑھی کی ہٹ میں آیا تھا لیکن تم اس سے بھی زیادہ چالاک ہو۔ اس لالٹین کا راز شاید ہمیں کبھی نہ معلوم ہوسکتا حقیقت یہ ہے کہ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا اگر آج تم مدد نہ کرتیں۔'' اس نے وحشیانہ قہقہہ بلند کیا۔

''تو کیا تم مجھے بھی قتل کردو گے کرنل؟''

''خود زندہ رہنے کے لیے یہ ضروری ہے تم خطرناک حد تک جان چکی ہو اور میں فوجی آدمی ہوں دشمن کو چھوڑ دینا میرے اصول کے خلاف ہے۔''

''لیکن فرخ کو معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں اس کے آدمی بوٹ کی نگرانی کررہے ہیں۔ تم بچ نہ سکو گے..... پولیس؟''

بکومت یہ لائٹر دیکھ رہی ہو؟ یہ تمہاری موت ہے اس سے نکلنے والی گیس گولی سے زیادہ مہلک ہے تم چند لمحوں میں ختم ہوجاؤ گی اور تمام عمر پولیس پتا نہ لگا سکے گی فرخ کے آدمیوں نے مجھے بوٹ پر آتے دیکھا وہ سوچ رہے ہوں گے کہ فرخ مجھے تمہاری نگرانی کے لیے چھوڑ گیا ہے لوگ تمہاری موت کو ہارٹ فیل تصور کریں گے جاتے وقت تمہیں زور سے خدا حافظ کہوں گا ڈاکٹر بھی یہیں تشخیص کرے گا کوئی مجھ پر شبہ نہ کرے گا۔'' وہ مکاری کے ساتھ مسکرایا۔ ''ویسے تمہاری موت پر مجھے افسوس ہوگا۔'' نوشین نے اسے رحم طلب نظروں سے دیکھا لیکن کرنل اس وقت درندہ نظر آرہا تھا اس نے لائٹر اوپر اٹھایا۔ ''خدا حافظ نوشین۔''

بدحواسی کے عالم میں نوشین نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ چیکو کرنل کے بالکل برابر کھڑا تھا شاید اس نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی وہ اچانک زور سے بھونکا کرنل

نے چیکو کی طرف گردن گھمائی اور نوشین کے لیے یہ آخری موقع تھا اسے کچھ پتا نہیں کہ کس طرح اس نے میز کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ کرنل کرسی سمیت الٹ گیا اور پھر وہ پوری قوت سے چیخی سناٹے میں اس کی چیخ بار بار ابھری کسی نے دروازے کو دھکا دیا لکڑی ٹوٹنے کی آواز آئی اور پھر اسے کچھ یاد نہیں رہا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو کیپٹن فرخ اس پر جھکا ہوا تھا کمرہ ولوگوں سے بھرا ہوا تھا فرخ نے اس کے ماتھے سے بھیگا ہوا کپڑا اٹھایا۔

''خدا کا شکر ہے تم ہوش میں آگئیں اس نے آہستہ سے کہا۔'' اوہ فرخ وہ کرنل..... کرنل الیگزینڈر تھا اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''ہمیں معلوم ہے نوشین وہ مر چکا ہے تم اب بالکل محفوظ ہو۔ کیا تم نے اسے مار دیا؟''

''نہیں وہ اپنے ہتھیار سے مر گیا شاید گرتے ہوئے لائٹر کا بٹن دبا گیا ہو۔'' فرخ نے بتایا وہ چونک اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر فرخ کے شانے سے لگ کر رونے لگی میجر ہیولٹ نے گلاس میں دوا انڈیل کر ابوذر کو دی ابوذر نے اس کو الگ کیا۔

''یہ دوا پی لو۔''

''نوشین کو اب تک یہ سب کچھ بھیانک خواب لگ رہا تھا دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ نیڈوز ہوٹل کے ایک آرام دہ کمرہ میں تھی۔

''تم نہ ہوتیں تو شاید یہ بھیانک سازش کامیاب ہو جاتی۔'' کیپٹن فرخ اسے بتا رہا تھا وہ اپنے کمرے میں بستر پر بیٹھی ناشتا کر رہی تھی۔ میجر ہیولٹ ساتھ والی کرسی پر بیٹھا ہوا۔

''ہم نے لالٹین سے کاغذات برآمد کر لیے ہیں اس میں تمام مجرموں کی فہرست اور پتے تھے اور گیس کے اس ذخیرے کا پتا بھی تھا جو اس پلان کا بھیانک ترین حصہ تھی۔''

اسی لمحے کاردار اندر داخل ہوا اس کے ہاتھ میں ایک ٹیلی گرام تھا'' دو کے علاوہ سارے مجرموں کو گرفتار کر لیا۔'' فرخ نے کہا۔'' پورے ملک میں رات بھر چھاپے پڑے ہیں۔'' لیکن آخر یہ سازش کیا تھی؟''

''بڑی بھیانک شاید تم کو یہ علم نہ ہو کہ ہندوستان اسی سال اگست میں آباد ہو رہا ہے۔'' فرخ نے بتایا'' ایک سیاسی گروہ نے غیر ملکی طاقت کے ذریعے کشمیر پر قبضے کا پلان بنایا تھا۔ نہ نئی گیس اسی مہلک طاقت کی ایجاد ہے۔ وہ اسے پہلے کشمیر پر آزمانا چاہتے تھے جس وقت پورا ملک آزادی کا جشن منا رہا ہوتا جہاز کے ذریعے یہ گیس پہلے جے پور پر پھینکی جاتی اور چند لمحوں میں یہاں کوئی جاندار شے باقی نہ رہتی اس طرح پورے کشمیر پر خاموشی سے قبضہ ہو جاتا پھر وہ یہی حربہ پشاور اور راولپنڈی پر آزماتے اور اس کے بعد پورے علاقے پر تباہی پھیلانے کا الٹی میٹم دیا جاتا ظاہر ہے پاکستان جیسے نئے ملک کے لیے شکست تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہتا اس طرح پورے علاقے پر ایک غیر ملکی قوت کی کٹھ پتلی حکومت قائم ہو جاتی۔''

''میرے خدا مجھے تو یہ ایک ڈراؤنا خواب محسوس ہوتا ہے۔'' نوشین نے کہا۔

''بظاہر تو اب ایسا ہی ہے لیکن اگر وہ خدانا خواستہ کامیاب ہو جاتے۔''

''بس خدا کے لیے رہنے دو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔'' نوشین نے کہا۔

''خدا کا شکر ادا کرو نوشین تم نے مسلمانوں کو ایک قائم ہونے والی مملکت کو ہی نہیں لاکھوں انسانوں کو تباہی سے بچا لیا ہے۔'' فرخ نے کہا۔'' یہ معمہ شاید میں بھی حل نہ کر سکتا۔''

''لیکن اگر تم میرے ساتھ نہ ہوتے تو شاید میں بھی اسے حل نہ کر سکتی۔'' نوشین نے کہا۔

''واقعی'' کیپٹن فرخ نے خوش ہو کر کہا۔'' جب تم میرے بغیر کچھ نہیں کر سکتیں تو پھر اب ہمیشہ ساتھ رہنے کا عہد کر ڈالو۔''

''یو شٹ اپ!'' نوشین نے کہا۔ لیکن شرم و حیا سے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔

☆☆

تریاق

شہباز احمد

زندگی میں بعض موڑ ایسے بھی آتے ہیں کہ انسان کچھ سوچنے، کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ ایک نوجوان کا قصۂ غم وہ اپنی بہن سے شدید محبت کرتا تھا کیونکہ ماں باپ کے انتقال کے بعد اب وہی دونوں رہ گئے تھے۔ کالج میں اس نے اپنی کلاس فیلو سے محبت کرنے کے باوجود بہت سی باتیں پوشیدہ رکھی تھیں۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسا راز اس پر آشکار ہوا کہ وہ چونک اٹھا اور پھر اس نے ایک فیصلہ کرلیا.....!

ایک محبت کرنے والے بھائی کا قصہ۔

میرے ابو قیام پاکستان کے وقت بڑی ہی مشکلوں سے اپنی جان بچا کر پاکستان آئے تھے۔ ابو جس وقت پاکستان آئے تو بہت کم عمر تھے، ان کے عزیز و اقارب بلوائیوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے تھے لیکن یہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور پاکستان پہنچ کر ایک ریفوجی کیمپ میں رہنے لگے، کوئی ان کی دیکھ بھال کرنے والا تھا اور نہ ہی دکھ بانٹنے والا مگر پھر اللہ کو ان کی بے بسی اور لاچاری پر ترس آ گیا اور ایک بے اولاد جوڑا انہیں اس غلیظ کیمپ سے اٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ یہ لوگ بڑے ہی محبت کرنے والے، رحم دل اور نیک خصلت تھے۔ وہ سبزی بیچتے تھے۔

ان کا گھر کچا تھا اور اس میں دو کمرے تھے۔ اس آبادی کے اور بھی بہت سے گھر کچے تھے کیونکہ یہ بہت پسماندہ اور غریب سی بستی تھی لیکن میرے ابو اس گھر کی چھت تلے بڑا سکون محسوس کرنے لگے۔ بابا اگرچہ بہت غریب تھے لیکن میرے ابو کی ہر فرمائش کسی نہ کسی طرح پوری کر دیتے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ بابا ابو کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتے رہے۔ تھے۔ ابو بھی پڑھنے لکھنے میں بہت تیز تھے۔ بابا کی خواہش تھی کہ وہ ابو کو ڈاکٹر بنائیں۔ ابو بھی بابا کی اس خواہش کو پورا کرنا چاہتے تھے لیکن انٹر تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ابو نے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا کیونکہ بابا اس عمر کو پہنچ گئے تھے کہ وہ ٹھیلا نہیں گھسیٹ سکتے تھے۔ چنانچہ ابو نے بابا کو گھر بٹھایا اور خود ایک آفس میں کلرک لگ گئے۔ بابا نے ابو سے بہت کہا کہ بیٹا میں تمہیں ڈاکٹر بنانا چاہتا ہوں، مجھ میں ابھی اتنی طاقت ہے کہ میں کما کے لاسکوں۔ تم اپنی تعلیم مت چھوڑو لیکن ابو نہ مانے۔

انہوں نے کہا۔ ''بابا ہم صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں، ان کی تعبیر نہیں دیکھ سکتے۔''

پھر بابا بھی ابو کی بات سمجھ گئے۔ امی کچھ دنوں سے بیمار رہنے لگی تھیں۔ انہیں بھی ابو کی تعلیم ادھوری رہ جانے کا دکھ تھا اور یہ دکھ اماں کی جان کا روگ بن گیا۔ ابھی ابو کو آفس جوائن کیے دو مہینے ہی ہوئے تھے کہ اماں اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں۔ اماں کے بعد گھر کے کام کرنے والا کوئی نہ تھا، اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے بابا، ابو کی شادی کے بارے میں سوچنے لگے۔ بابا نے ابو سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو ابو نے یہ مسئلہ بابا کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

پھر بابا نے ابو کی شادی دارالامان کی ایک لڑکی سے کر دی، اس کے ماں باپ بچپن میں انتقال کر گئے تھے اور اس کی چچی نے اسے دارالامان میں داخل کرا دیا تھا اور پھر پلٹ کر کبھی خبر تک نہ لی تھی۔

میری امی خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ سگھڑ تھیں۔

بابا میرے ابو کو اکثر کہتے تھے۔ ''بیٹا میں نے تیری شادی اس بے آسرا سے اس لیے کی ہے کہ کوئی اور لڑکی اس معمولی سے گھر میں کیسے رہ سکتی تھی اور ویسے بھی میرا کون سا ایسا رشتے دار تھے جو اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں بیٹی دیتا اس لیے میں نے تم دو یتیموں کو یکجا کر دیا ہے۔''

ابو شادی کے بعد خوش تھے کہ انہیں ایک سگھڑ اور اچھی بیوی ملی ہے، بابا بھی اپنی بہو سے بہت خوش تھے لیکن انسانی زندگی کی سب خوشیاں جاوداں تو نہیں ہوتیں بعض خوشیاں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ انسان کی جان لے لیتی ہیں۔ بابا کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ابو کی شادی کے چند ماہ بعد ہی بابا بھی اماں کے پاس چلے گئے۔ بابا کی موت کا ابو کو بے حد صدمہ ہوا وہ راتوں کو اکثر بابا کو یاد کر کے روتے اور کہتے کہ انہوں نے ایک یتیم اور بے سہارا کو بیٹا بنا کر اس کی سب خوشیاں پوری کیں اور اتنا پیار دیا کہ شاید کوئی اپنے حقیقی بیٹے کو بھی نہ دیتا ہو، یتیم تو میں اب ہوا ہوں۔ اس موقع پر امی نے ہی ابو کو حوصلہ دیا اور ان کو سمجھانے بجھانے پر وہ سنبھل گئے۔

کچھ عرصے بعد ابو کا ٹرانسفر نیو کراچی آفس میں ہو گیا تو ابو نے یہ مکان اونے پونے بیچ کر آفس کے قریب ہی ایک مکان پر لے لیا۔ اس

مکان سے جو رقم ملی تھی اس سے ابو نے فرنیچر وغیرہ خرید لیا تھا۔ ابو کی شادی کے تین سال بعد بجو پیدا ہوئیں۔ بجو بالکل امی پر گئی تھیں۔ بجو کے چار سال بعد میں پیدا ہوا، ابو مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ میں تو ڈاکٹر نہیں بن سکا مگر اپنے بیٹے کو ڈاکٹر ضرور بناؤں گا۔ میرا بیٹا بہت بڑا ڈاکٹر بنے گا اور ڈاکٹر بن کر میرا بیٹا دکھی انسانیت کی خدمت کو اپنا مشن بنائے گا۔

ہمارے برابر والے مکان میں عرفان چچا رہائش پذیر تھے۔ عرفان چچا سے ہمارے بالکل رشتے داروں جیسے تعلقات تھے۔ چچی نے امی کو بہن بنالیا تھا۔ عرفان چچا کا ایک ہی بیٹا تھا جو بجو سے دو سال بڑے تھے۔ چچی نے اپنے بیٹے آصف کے لیے بجو کو بچپن ہی میں مانگ لیا تھا۔ آصف بھائی سانولے رنگ کے معمولی شکل وشباہت کے تھے۔

ماہ وسال گزرتے رہے۔ بجو اب بی اے کر چکی تھیں اور میں آٹھویں کلاس میں تھا۔ بجو کے بی اے کرتے ہی عرفان چچا بجو اور آصف کی شادی کرنا چاہتے تھے کیونکہ آصف بھائی بھی بی کام کر کے ایک پرائیوٹ فرم میں اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے کام کرنے لگے تھے۔

میرے سالانہ امتحان ہو رہے تھے اور میرے امتحان کے بعد بجو کی شادی طے ہوگئی تھی۔ ابو کے پاس اب اتنی رقم بھی جمع ہو چکی تھی کہ وہ ایک مکان خرید سکتے تھے لیکن بجو کی شادی بھی کرنا تھی اس لیے امی نے ابو کو سمجھایا کہ ہم مکان تو بعد میں بھی خرید سکتے ہیں لیکن اگر ہماری شازیہ کی شادی دھوم دھام سے نہ ہوئی تو لوگ کیا کہیں گے کہ ایک ہی بیٹی تھی اس کو بھی ایسے ہی دھکا دے دیا۔ ابو نے امی کی یہ بات مان لی۔

میرا آخری پرچا تھا۔ میں اس روز جب پرچا دے کر گھر آرہا تھا تو گلی میں داخل ہوتے ہی مجھے اپنے گھر کے سامنے لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ میں بھاگتا ہوا جب گھر کے دروازے تک پہنچا تو عرفان چچا نے مجھے اپنے سینے سے لگالیا۔

''کیا ہوا چچا؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا تو عرفان چچا رونے لگے پھر وہ مجھے لے کر اندر داخل ہوئے۔ بجو، چاچی اور محلے کی بہت ساری عورتیں زاروقطار رو رہی تھیں۔

بجو مجھے دیکھتے ہی تیزی سے اٹھیں اور مجھے اپنے سینے سے لگالیا۔

''عظیم..... ہم یتیم ہوگئے۔'' یہ سنتے ہی میرے ہوش اڑ گئے۔

امی اور ابو اسکوٹر پر بجو کی شادی کی شاپنگ کرنے جارہے تھے کہ ان کا اسکوٹر ٹرک سے ٹکرا گیا۔ امی اور ابو دونوں شدید زخمی تھے، لوگ انہیں اسپتال لے گئے مگر مجھے تو کچھ ہوش نہیں تھا۔ عرفان چچا اور آصف بھائی نے ہی کفن دفن کا سارا انتظام خود کیا تھا۔

امی ابو کے چالیسویں کے بعد بجو نے ایک آفس میں سیکریٹری کے لیے درخواست دے دی اور جب بجو نے مجھے یہ بتایا کہ اب وہ ملازمت کرے گی تو میں حیران رہ گیا۔

''باجی میں محنت مزدوری کروں گا، تم ایسا نہ سوچو۔'' میں نے کہا۔

''نہیں عظیم! تم ابھی بہت چھوٹے ہو اور پھر تمہیں یاد ہے کہ ابو تمہیں ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ اب میں تمہیں ڈاکٹر بنا کر ابو کی یہ خواہش پوری کروں گی۔'' بجو نے کہا۔

''لیکن بجو! آصف اور عرفان چچا آپ کو ایسا نہیں کرنے دیں گے۔''

''میں چچی سے بات کرلوں گی۔''

دونوں یہ بات کر ہی رہے تھے کہ چچی آگئیں۔ میں نے چچی کو بتایا کہ بجو ملازمت کرنا چاہتی ہے، آپ انہیں سمجھائیں۔ چچی نے یہ سن کر بجو سے کہا۔

''کیوں بیٹی شازیہ! یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ تم میری ہونے والی بہو ہو اور ہمارے گھر کی بہو بیٹیاں کام نہیں کرتیں۔''

''چچی جان!'' بجو نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔
''آپ خود سوچیں، اگر میں کام نہیں کروں گی تو عظیم کا کیا ہوگا؟ وہ کہاں جائے گا؟''
''کہاں جائے گا کیا مطلب؟ یہ ہمارے گھر میں رہے گا۔ کیا ہم عظیم کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے۔'' چچی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔
''چاچی آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ مجھے عظیم کو ڈاکٹر بنانا ہے کیونکہ یہ ہمارے ابو کی خواہش تھی۔''
''بھئی میں کچھ نہیں جانتی' تمہارے چچا تو اگلے ماہ تمہاری اور آصف کی شادی کر رہے ہیں۔''
''نہیں چچی جان! میں ابھی شادی نہیں کر سکتی۔ شادی کے لیے اب آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔''
''بھئی میں جا رہی ہوں، اب تمہارے چچا ہی تمہیں سمجھائیں گے۔'' چچی چلی گئیں تو میں نے بجو سے کہا۔
''بجو! چچی جان ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ آپ آصف بھائی سے شادی کر کے اپنا گھر بسالیں اور میرا.....'' ابھی میں اپنی بات پوری نہ کر پایا تھا کہ عرفان چچا آ گئے۔
''شازیہ بیٹی! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ تم نوکری کرو گی، کیا ہم مر گئے ہیں جو یوں در بدر بھٹکو گی۔''
''چچا جان! ابو عظیم کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے، آپ لوگ چند سال انتظار کر لیں۔'' یہ کہہ کر بجو رونے لگی۔
''اچھا بیٹی رو مت، میں پھر آؤں گا۔'' پھر اگلے روز چچا اور چچی اکٹھے ہوئے اور انہوں نے بجو کو سمجھایا مگر بجو اپنی بات پر ڈٹی رہیں، آصف بھائی بھی آئے لیکن انہیں بھی بجو نے دو ٹوک جواب دے دیا کہ اگر آپ انتظار کر سکتے ہیں تو چند سال انتظار کر لیں۔
بجو نے اب ایک دفتر میں آفس سیکریٹری کی حیثیت سے ملازمت کر لی تھی اور جو پیسہ ابو نے اس کی شادی کے لیے رکھا ہوا تھا، وہ بینک میں جمع کرا دیا۔ اس طرح دو سال گزر گئے، اب چچی بھی بہت کم آتی تھیں۔ بجو صبح کا ناشتا اور دوپہر کا کھانا بنا کر رکھ دیتی تھیں، میں صبح اسکول جاتا اور دوپہر کو ٹیوشن پڑھنے۔ ٹیوشن سے آ کر میں گھر پر ہی رہتا، بجو پانچ بجے تک واپس آ جاتی تھیں۔
میں کچھ دنوں سے بجو میں ایک تبدیلی محسوس کرنے لگا تھا کیونکہ بجو پہلے تو آفس میں نہایت سادگی سے جاتی تھیں لیکن اب ایک ہفتے سے خوب بن سنور کر آفس جانے لگی تھیں۔ پہلے وہ اپنے لمبے بالوں کا جوڑا باندھتی تھی، اب بال کھلے رہتے تھے۔ بجو کا یوں بن ٹھن کر آفس جانا نہایت ناگوار گزرتا لیکن وہ مجھ سے بڑی تھیں، اس لیے میں انہیں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ میرے پیپر شروع ہو چکے تھے اور میں دن رات اپنے امتحان کی تیاری میں مگن تھے۔ بجو مجھ سے امتحان کے بارے میں پوچھتی رہتی تھیں اور میں یہی کہتا تھا کہ میرے پیپر بہت اچھے ہو رہے ہیں۔
بجو اب نہایت سج سنور کے آفس جاتی تھیں۔
ایک روز یوں بن سنور کر آفس جانے کا راز کھل گیا۔ تقریباً ساڑھے چھ بجے گھر آئیں تو وہ اکیلی نہیں بلکہ ان کے ساتھ ایک اجنبی بھی تھا۔ وہ اجنبی دیکھنے میں بالکل ہالی ووڈ کا کوئی ہیرو لگتا تھا، نہایت گوری رنگت، براؤن مونچھیں اور آنکھیں نیلی تھیں۔ وہ دراز قد تھا اور بلیک پینٹ اور بلیو شرٹ میں ملبوس تھا۔ میں اس شخص کو دیکھ کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔
بجو نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔
''عظیم کھڑے کیوں ہو گئے بیٹھو نا۔''
''بجو یہ..... یہ.....'' میں نے اس کی مردانہ وجاہت دیکھ کر کہا۔
''ہاں ہاں بتاتی ہوں۔ عظیم یہ ہارون ہیں اور ہارون یہ میرا پیارا بھائی عظیم ہے۔''
ہارون نے میری طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
''آپ کی بجو تو ہر وقت آپ ہی کی باتیں کرتی ہیں۔''
میں نے جھجکتے ہوئے لہجے میں کہا۔
''بجو مجھے ذرا کام ہے، میں ابھی آتا ہوں۔''

یہ کہتا ہوا میں گھر سے باہر آ گیا۔ سفید رنگ کی کار کھڑی تھی جو یقیناً بجو کے سر کی تھی۔ بجو کے بننے سنورنے کی وجہ سمجھ میں آ چکی تھی، ان کے لیے میرے دماغ میں الٹے سیدھے خیالات گردش کرنے لگے تھے۔

میں دس منٹ گھر واپس آیا تو ہارون صاحب جا چکے تھے اور بجو باورچی خانے میں کھانا بنا رہی تھیں۔

''بجو!'' میں نے غصہ سے پکارا۔ ''یہ ہارون صاحب یہاں کیا کرنے آئے تھے؟''

''عظیم! یہ تمہارا لہجہ کیسا ہے۔ تمہیں بات کرنے کی بھی تمیز نہیں رہی اور ہارون کے سامنے بھی تمہارا یہی رویہ تھا۔'' بجو نے غصہ سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور آپ کو بہت تمیز ہے، ایک غیر شخص کو گھر میں لے آئیں۔ آپ اپنا نہیں تو آصف بھائی اور عرفان چچا کا ہی خیال کر لیتیں۔'' میں نی نرمی سے کہا۔

''عظیم! اب مجھے کسی کا خیال نہیں اور ہارون اب غیر نہیں رہیں گے کیونکہ میں ان سے شادی کر رہی ہوں۔''

بجو نے تو بے دھڑک یہ بات کہہ دی لیکن یہ بات سنتے ہی میں سکتے میں آ گیا اور فوراً اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میں سوچنے لگا، یہ وہی بجو ہیں جو کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کرتی تھیں لیکن آج ان کا لہجہ کتنا بدل گیا ہے۔ میں نے صرف سنا تھا کہ محبت انسان کو اندھا کر دیتی ہے لیکن آج بھی دیکھ لیا تھا کہ واقعی بجو تھیں، محبت میں بالکل اندھی ہو گئی تھیں۔ وہ تو یہ بھی بھول چکی تھیں کہ وہ عرفان چچا کی ہونے والی بہو ہیں، محلے والے کیا کہیں گے۔ آنے والے وقت کے خوف سے میری آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔

میں بجو کو اس کے فیصلے سے روک نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ محبت میں اندھی ہونے کے ساتھ ڈھیٹ بھی ہو چکی تھیں۔ میں اپنا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر رونے لگا تب ہی کسی نے میرے ساتھ پر ہاتھ رکھا۔ میں نے آنسوؤں بھرا چہرہ اٹھا کر دیکھا تو بجو ہاتھ میں کھانے کی ٹرے لیے کھڑی تھی۔

''عظیم!'' بجو میرے قریب بیٹھ کر بولی۔ ''عظیم! ہارون میرا آئیڈیل ہے اور اس نے مجھے پروپوز کیا ہے۔''

''مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننا۔ آپ جو چاہیے کریں کیونکہ آپ بڑی ہیں۔ آپ تو مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتی تھیں کہ ابو کا خواب پورا ہو سکے۔ ابو کا ایک خواب یہ بھی تو تھا کہ آپ عرفان چچا کی بہو بنیں۔ اب ابا کے اس خواب کا کیا ہوگا؟'' میں نے بجو کے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔ ''بجو پلیز، ابو کا خواب نہ توڑیں۔ ہم محلے والوں کا کیا منہ دکھائیں گے۔''

''عظیم! میں کہہ چکی ہوں کہ ہارون میرا آئیڈیل ہے۔''

''بجو آپ تو سیدھی سادی سی لڑکی تھیں پھر آپ آئیڈیل کے چکر میں کیسے پڑ گئیں؟''

''عظیم اپنے قد سے بڑی باتیں نہ کرو، میں اپنا بھلا خوب سمجھتی ہوں، اب تم کھانا کھاؤ۔ میں تم سے پھر بات کروں گی۔'' یہ کہہ کر بجو میرے کمرے میں چلی گئیں، میں نے سوچا اب بات کرنے کے لیے رہ ہی کیا گیا ہے۔ بھوک تو میری اڑ گئی تھی، کھانا ٹرے میں ایسے ہی پڑا رہا اور میں ساری رات آنے والے وقت کے خوف سے جاگتا رہا۔

دوسرے دن میرا پیپر تھا۔ میں پیپر دینے جا رہا تھا مگر میرا ذہن شدید قسم کے ڈپریشن میں مبتلا تھا۔ بجو اپنے وقت پر آفس چلی گئیں۔ میں پیپر دے کر آ رہا تھا کہ آصف بھائی مجھے گلی میں نظر آ گئے۔ انہوں نے سلام کا جواب دینے کے بجائے مجھے عجیب سی نظروں سے گھورا اور گزر گئے۔ میرا دل ایک دم گھبرا گیا کیونکہ عموماً جب آصف بھائی مجھے ملتے تھے تو میرے سلام کا جواب بڑی محبت سے دیتے تھے لیکن آج شاید انہیں بجو کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔ یقیناً انہوں نے بجو کو ہارون سر کے ساتھ دیکھ لیا ہوگا۔ میں گھر

آ کر لیٹ گیا، میرا پیپر تقریباً اچھا ہی ہوا تھا۔ لیٹتے ہی مجھے نیند نے آ لیا۔

جب میں سو کر اٹھا تو شام ہو رہی تھی اور مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے کھانا نکال کر کھایا۔ چھ بجے بجو آ گئیں۔ ابھی بجو کو آئے ہوئے بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ چچی آ گئیں۔ چچی جان نے آتے ہی بجو سے پوچھا۔

''شازیہ! کل تم کار میں کس کے ساتھ آئی تھیں؟'' ان کا لہجہ تیز تھا۔

''وہ..... وہ چچی..... وہ میرے باس ہیں۔'' بجو نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

''باس ہوں گے تو آفس میں ہوں گے، انہیں گھر لانے کی کیا ضرورت تھی؟'' اس سوال پر بجو خاموش رہیں تو چچی نے بجو سے کہا۔ ''اپنا نہیں تو اپنے مرحوم ماں باپ کا ہی خیال کیا ہوتا۔ کیوں ان کی روح کو بے چین کر رہی ہو۔ کیا بھول گئیں کہ تم ہماری بہو ہو۔'' چچی جان نے بجو کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''چچی! وہ میرے ماں باپ کا فیصلہ تھا، اس میں میری مرضی شامل نہیں تھی اور اب میں آصف سے شادی نہیں کر سکتی۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں تو ہماری ہی عزت کا خیال کرو۔ ہم لوگوں کی محبتوں کا یہ صلہ دیا تم نے۔ اس وقت اگر تیرے ماں باپ زندہ ہوتے تو گلا گھونٹ دیتے تیرا۔ میں اسی دن سے ڈرتی تھی جب ہی تجھے سروس کرنے سے منع کیا تھا۔'' پھر چچی جان نے بجو کو خوب صلواتیں سنائیں۔ بجو ان کی ڈانٹ سنتی رہیں۔

جب چچی جان جانے لگیں تو بجو نے انگوٹھی واپس کرتے ہوئے کہا۔

''اب ہمارا آپ لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں۔''

چچی جان کی آنکھوں سے گویا انگارے نکل رہے تھے۔ وہ پاؤں پٹختے ہوئے چلی گئیں پھر تھوڑی دیر بعد چچی جان عرفان چچا کو لے کر آئیں، ان کے ساتھ آصف بھائی بھی تھے۔ آصف بھائی کو دیکھ کر بجو اپنے کمرے میں چلی گئیں اور اندر سے کنڈی لگا لی۔

عرفان چچا نے مجھ سے کہا۔

''عظیم! یہ سب کیا ہے؟''

''چچا جان! میں خود پریشان ہوں۔''

عرفان چچا نے بجو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شازیہ بیٹے! دروازہ کھولو۔''

اندر سے بجو کی رندھی ہوئی آواز آئی۔

''پلیز آپ لوگ چلے جائیں، مجھے آپ لوگوں کی کوئی بات نہیں سننا۔ جو فیصلہ آپ لوگوں نے میرے بچپن میں کیا تھا، وہ مجھے منظور نہیں۔''

یہ باتیں سن کر عرفان چچا وغیرہ چلے گئے۔ ان لوگوں کے جاتے ہی بجو اپنے کمرے سے باہر آ گئیں اور اس کے باہر آتے ہی میں نے غصے بھری نگاہ ان پر ڈالی اور باہر نکل گیا۔ باہر جا کر میں کافی دیر تک آوارہ گردی کرتا رہا پھر جب گھر پہنچا تو بجو کھانا کھا رہی تھیں۔

بجو نے مجھ سے پوچھا۔ ''عظیم! کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟''

میں نے تڑخ کر کہا۔ ''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

میری بھوک تو آپ نے اڑا دی ہے۔'' پھر میں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا اور آنے والے وقت کے بارے میں سوچنے لگا۔

محلے والے اب مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے تھے۔ میں جیسے ہی گلی سے گزرتا، وہ گھور گھور کر مجھے دیکھتے اور پھر کھسر پھسر کرتے۔ بجو سے منگنی ٹوٹنے کے بعد آصف بھائی کی اپنے رشتے داروں میں ہی شادی کر دی گئی۔ ان کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ آصف بھائی کی شادی کے چار روز بعد ہی بجو نے مجھے بتایا کہ ''اس جمعہ کو میری شادی ہے۔''

''تو میں کیا کروں؟'' میں اب بجو سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔

''پلیز عظیم!'' انہوں نے روتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں اپنی بجو کی شادی کی کوئی خوشی نہیں؟ ہارون

بہت اچھے انسان ہیں۔ وہ لندن سے پڑھ کر آئے ہیں، وہاں انہیں بہت سی لڑکیاں ملیں لیکن وہ تو اپنے ملک میں، اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتے تھے۔''

''تو آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہیں۔ مجھے آپ سے یا آپ کی شادی سے کوئی سروکار نہیں۔'' میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

پھر جمعے کو واقعی بجو کی شادی ہوگئی۔ اس شادی میں بجو کے آفس کے لوگ اور ہارون کے رشتہ دار وغیرہ شامل تھے۔ میں آخر بجو کا بھائی تھا اور جتنی محبت میں بجو سے کرتا تھا شاید ہی کوئی بھائی اپنی بہن سے کرتا ہو۔ مجبوراً مجھے بھی بجو کی شادی میں شرکت کرنا پڑی۔ ہماری طرف سے میرے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر ہمارا تھا کون؟ محلے والے ویسے بھی طنزیہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ بجو کی شادی فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوئی۔ وہ دلہن بن کر بے انتہا خوب صورت لگ رہی تھیں اور ہارون بھائی کے ساتھ ان کی جوڑی خوب جچ رہی تھی، سب ہی اس جوڑی کی تعریف کر رہے تھے۔

شادی کے بعد بجو مجھے زبردستی اپنے گھر لے گئیں۔ انہوں نے مجھے اپنی قسم دے کر کہا تھا۔

''عظیم جب تک تم ڈاکٹر نہیں بن جاتے، میرے ساتھ ہی رہو گے۔''

ہارون بھائی اسمارٹ ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت خوش اخلاق تھے۔ انہوں نے بھی مجھے اپنی ساتھ چلنے کو کہا۔

''لیکن بجو! ایک شرط پر۔ میں آپ کے ساتھ رہوں گا، ابو کا جو پیسہ بینک میں ہے، میں اس سے اپنی تعلیم جاری رکھوں گا۔''

''ہاں، ہمیں تمہاری شرط منظور ہے۔'' بجو نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا۔ پھر ہم نے وہ کرائے کا گھر چھوڑ دیا۔ میں جانے سے پہلے آخری بار عرفان چچا سے ملنا چاہتا تھا لیکن بجو نے مجھے منع کر دیا کہ ان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔

ہارون بھائی کا وسیع و عریض بنگلا ڈیفنس کے علاقے میں تھا۔ ہارون بھائی کے والد حادثے میں دو سال پہلے جاں بحق ہوگئے تھے۔ جب سے ہارون بھائی نے سارا کاروبار سنبھالا، والدہ بچپن ہی میں اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں۔ ایک بہن تھی جو لندن میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ بجو کی شادی میں وہ نہیں آئی تھی۔ ہارون بھائی کے رشتے دار تو بہت تھے لیکن جب ہارون بھائی نے اپنی پسند کی شادی کر لی تو زیادہ تر کنارہ کش ہوگئے کیونکہ وہ ہارون بھائی کو اپنا داماد بنانا چاہتے تھے۔

شروع شروع میں مجھے یہاں سخت وحشت ہوتی۔ اپنا پرانا محلہ بہت یاد آتا لیکن میرے لیے وہاں لوگوں کی طنزیہ باتوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہارون بھائی واقعی بہت اچھے انسان تھے۔ وہ مجھے بالکل اپنے بھائیوں کی طرح سمجھتے تھے لیکن میں ان سے زیادہ فری نہیں ہوتا تھا۔ بس ان کی باتوں کا ہوں ہاں میں جواب دے دیتا۔ ہارون بھائی آفس سے آنے کے بعد بجو کو لانگ ڈرائیور پر لے جاتے۔ وہ کبھی کبھار زبردستی مجھے بھی ساتھ لے جاتے حالانکہ میں انہیں منع کرتا تھا۔ بجو کو خوش دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔ میں دعا کرتا تھا کہ میری بہن کو خدا یوں ہی خوش و خرم رکھے۔

میرا میٹرک کا رزلٹ آ گیا تھا۔ میں بڑی نمایاں پوزیشن لایا تھا۔ بجو اور ہارون بھائی میری کامیابی پر بہت خوش تھے۔ انہوں نے میرے پاس ہونے پر مجھے موٹر سائیکل کا تحفہ دینا چاہتے تھے لیکن میں نے صاف منع کر دیا، میں نے کہا۔

''آپ کا یہی کیا کم احسان ہے کہ میں آپ کے گھر میں رہ رہا ہوں۔''

''عظیم! آئندہ ایسی بات کبھی مت کرنا۔'' ہارون بھائی غصے میں بولے۔

میڈیکل کالج میں داخلے کا مسئلہ ہارون بھائی نے حل کر دیا، ویسے بھی میری پوزیشن اچھی تھی۔ اس لیے داخلے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ کالج گھر سے دور تھا اس کا حل ہارون بھائی نے یہ نکالا کہ آفس جانے سے

پہلے مجھے کالج میں چھوڑ جاتے، کالج کا ماحول میرے نیا تھا کیونکہ یہ شہر کا بہترین کالج تھا۔ اس لیے لڑکیاں لڑکے سب ساتھ پڑھتے تھے۔ کالج میں میرے لیے تمام چہرے نئے تھے سوائے ایک چہرے کے اور وہ پریکٹیکل روم کا چوکیدار ایاز تھا، جو میرے ساتھ نویں جماعت تک پڑھا تھا پھر اس نے اسکول چھوڑ دیا۔

کلاس میں میری کسی لڑکے سے زیادہ دوستی نہیں تھی لیکن سلام دعا سب سے تھی۔ اس ماحول میں ہر لڑکا کسی نہ کسی لڑکی کے ساتھ دکھائی دیتا جبکہ میں اپنی عادت کے مطابق لڑکیوں سے دور ہی رہتا تھا۔ کالج کے اکثر اسٹوڈنٹ کھاتے پیتے اور معمولی گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے یہاں لڑکیاں بھی ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت اور فیشن ایبل تھیں جو لڑکوں کو ساتھ بیٹھی گپ شپ کرتی نظر آتیں۔ ایک لڑکی سیمی تو ان سب سے آگے تھی، وہ انتہائی خوب صورت ہونے کی ساتھ ساتھ بڑی شوخ و چنچل بھی تھی اور ہر ایک سے فری ہو جاتی۔

دراز قد سیمی کالج کی تمام لڑکیوں میں ممتاز نظر آتی تھی۔ اس کی گوری رنگت سنہرے لمبے بال اور نیلی نیلی آنکھیں قیامت ڈھاتی تھیں۔ وہ ہو بہو ہارون بھائی ایسی تھی۔ نہ جانے میں جو لڑکیوں کے معاملے میں بڑا محتاط تھا، مجھے کیا ہو گیا اور سیمی میرے حواسوں پر چھا گئی حالانکہ وہ سب سے فری رہتی تھی، لیکن مجھ سے اس نے کبھی فری ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں دل ہی دل میں سیمی سے محبت کرنے لگا اور اب یہ چاہتا تھا کہ سیمی مجھ سے کوئی بات کرے۔ سیمی اپنی کار میں کالج آتی تھی اور اکثر جلد آ جاتی جبکہ میں تھوڑا لیٹ ہو جاتا تھا۔

ایک دن میں ہارون بھائی کی گاڑی سے اتر رہا تھا تو دیکھا، سیمی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کبھی مجھے اور کبھی ہارون بھائی کو دیکھتی۔ جب ہارون بھائی چلے گئے تو میں کلاس میں آ گیا۔ آج سیمی کا اس طرح دیکھنا مجھے عجیب سا لگا کیونکہ سیمی نے کبھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔

میرا سال اول کا امتحان ہو رہا تھا اور میں اپنے امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ تمام لڑکے لڑکیاں اب ہر وقت تیاریوں میں مصروف نظر آتے تھے۔ آخر امتحان ختم ہو گئے اور کامیاب ہونے والے سب لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔

اچانک سیمی میرے پاس آ گئی اور میرا نام لے کر بولی۔

''عظیم! تمہارا رزلٹ کیسا رہا؟''

میں سیمی کی اس بے تکلفی پر بوکھلا سا گیا۔

''میں..... میں پاس ہو گیا ہوں۔ یہ لیں مارکس شیٹ دیکھیں۔'' میں نے سیمی کی طرف مارکس شیٹ بڑھا دی۔

''گڈ، بہت اچھے مارکس آئے ہیں۔''

''اور آپ کا کیا ہوا؟'' میں نے سیمی کی نیلی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو سیمی نے مارکس شیٹ میرے آگے کر دی اور کہا۔

''میں بھی نمایاں نمبر لائی ہوں۔''

اسی دن سے سیمی مجھ سے بات کرنے لگی۔ کبھی وہ میرے نوٹس مانگتی، کبھی کوئی کتاب وغیرہ لیکن اس سے زیادہ ہمارے درمیان کوئی بات چیت نہ ہو سکی۔

ایک دن میں بیٹھا ہوا تھا کہ سیمی میرے پاس آئی اور ایک خوشبو اڑاتا خوب صورت سا لفافہ مجھے دیتے ہوئے بولی۔

''یہ آپ کے لیے ہے اور اس کا جواب ضرور دیجیے گا۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے پریکٹیکل روم سے نکل گئی اور میں ہونقوں کی طرح اس خوشبو میں ڈوبے ہوئے لفافے کو دیکھتا رہا۔ گھر پہنچتے ہی میں نے دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا تو اس میں سیمی کا لکھا ہوا محبت نامہ تھا، اس نے لکھا تھا۔

''ڈیئر عظیم! آپ کی سادگی میرے دل میں اتر گئی ہے۔ مجھے آپ جیسے ساتھی کی ضرورت تھی۔ شاید آپ بھی مجھے چاہتے ہوں لیکن آپ نے کبھی اس چاہت کا اظہار نہیں کیا لیکن میں لڑکی ہو کر پہل کر رہی

ہوں۔ میری محبت کا جواب محبت سے دیجیے گا۔

فقط آپ کی سیمی!''

خط پڑھ کر میرے دل میں مسرتوں کے گلاب کھل گئے۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں سوچنے لگا، میں بھی کتنا خوش قسمت ہوں کہ منزل خود چل کر میرے پاس پہنچ گئی لیکن پھر میرا دل وسوسوں میں ڈوب گیا کہ کہیں سیمی نے مجھ سے مذاق ہی نہ کیا ہو کیونکہ سیمی جیسی شوخ اور چنچل لڑکی سے کچھ بعید بھی نہ تھا پھر میرے دل نے کہا تو معمولی شکل وصورت کا سیدھا سادہ ہے۔ سیمی بڑی حسین وجمیل اور پروقار لڑکی ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے تیری سادگی پسند آ گئی ہو جیسا کہ اس نے محبت نامے میں لکھا ہے۔ غرض یہ کہ میں اپنی سوچوں میں ڈوبا ہوا جب اگلے روز کالج گیا تو سیمی گیٹ پر ہی کھڑی تھی۔ میں ہارون بھائی کی گاڑی سے نیچے اترا تو وہ تیزی سے میرے پاس آئی اور ہیلو کہا۔ میں اس کی اس بے تکلفی پر شرما سا گیا کیونکہ ہارون بھائی ابھی بھی یہیں کھڑے ہوئے تھے۔ سیمی نے ہارون بھائی کو بھی سلام کیا۔ ہارون بھائی نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور سلام کا جواب دے کر اپنی گاڑی بڑھا دی۔ سیمی اور میں کلاس میں آ گئے۔

سیمی نے فارغ وقت میں جب مجھ سے اپنے لیٹر کا جواب مانگا تو میں نے سیمی سے کہا۔

''سیمی! میں کاغذی باتوں کا قائل نہیں۔ آج کا لنچ میری طرف سے ہوگا۔''

پھر جب ہارون بھائی مجھے پک کرنے آئے تو میں نے انہیں بتایا کہ آج میں لنچ اپنے دوست کے ساتھ کروں گا، آپ جائیے مجھے ذرا دیر ہو جائے گی۔ ابھی میں ہارون بائی سے باتیں کر رہا تھا کہ سیمی ایک دن ہارون بھائی کی گاڑی کے پاس آ گئی۔ اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور بولی۔

''عظیم! آپ نے ابھی تک ان صاحب کا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔''

''اوہ..... سیمی! یہ میرے بھائی ہارون ہیں۔''

''اچھا، تو یہ وہ لنچ والے دوست ہیں۔'' ہارون بھائی نے مسکرا کر مجھے اور سیمی کو دیکھا پھر بولے۔

''میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ہارون بھائی چلے گئے۔

میں سیمی کو لے کر ایک قریبی ریسٹورنٹ میں آ گیا۔ کھانے کا آرڈر دے کر میں نے سیمی سے بلا جھجک کہا۔

''ہاں سیمی! اب کہو، کیا واقعی تم مجھ سے محبت کرتی ہو یا میری سادگی کا مذاق اڑا رہی ہو؟''

''نہیں عظیم! میں واقعی تم سے محبت کرتی ہوں۔ مجھے تمہارے ہی جیسے ساتھی کی ضرورت تھی۔''

''سیمی! کالج کے کئی لڑکے تمہیں چاہتے ہیں پھر تم نے مجھے ہی کیوں فوقیت دی؟''

''عظیم! تم نہیں جانتے کہ محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے اور مجھے صرف تم سے محبت ہے اور سب تو اپنی خوب صورتی اور دولت پر گھمنڈ کرتے ہیں لیکن تم اتنی دولت ہونے کے باوجود سادہ اور معصوم فطرت ہو۔'' سیمی نے جب یہ کہا تو میں سوچنے لگا، دولت میرے پاس کہاں ہے۔ میں تو خود بہن کے ہاں رہتا ہوں، شاید سیمی ہارون بھائی کی کار کو دیکھ کر سمجھ رہی ہے کہ میں.....

''عظیم! کہاں کھو گئے۔'' سیمی نے مجھے ہلا کر پوچھا تو میں نے کہا۔

''نہیں کچھ نہیں، چلو کھانا کھاؤ۔''

کھانا کھا کر ہم ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تو میں نے ہولے سے کہا۔

''دیکھو سیمی! زندگی میں میں نے صرف تم سے پیار کیا ہے۔ کہیں تم مجھے دھوکا تو نہیں دو گی؟''

''نہیں عظیم! تم ہمیشہ مجھے باوفا پاؤ گے۔''

''ہاں سیمی! ایک اور بات ہے مگر مائنڈ نہ کرنا۔''

''نہیں نہیں، تم کہو۔'' سیمی نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''سیمی! دراصل میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اب کسی کو زیادہ منہ نہ لگانا کیونکہ لڑکے تمہاری اس بے تکلفی کا کچھ اور ہی مطلب سمجھتے ہیں۔''

''اچھا عظیم! ابھی سے جیلس ہوگئے ہو، یہ تو میری عادت ہے لیکن اگر تمہارا یہی حکم ہے تو میں آئندہ کسی سے زیادہ بات نہیں کروں گی۔'' سیمی نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں جب گھر پہنچا تو شام ہورہی تھی۔ بجو باورچی خانے میں شاید چائے بنارہی تھیں۔ بجو نے اور دوسرے کاموں کے لیے تو نوکر رکھے تھے لیکن کھانا اور چائے وہ خود بناتی تھیں کیونکہ ہارون بھائی بجو ہی کے ہاتھ کا کھانا کھاتے تھے۔ ہارون بھائی لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ہارون بھائی کے پاس گیا اور انہیں سلام کیا۔

''آ گئے عظیم! کہو، دوست کے ساتھ لنچ کیا؟''

''ہاں بھائی! وہ سیمی.....''

''بھئی ہم سمجھ گئے لیکن عظیم! تمہیں ابھی ڈاکٹر بننا ہے، پلیز پہلے پڑھائی اور بعد میں یہ سب کچھ۔''

''ہارون بھائی! ڈاکٹر بننا میری آرزو ہے اور سیمی میری پسند۔ میرے اس دوست کے بارے میں بجو کو مت بتایئے گا۔'' میں نے بجو کو آتے دیکھ کر کہا۔

''ہارون نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے پریکٹیکل ہورہے ہیں، اس لیے تم دیر سے آؤ گے۔'' بجو نے چائے کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں بجو! پریکٹیکل بالکل ٹھیک رہا۔'' میں نے ہارون بھائی کی طرف دیکھا اور ان کا آنکھوں ہی آنکھوں میں شکریہ ادا کیا۔ ہارون بھائی بھی مجھے دیکھ کر مسکرائے۔

دوسرے دن میں کالج پہنچا تو سیمی گیٹ پر ہی تھی۔ پہلے اس نے ہارون بھائی کو سلام کیا پھر مجھے۔ ہارون بھائی نے سیمی کے سلام کا جواب نہایت خوش اخلاقی سے دیا اور چلے گئے۔

فارغ پریڈ میں سیمی اور میں کالج لان میں بیٹھے ہوئے تھے، سیمی نے کہا۔

''عظیم! کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔''

میں نے یہ سنا تو کہا۔ ''سیمی یہ جو مجھے کالج چھوڑنے آتے ہیں، یہ میرے بھائی ہیں۔'' میں نے سیمی کو ہارون بھائی کے متعلق یہ نہیں بتایا کہ وہ میرے بہنوئی ہیں۔ اس طرح شاید سیمی سوچتی کہ میں اپنی بہن کے ٹکڑوں پر پڑا ہوا ہوں پھر میں نے بتایا کہ میری ایک بہن ہے۔ ماں باپ دو سال پہلے ایک حادثے میں انتقال کر گئے۔

''اوہ، تمہارے ماں باپ کا سن کر افسوس ہوا۔'' سیمی نے کہا۔ ''اچھا تمہارے یہ بھائی کیا کرتے ہیں؟''

''ان کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار ہے اور یہ لندن سے پڑھ کر آئے ہیں۔''

''اچھا۔'' سیمی نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''اور تم کیوں نہیں لندن پڑھنے گئے؟''

''وہ..... دراصل بھائی اور بجو مجھے اپنے سے دور نہیں کرنا چاہتے۔ اب تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

سیمی نے اپنے بارے میں بس اتنا بتایا کہ اس کے ابو دوائیوں کی ایک فیکٹری کے مالک ہیں اور امی سوشل ورکر ہیں اور سیمی سے چھوٹی دو بہنیں بھی ہیں، جو پڑھ رہی ہیں۔ پھر سیمی ہارون بھائی کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتی رہی۔ میں اسے گول مول جواب دیتا رہا۔ میں سیمی کو ابھی سچ اس لیے نہیں بتا رہا تھا کہ شاید سیمی مجھے کنگلا سمجھ کر ٹھکرا نہ دے۔ میں نے سوچا تا کہ ڈاکٹر بن کر سیمی کو سب کچھ بتادوں گا۔

ویسے مجھے یقین ہوگیا تھا کہ سیمی مجھ سے بے پناہ محبت ہے کیونکہ ہر لڑکے سے بے تکلفی سے بات کرنے والی اب زیادہ کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ لڑکے سوچتے کہ اس سادہ سے لڑکے نے سیمی کو کس طرح اپنا گرویدہ بنالیا؟ ہر لڑکا اور لڑکی میری قسمت پر رشک کرتے کہ سیمی نے میری خاطر ہر کسی سے فری ہونا چھوڑ دیا۔

ایاز مجھ سے کہتا۔ ''تم بالکل سیدھے اور شریف ہو، ذرا سنبھل کر رہنا۔ یہ آزاد خیال لوگ سیدھے اور سادگی پسند لوگوں کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔''

''ایاز! سیمی کے بارے میں ایسا کبھی مت کہنا۔

دیکھا نہیں میرے ایک حکم پر وہ اب کسی سے زیادہ بات چیت نہیں کرتی۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' ایاز ہنس کر کہا۔

سیمی اب ہمیشہ کالج کے گیٹ پر ہی مجھے ملتی، اس کی ہارون بھائی سے بھی سلام دعا ہوگئی تھی۔

سیمی اور میری محبت کو دو ماہ کا عرصہ ہوگیا تھا، ایک روز جب مجھے حرارت سی محسوس ہوئی تو میں نے سوچا آج کالج نہیں جاؤں گا لیکن سیمی کے بارے میں سوچ کر میں تیار ہونے لگا مگر ناشتے کی میز پر پہنچا تو مجھے چکر آ گیا اور میں ایک دم سے گر پڑا۔

بجو اور ہارون بھائی نے مجھے گرتے دیکھ کر فوراً اٹھایا اور پوچھا۔

''کیا ہوا عظیم!''

''کچھ نہیں، بس ایسے ہی سر میں درد سا ہے۔''

''ارے تمہیں تو بخار بھی ہے۔'' بجو نے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''چلو اپنے کمرے میں۔'' پھر ہارون بھائی مجھے اپنے کمرے میں لے گئے اور انہوں نے ڈاکٹر کو فون کر دیا۔ ڈاکٹر آیا اور اس نے معمولی فلو بتایا اور دوائی دے کر چلا گیا۔ میں سارا دن بستر پر پڑا رہتا۔ سیمی کی صورت بار بار میرے خیالوں میں آ رہی تھی۔

ہارون بھائی آفس سے واپس آئے تو سیدھے میرے کمرے میں آئے۔ ''عظیم اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں ہارون بھائی۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''عظیم تمہارے دوست تمہیں پوچھ رہے تھے۔''

''کون سیمی؟''

''ہاں گزر رہا تھا تو وہ گیٹ پر ہی کھڑی تھی۔ میں نے سوچا کہ سیمی کو بتا دوں کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''ہارون بھائی سیمی نے اور کچھ کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں وہ کہہ رہی تھی، عظیم سے کہنا کہ وہ کچھ روز آرام کریں، میں اسے دیکھنے ضرور آؤں گی۔'' تب ہی بجو میرے کمرے میں آ گئیں اور ہارون بھائی خاموش ہوگئے۔

دوسرے دن مجھے کچھ نقاہت سی محسوس ہو رہی تھی لیکن میں کالج جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ بجو نے منع بھی کیا کہ آج نہ جاؤ لیکن میں نے کہا امتحان نزدیک ہیں، اس لیے جانا ضروری ہے۔

میں ہارون بھائی کے ساتھ کالج پہنچا تو سیمی گیٹ پر ہی موجود تھی۔ ہارون بھائی کی گاڑی دیکھتے ہی وہ تیزی سے اس طرف آئی اور پھر مجھے دیکھ کر چونک سی گئی۔

''ارے عظیم! کیسی طبیعت ہے اب؟'' سیمی نے مجھ سے پوچھا اور ہارون بھائی کی طرف دیکھ کر سلام کیا۔

''میں اب ٹھیک ہوں۔'' میں گاڑی سے اتر گیا تو ہارون بھائی چلے گئے۔

''سیمی! آج کچھ اداس لگ رہی ہو۔''

''ہوں..... نہیں تو.....'' سیمی نے چونکتے ہوئے جواب دیا پھر باتیں کرتے ہوئے ہم کلاس میں آ گئے۔

ہمارا دوسرا پیریڈ فری تھا۔ سیمی نے کہا۔

''چلو عظیم! کینٹین میں چلتے ہیں۔''

''نہیں سیمی! تم جاؤ، میں یہی کلاس میں ہوں۔'' میں نے انکار کرتے ہوئی کہا۔ سیمی نے زیادہ ضد نہیں کی اور خود کینٹین چلی گئی۔ کلاس کے تقریباً سب ہی لڑکے باہر نکل گئے سوائے چار پانچ لڑکوں کے۔ میں نے سوچا اس کے بعد فزکس کا پیریڈ ہے شاید کل فزکس کے سر نے کچھ لیکچر دیا ہو اور سیمی نے نوٹس لے لیے ہوں، یہی سوچ کر میں نے سیمی کا بیگ کھولا اور اس میں سے فزکس کی کاپی نکال لی۔ ابھی میں نے کاپی کھولی ہی تھی کہ اس میں سے ایک لفافہ گرا۔ میں نے لفافہ اٹھایا تو اس میں سے وہی سینٹ کی خوشبو آ رہی تھی جیسے

میرے لفافے سے آئی تھی جو سیمی نے مجھے اظہار محبت کے لیے دیا تھا، لفافہ کھلا ہوا تھا اور اس میں سے خط جھانک رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید سیمی نے میرے لیے خط لکھا ہو کہ اگر میں کالج نہ آؤں تو وہ خط کے ذریعے میری طبیعت پوچھ لے۔ میں نے خط کھول کر پڑھا تو مجھے ایسا لگا جیسے میری چاروں طرف بم کے دھماکے ہو رہے ہیں۔ سیمی نے وہ خط مجھے نہیں ہارون بھائی کو لکھا تھا۔

''سویٹ ہارون! جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے، آپ کی دیوانی ہوگئی ہوں کیونکہ آپ ہی میرے آئیڈیل ہیں۔ میں نے اپنی زندگی کے ساتھی کے بارے میں سوچا تھا کہ اس کی آنکھیں میری طرح نیلی ہوں اور وہ وجیہہ اور پرخلوص انسان ہو۔ سو خدا نے میری سن لی اور آپ مل گئے۔ آپ تک پہنچنے کے لیے ہی میں نے آپ کے بھائی عظیم کا سہارا لیا۔ عظیم سمجھتا ہے کہ میں اس سے پیار کرتی ہوں لیکن میں تو صرف آپ کو دل و جان سے چاہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری محبت کا جواب محبت سے دیں گے اور عظیم کو بھی آپ سمجھا دیں گے کہ میں نے آپ تک پہنچنے کے لیے اس کا سہارا لیا تھا۔

فقط آپ کی اور صرف آپ کی سیمی!''

خط پڑھ کر میرے حواس اڑ چکے تھے۔ تمام اسٹوڈنٹ کلاس میں آنا شروع ہوگئے تو میں نے جلدی سے خط کو لفافے میں ڈال کر کاپی میں رکھ دیا اور کاپی بیگ میں ڈال دی۔

سیمی کلاس میں آئی تو بولی۔

''عظیم! یہ تمہاری آنکھیں لال کیوں ہو رہی ہیں؟''

''بس ایسے ہی، سر میں درد ہو رہا تھا۔''

''بھئی میں نے تو تمہارے ہارون بھائی سے کہا بھی تھا کہ عظیم سے کہہ دیں کہ چند روز آرام کرے۔''

کالج کی چھٹی ہوئی تو ہارون بھائی ذرا دیر سے آئے۔ سیمی جا چکی تھی اور میں ہارون بھائی کے ساتھ گھر آ گیا۔ گھر پہنچ کر میرا ذہن شدید ڈپریشن کا شکار تھا۔ میں سوچنے لگا، سیمی کو میں نے دل و جان سے چاہا اور اس نے میرے ساتھ بے وفائی کی۔ واقعی میں محبت کے لائق نہیں بلکہ کسی کی محبت تک پہنچنے کا ذریعہ ہوں اور سیمی نے بھی کسے چاہا میرے بہنوئی کو..... غلطی میری تھی اگر میں سیمی کو ہارون بھائی کا تعارف بہنوئی کے طور پر کرا دیتا تو یہ نوبت نہ آتی اور سیمی بھی شاید مجھ سے جھوٹی محبت کے دعوے نہ کرتی۔

اگر آج میں کالج نہ جاتا تو سیمی ضرور وہ محبت نامہ ہارون بھائی کو دے دیتی اور اس طرح وہ خوب صورت ناگن ہارون بھائی کو بہکا سکتی تھی اور اگر ہارون بھائی بجو سے بے وفائی کرتے تو پھر بجو کا کیا ہوتا۔ بجو نے تو تمام محلے والوں اور امی ابو کی روح سے بغاوت کر کے ہارون بھائی کو حاصل کیا تھا۔ میرا دل اس وقت خون کے آنسو رو رہا تھا۔ سوچوں میں گھر کر میرا دماغ پھٹنے لگا۔

بجو میرے کمرے میں آ کر بولیں۔

''عظیم! چلو کھانا کھالو۔'' پھر انہوں نے مجھے چھو کر دیکھا تو بولیں۔ ''ارے تمہیں تو سخت بخار ہے۔'' وہ فوراً باہر جا کر ہارون بھائی کو بلا لائیں۔

ہارون بھائی نے ڈاکٹر کو فون کیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آ گیا۔

''عظیم! تمہیں آرام کرنے کو کہا تھا مگر تمہارے ہارون بھائی بتا رہے تھے کہ تم کالج چلے گئے تھے۔'' ڈاکٹر نے انجکشن لگاتے ہوئے کہا۔

''بس ڈاکٹر صاحب! سر میں درد ہے اور ہارون بھائی ایسے ہی گھبرا جاتے ہیں۔''

ڈاکٹر دوائیاں دے کر چلا گیا تو بجو نے زبردستی مجھے دودھ کا گلاس پلایا اور دوائی کھانے کو دی۔ بجو اور ہارون بھائی کمرے سے گئے تو مجھے نیند آنے لگی اور میں سو گیا اور جب سو کر اٹھا تو رات ہو رہی تھی۔ مجھے پھر سیمی کی بے وفائی یاد آنے لگی اور میں سیمی کے

ارے میں سوچنے لگا۔

''سیمی.....تم نے ایسا کیوں کیا؟''

پھر میں سوچنے لگا.....سوچتا رہا اور آخر میں سیمی کا انجام سوچ لیا اور اس انجام کو سوچتے ہی مجھ پر نہ جانے کیوں سکون سا طاری ہوگیا۔ رات کو میں نے معمولی سا کھانا کھایا اور پھر ساری رات کروٹیں بدلتے گزاری۔

صبح سات بجے میری آنکھ کھل گئی۔ میرا بخار اب اتر چکا تھا لیکن رات بھر سوچنے کی وجہ سے سر میں ابھی ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔ میں ہاتھ منہ دھو کر ناشتے کی میز پر پہنچا تو بجو اور ہارون بھائی بولے۔

''عظیم! ہم تمہارے کمرے میں ناشتا بھجوا رہے تھے کیونکہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں، بس آج اپنے کمرے میں آرام کرو اور کالج جانے کی ضد نہ کرنا۔''

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں بجو! آج پلیز مجھے جانی دو، مجھے بخار نہیں ہے۔'' میں نے ناشتا کیا ہارون بھائی کے ساتھ کالج پہنچ گیا۔

ہارون بھائی بولے۔ ''بھئی عظیم! آج تمہارے دوست نہیں آئے۔'' ہارون بھائی کا یہ کہنا آج نہ جانے کیوں مجھے بہت برا لگا۔ کہیں ہارون بھائی بھی تو اس ناگن کے شکار نہیں ہوگئے۔

''فکر مت کرو، آجائے گا تمہارا دوست۔ اتنا زیادہ بھی اس کے بارے میں مت سوچا کرو۔'' ہارون بھائی نے کہا اور پھر جانے کے لیے مڑ گئے۔

سیمی دیر سے کالج پہنچی تھی۔ سیمی کے آنے سے پہلے میں سوچ رہا تھا کہ اگر سیمی آج نہ آئی تو میں اپنے منصوبے پر عمل کیسے کروں گا کیونکہ میں تو اسے جلد سے جلد سبق سکھانا چاہتا تھا تاکہ آئندہ یہ ناگن کسی کو نہ ڈس سکے۔ مجھے سیمی سے واقعی بہت محبت تھی مگر اس نے میری محبت کی توہین کی تھی اور اب تو وہ میری بہن کے سہاگ پر ڈاکا ڈالنے والی تھی پھر میں بھلا خاموش کیسے رہ سکتا تھا۔ مجھے

بہرحال اپنے منصوبے پر عمل کر کے اپنی بہن کے سہاگ کو بچانا تھا۔ میں ابھی سیمی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ آ پہنچی۔

''عظیم! آج مجھے ذرا دیر ہوگئی۔'' وہ مسکرائی۔ آج مجھے اس کی مسکراہٹ کسی چڑیل کی مسکراہٹ لگی، ہم دونوں کلاس روم میں چلے گئے۔

اس روز تیسرا پیریڈ فری تھا۔ میں نے سیمی سے کہا۔

''مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔''

میری بات سن کر اس نے کہا۔ ''تو چلو کینٹین میں چلتے ہیں، وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

''نہیں سیمی! پریکٹیکل روم میں ابھی کوئی نہیں ہے، وہیں سکون سے بات ہوگی۔'' پھر میں سیمی کو لے کر پریکٹیکل روم میں آ گیا اور جب میں نے پریکٹیکل روم کا دروازہ بند کیا تو سیمی چونک گئی۔

''عظیم..... عظیم دروازہ کیوں بند کیا؟''

میں نے چنگھاڑتے ہوئے سیمی سے کہا۔

''چلانے کی ضرورت نہیں سیمی! خاموش رہو۔''

پھر میں نے پاس رکھی ہوئی تیزاب کی بوتل اٹھائی اور بڑی تیزی سے سیمی کے چہرے پر پھینک دی۔ اس کی کرب ناک چیخیں بلند ہوئیں اور اس کا چہرہ بھیانک ہوگیا، چند ہی لمحوں بعد میں خود بھی چکرا کر فرش پر گر پڑا۔

مجھے اتنا یاد ہے کہ میں نے پولیس کے سامنے اقرار جرم کر لیا تھا پھر عدالت میں بھی میں نے اپنے جرم کا اقرار کیا اور مجھے سزا ہوگئی۔

میں اس وقت زندان میں بیٹھا اپنی داستان قلمبند کرا رہا ہوں۔ نہ جانے مجھے کیا سوجھی کہ ایسا کرنے پر مجبور ہوگیا حالانکہ بجو اور ہارون بھائی جب بھی ملاقات کے لیے آتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ لیکن میں جواب دینے کے بجائے خاموش ہو کر سر جھکا لیتا ہوں اور وہ نم آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

☆☆

شامت جاں

صدف راشد

کامیابی ذہانت سے حاصل ہوتی ہے یا نصیب سے۔ ہیروں کا ہار ایک ہی تھا لیکن اس کے دعوے دار تین لوگ تھے۔ تینوں کی کہانی مختلف تھی اور تینوں ہی جھوٹے تھے۔ ان میں سے ایک کامیاب ہوا یہ آپ فیصلہ کریں گے کہ قسمت سے ہوا یا ذہانت سے.....

ذہانت کی جنگ میں جیتنے والے ایک پرائیوٹ سراغ رساں کا کارنامہ جو ناکام ہوتے ہوئے بھی کامیاب تھا

خادم کو سکندر حسین عابدی کہتے ہیں، ویسے آپ جب بھی مجھے مخاطب کریں تو صرف سکندر کہہ کر مخاطب کریں۔ ورنہ آپ کو بہت خطرات پیش آسکتے ہیں۔ جی ہاں میرے والد جو پہلے ملک کے نامی گرامی بیرسٹر تھے۔ اب بفضل تعالیٰ سے جج ہوگئے ہیں۔ جج ہونا کوئی ایسی بات نہیں ہے حالانکہ میرے والد کے زبردست تعلقات ہیں وہ آپ کو جیل سے لے کر پھانسی کے تختے تک چڑھوا سکتے ہیں۔ لیکن حق سے کام لوں گا کہ میرے والد نے اپنے ان زبردست تعلقات سے کوئی ناجائز کام نہیں لیا۔ ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا۔

بات آپ کی خیریت کی ہورہی تھی۔ مجھے سکندر حسین عابدی کہہ کر آپ میرے والد کے اس خوب صورت پستول کی گولی کا نشانہ بن سکتے ہیں، جن کے دستے پر ہاتھی دانت سے نقش کاری کی گئی ہے۔ دراصل جج صاحب نہیں چاہتے کہ میرے نام کو ان کے نام کے ساتھ نتھی کیا جائے۔ جی ہاں وہ مجھے عاق کرچکے ہیں، انہوں نے مجھ سے یہ شہر بلکہ یہ ملک چھوڑ دینے کے لیے کہا تھا۔ لیکن جناب اپنا وطن کیسے چھوڑوں۔ اس وطن کی مٹی سے تو میں نے جنم لیا ہے۔ مجھے اس کے گلی کوچے اور بازار بہت پسند ہیں۔ انہی گلیوں میں کھیل کر میں جوان ہوا ہوں۔ زندگی کے چودہ سال میں نے وطن سے دور رہ کر گزارے ہیں اور حلفیہ کہتا ہوں کہ ان چودہ سالوں میں میں نے اپنے وطن کو کبھی فراموش نہیں کرسکا۔ دراصل نالائقی میری ہی ہے۔ میں وہ نہیں بن سکا جو والد صاحب مجھے بنانا چاہتے تھے۔

والد صاحب مجھے بھی اپنی طرح ہی نامی گرامی بیرسٹر اور پھر جج بنانا چاہتے تھے۔ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا میں ان کی مرضی سے کیسے انحراف کرسکتا تھا۔ چنانچہ اعلا تعلیم کے حصول کے لیے مجھے غیر ملک بھیج دیا گیا، برا ہو اس وائی کاٹ کا جس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ وائی کاٹ لندن میں میرا واحد دوست تھا۔ جس پر میں جان چھڑکتا تھا۔ آپ سے کیا چھپاؤں، تھا ہی ایسا آدمی، ایک مخلص اور جان دینے والا دوست حسن میں نسوانیت کا عنصر شامل تھا۔ شاید اس میں کشش کی یہی وجہ تھی، ملاقات کے تھوڑے عرصے کے اندر پتا چلا کہ اس کا تعلق اسکاٹ لینڈ یارڈ پولیس سے ہے اور

نجانے کیا اثر تھا کہ میں بھی خود کو اس کام کے لیے موزوں سمجھنے لگا۔

تعلیم جاری رہی۔ اور اس کے ساتھ ہی وائی کاٹ سے دوستی بھی جاری رہی۔ ظالم نے ایسے ایسے گر سکھائے کہ میں بھی استاد ہوگیا۔ شیخی نہیں بگھار رہا۔ لندن میں بہت سے خطرناک اور چالاک مجرموں کو میں نے گردن سے پکڑ کر پولیس کے سامنے پیش کیا ہے اور وہاں کی پولیس اعلا افسران میرے بہترین دوست بن گئے تھے۔

پولیس کے اعلا افسران یہاں بھی میرے دوست ہیں لیکن ان کو دوستی ذرا مختلف قسم کی ہے۔ وہ میرے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں کھاتے پیتے ہیں۔ مجھے اپنی تقریبات میں شریک کرتے ہیں۔ دوسروں سے اپنے دوست کی حیثیت سے متعارف کراتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ میری تاک میں بھی رہتے ہیں اور اسکاٹ لینڈ یارڈ پولیس میں وائی کاٹ کا نام ایک دھماکے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ میرے لیے جتنا مخلص جتنا جاں نثار تھا جرائم پیشہ افراد میں اتنا ہی مہلک اور خطرناک تھا۔ گروہ کے گروہ وائی کاٹ کے نام سے کانپتے تھے۔ پھر میرا اور اس کا دن رات کا ساتھ ہوگیا۔ اس کے کام سے مجھے بھی دلچسپی پیدا ہوگئی اور میری دلچسپی کو مدنگاہ رکھتے ہوئے اس نے پرائیوٹ طور پر مجھے بھی اپنے کاموں میں شریک کرلیا۔

کیا حسین زندگی تھی۔ مجھے اپنی تعلیم کا خیال ضرور تھا۔ لیکن بقیہ وقت وائی کاٹ کے ساتھ پیچیدہ کیسز کی گتھیاں سلجھانے میں صرف ہونے لگا۔ اور وائی کاٹ ہی کا کہنا ہے کہ میں اصل میں پیدا ہی اسی پیشے کے لیے ہوا تھا۔ میرا ذہن ان کاموں کے لیے بے موزوں ہے۔ اگر میں نے کوئی اور کام کیا تو میں زیادہ کامیاب نہ ہوسکوں گا اور اس کی باتوں میں

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کا یہ خلوص، ان کی یہ عنایت صرف اس لیے ہے کہ کسی بھی وقت میرے خلاف کوئی ثبوت حاصل کر کے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر مجھے جیل میں ٹھونس دیں یا پھانسی چڑھا دیں، نجانے کیوں وہ وہ مجھ سے اس قدر نالاں ہیں۔

حالانکہ میں آپ سے حقیقت عرض کر رہا ہوں کہ وطن مقدس کی عظمت و وقار کا مجھے بھی احساس ہے میں اپنی سرزمین پر کوئی سازش نہیں کر رہا۔ میں مجرموں کی پشت پناہی نہیں کرتا۔ بلکہ ان کے خلاف پولیس کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہوں۔ لیکن وہ میری یہ خدمات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ مجھے قسمت کا بھی سکندر کہتے ہیں کہ میں ان ابھی تک ان کے پنجے سے آواز ہوں۔ ان کی بات تو الگ رہی خود میرے والد میرے پیشے سے نالاں ہیں، یہ درست ہے کہ میں نے بیرسٹری کا امتحان اعلیٰ پوزیشن میں پاس کیا ہے۔ لیکن اب ضروری ہے کہ میں بیرسٹر ہی کروں، دیکھیے نا انسان اک اپنا رجحان ہوتا ہے۔ آپ کسی شاعر کو اکاؤنٹنٹ بنا دیجیے وہ کیا کر سکے گا۔ میں وہی کرنا چاہتا تھا جو میری فطرت تھی۔ چنانچہ لندن سے واپسی پر میں نے والد صاحب سے بات کی، ٹھیک ہے ہمارے یہاں پرائیویٹ سراغ رسانی کے لائسنس نہیں ملتے۔ لیکن میں اپنا کام کسی نہ کسی طرح چلا ہی سکتا تھا جس کی تجاویز میں نے والد صاحب کے سامنے پیش کی تھیں لیکن جناب..... وہ تو میری باتیں سنتے ہی چراغ پا ہو گئے۔ کسی طرح کے کندھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیا، فوراً دھمکیاں شروع ہو گئیں۔ لیکن میں وہ سب کچھ کیسے کر سکتا تھا جو میں نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ عاق کر دیا گیا۔ جائیداد سے محروم کر دیا، لیکن ہم قلندروں کو تو دو وقت کی روٹی چاہیے۔ بس اور یہ روٹی ہم ہر وقت مہیا کر سکتے تھے۔ چنانچہ میں نے ان کے اس فیصلے پر انہیں مبارک باد دی اور کھڑے کھڑے ابو کے گھر سے نکال دیا گیا۔

تعارف ذرا طویل ہو رہا ہے۔ مختصراً عرض کر دوں کہ اپنا مقام پانے کے لیے بڑے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ مگر یہ پاپڑ بیلنے والا محاورہ نجانے کیا ہے۔ پاپڑ بیلنے میں کون سی مشکلات پیش آتی ہیں جو اسے ہر مشکل کام کی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ایک اخبار کا ڈیکلریشن لینے کی کوشش کی جس کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا۔ دوسرے بہت سے معاملات میں بھی ٹانگ اڑائی گئی۔ بمشکل تمام ایک اخبار سے رابطہ قائم کیا اور اس کے لیے رپورٹر کی حیثیت سے ملازم ہو گیا۔ اس طرح رپورٹنگ لائسنس مل گیا جو بہت سے کاموں میں آج تک معاون ثابت ہوتا ہے۔ اخبار کو بلاتنخواہ رپورٹر رکھنے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ایک ادارہ..... ادارہ رفاعہ عامہ کے نام سے قائم کیا اس ادارے کی پبلسٹی اس انداز میں کی گئی کہ ضرورت مند اس کی صحیح حیثیت سے واقف ہو جائیں۔ اس سلسلے میں بھی بڑی بڑی مشکلات پیش آئیں۔ اخبار میں اشتہار دیا گیا تھا۔

''آپ کی مشکلات کا حل ہماری مٹھی میں ہے۔ ادارہ رفاہ عامہ پہنچ جایئے۔''

پہنچ گئے ایک ٹیڈی بالم، محبوبہ انہیں اپنی جنس سمجھتی تھی، وہ انہیں سہیلی بنانے پر تو تیار تھی۔ عاشق نہیں، چنانچہ وہ اپنی مشکلات کا حل دریافت کرنے آئے تھے اور کچھ پیسے بھی ساتھ لائے تھے۔ چنانچہ اشتہار کا مضمون بدل گیا۔

''گمشدہ چیزیں..... یہاں سے حاصل کریں۔'' اس اشتہار نے تو اور بھی قیامت برپا کر دی، عالم دین دھوبی اپنا گدھا تلاش کرتا ہوا پہنچ گیا۔ اور میز کرسیوں کے نیچے جھانکنے لگا۔ تب پھر خان گل ماخوند کو رکھنا پڑا جس کی وجہ سے عالم دین جیسے لوگوں کو اندر آنا نصیب نہ ہو۔ بہرحال ایک جھلک تھی، کئی ماہ میں جا کر لوگوں کو یہ حقیقت معلوم ہوئی اس دوران کئی بار پولیس والوں سے سابقہ پڑا۔ وہ ان اشتہارات کی حیثیت جاننے پر مصر تھے۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں مافی الضمیر ظاہر کیا، ہڑبڑے ہنسے گھورا

دھمکیاں دیں اور چلے گئے۔ چنانچہ ادھر سے بھی کچھ فارغ البالی نصیب ہوئی لیکن ایک حد تک ..... لگن سچی تھی کام ملنے لگا۔

طریقہ کار میں تھوڑی سی تبدیلی کی، قدم بہ قدم چلا رہا تھا۔ ابتداء میں پولیس والوں کی نظر کڑی تھی، سیدھے سادے کیس لیتا رہا۔ ضرورت مندوں کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن اس کے بعد ..... پورے شہر میں نگاہ رکھنا شروع کردی۔ پھڈے میں ٹانگ اڑا کر زبردستی لوگوں کی توجہ حاصل کی اور جب ان کے کام میں حیرت انگیز طور پر بن گئے تو ان کے ذریعے خاص پبلسٹی حاصل کی اور ضروریات پوری کرنے کے لیے دولت بھی حاصل کی۔ اور اب شہر کا معزز طبقہ..... ایسے لوگ جو اپنے مسائل خود حل کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے اور ہر کام دولت کے بل پر کرنے کے عادی ہیں۔ مجھ سے بخوبی واقف ہیں، سینکڑوں گھرانے کے راز میرے سینے پر دفن ہیں اور ان کا امین ہوں۔ امانت میں خیانت نہ کرنا میرا اصول ہے، ایسے کیس نہیں لیتا جو قابل گرفت ہوں اور غیر قانونی حیثیت رکھتے ہوں، اپنے دوست پولیس افسران کی بھی کئی بار مدد کرچکا ہوں۔ وہ لوگ مجھے دوست گردانتے ہیں لیکن میرے اوپر کڑی نگاہ بھی رکھتے ہیں کہ میں کسی غیر قانونی سرگرمی میں تو ملوث نہیں ہوں۔

چنانچہ اللہ کا فضل ہے عیش گزر رہی ہے۔ شوق بھی پورا ہو رہا ہے زندگی میں گہما گہمی ہے۔ دن رات نت نئے حادثات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ سیکڑوں دوست ہیں، ان سے کہیں زیادہ دشمن ہیں، دوست کے کام آرہا ہوں دشمنوں کے سینوں پر مونگ دل رہا ہوں آپ بھی اپنی کسی ضرورت پر یاد فرمایئے۔

بھٹک گیا نا، دراصل آپ کو اپنی زندگی کے اپنے پیشے کے کچھ دلچسپ واقعات سنانا مقصود تھے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کوئی بھی انسان عقل کل ہوسکتا ہے۔ کبھی نہیں۔ ایک سے ایک دنیا میں پڑے ہیں، میرا تجربہ ہے بعض چالاکوں نے ایسی پٹخنیاں دی ہیں زندگی بھر یاد رکھوں گا، خلوص نیت سے ان کی ذہانتوں کا اعتراف کروں گا۔ جی ہاں وہ ایک سرمئی شام تھی۔ آسمان پر کچلاہٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ موسم بھنگ آلود تھا۔ نشہ آور اشیاء میں بھنگ سب سے بے ضرر نشہ ہے۔ مجھے وہی پسند ہے اور نشہ کرنے والوں میں بھنگیوں کو سب سے عزیز رکھتا ہوں۔ شراب پینے والے شرابی، چرس پینے والے چرسی اور بھنگ پینے والے میری اصلاح میں بھنگی کہلانے کے مستحق ہیں۔

بہرصورت بات موسم کی ہورہی تھی میں اپنے خوب صورت آفس کی کھڑکی کے نزدیک بیٹھا آسمان پر بکھری ہوئی کچلاہٹوں اور زمین پر پھیلی ہوئی رنگینیوں سے لطف اندوز ہورہا تھا جس علاقے میں میرا آفس واقع ہے وہ شہر کا سب سے بارونق سب سے خوب صورت علاقہ ہے۔ یہاں صبح آٹھ بجے سے رات بارہ بجے تک گہما گہمی رہتی ہے۔ کاریں ٹیکسیاں بسیں اور دوسری سواریاں دوڑتی رہتی ہیں۔ میرے سامنے بے شمار دکانیں ہیں جن پر ہر وقت خریداری ہوتی رہتی ہے۔ مظلوم شوہر، شاداں اور شاہ خرچ بیویاں ہر وقت پیش نگاہ رہتے ہیں۔ موسم کے اعتبار سے رزق برق لباس میں ملبوس چہرے دیکھتے دیکھتے میں چونک پڑا کیونکہ سامنے رکھے ہوئے انٹر کام پر اشارہ موصول ہوا تھا۔

میں نے انٹر کام آن کردیا اور میری سیکریٹری مس عرفانہ کی آواز سنائی دی۔

''سر ایک صاحب آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔''

''کارڈ بھجوادو۔''

''وہ ان کے پاس کارڈ موجود نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں بھیج دو۔'' میں نے کہا اور ٹائی کی ناٹ درست کرکے سنبھل کر بیٹھ گیا، سامنے رکھا سنہری فریم کا چشمہ آنکھوں پر لگایا جس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ اس کے لگانے کے بعد میری شخصیت نکھر آتی ہے اور سامنے والے پر خاصا عرب پڑتا ہے۔ چند ساعت کے بعد میرے کمرے کا دروازہ کھلا ایک سر نے اندر جھانکا اور ایک بھاری

آواز سنائی دی۔

''اندر آسکتا ہوں۔''

''تشریف لائیے۔'' میں نے شائستگی سے کہا اور وہ اندر آگیا۔ نفیس قسم کے کپڑے کا نفیس تراش کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ دراز قامت اور چشت و چالاک جسم کا مالک تھا رنگ و نگ صاف تھا لیکن خدو خال بدصورتی کی حد تک بھاری تھے، لیکن مجھے اس کی بدصورتی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ میں نے پوری خوش اخلاقی سے اس کا استقبال کیا اور اسے بیٹھنے کی پیش کی وہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔

''فرمایئے۔'' میں نے کہا۔

''میرا نام اکبر نوید ہے۔''

''مسرت ہوئی آپ سے مل کر، میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''وہ کیا؟''

''صرف یہی کہ اگر آپ کوئی غیر قانونی کام لینا چاہتے ہیں تو اسے میرے علم میں نہ لائیں اور اگر بات اس سے الگ ہے تو میری زبان پر اعتماد کریں۔''

وہ چند سیکنڈ گہری نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر گردن ہلاتے ہوئے بالا۔ ''کافی ہے تو محترم مجھے آپ سے ایک کام لینا ہے۔ اور حقیقت جاننے کے بعد میرا خیال ہے آپ اسے غیر قانونی نہیں سمجھیں گے۔''

''میں حاضر ہوں۔''

''میں اس کام کے لیے آپ کو معقول معاوضہ پیش کرنے کو تیار ہوں میرا خیال ہے ہماری اس سلسلے میں رد و کد نہیں ہوگی، کیا میں کام کی نوعیت بتاؤں؟''

''میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''وہ ایک چالاک عورت ہے۔ بے حد خوب صورت ہے، یعنی اس میں اتنی کشش ہے کہ کوئی بھی اس کا دیوانہ ہو سکتا ہے۔ میں ایک معزز آدمی ہوں۔ ایک اچھی حیثیت رکھتا ہوں، لیکن انسان ہوں۔ ایک تقریب میں میں اپنی بیوی کے ساتھ شریک تھا۔ وہاں اس سے میری ملاقات ہوگئی اور میں اس سے متاثر ہوگیا۔ ہمارے تعلقات بڑھے اور میں اس کا گرویدہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ ہم دوسروں کی گفتگو کا موضوع بن گئے اور حقیقت بھی یہی تھی کہ ہمارے تعلقات دوستی کی حدود سے بڑھ گئے تھے۔ میری بیوی کو بھی اس کا علم ہوگیا اور وہ افسردہ رہنے لگی۔ لیکن میں اس قدر پاگل ہو رہا تھا کہ میں نے اس کی پروا نہ کی۔ میں اس پر بے تحاشا دولت خرچ کرنے لگا۔ پھر ایک دن اس نے ایک عجیب فرمائش کر دی۔ یہ فرمائش قیمتی ہیروں کا وہ ہار تھا جو میری بیوی کی خاندانی نشانی تھا۔ یہ نشانی اس کی کئی پشتوں سے منتقل ہو رہی تھی ہمارے پاس اس قیمتی ہار کے باقاعدہ کاغذات ہیں۔ بہرحال میرے لیے یہ بے حد مشکل کام تھا، کیونکہ ویسے ہی اپنی بیوی پر کافی مظالم کر رہا تھا اور پھر وہ ہار اس کی خالص ذاتی ملکیت تھا جس پر میں کسی طور اپنا حق نہیں جا سکتا تھا لیکن اس کی فرمائش رد کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ چنانچہ میں ترکیبیں سوچتا رہا اور بالآخر ایک دن میں نے وہ ہار چرا لیا۔ اور اسے اس عورت کو پیش کر دیا۔ وہ اسے پا کر خوش ہوگئی لیکن میری بیوی کے دل پر ہار کی گمشدگی سے اتنا زبردست صدمہ پہنچا کہ وہ بیمار ہوگئی۔ میں اپنی اس کمینگی کا اعتراف ضرور کروں گا کہ مجھے اپنی بیوی کی بیماری کی کوئی فکر نہیں تھی میری محبوبہ خوش ہوگئی تھی، یہی کافی تھا۔ لیکن ایک دن اس مکار عورت کا راز میرے اوپر عیاں ہوگیا۔ پچھلے کچھ دنوں سے میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ میری طرف سے بے التفاتی برت رہی ہے۔ اب اس کی محبت میں وہ گرمجوشی نہیں رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی، میں دل برداشتہ ہونے لگا۔ لیکن میں نے اس سے کچھ نہ کہا اور شاید کبھی نہ کہتا اگر حقیقت مجھ پر عیاں نہ ہوگئی ہوتی۔ اس دن خلاف معمول میں اس سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا۔ اسے میرے آنے کی توقع نہیں تھی۔ چنانچہ اس کی خواب گاہ میں ایک اور شخص موجود تھا۔ دونوں ایک صوفے پر بیٹھے شراب پی رہے تھے اور اتفاق سے موضوع وہی ہار تھا۔ مرد لڑکی کو مبارک باد دے رہا تھا اور اس کی ذہانت کا اعتراف کر رہا تھا۔ ان کی

گفتگو سے مجھے جو اندازہ ہوا وہ یہ تھا کہ عورت نے تقریب میں وہ ہار میری بیوی کی گردن میں دیکھا اور اس پر ریجھ گئی۔ مرد بھی اس کے ساتھ تھا۔ عورت نے اس سے دعوا کیا کہ وہ ہار اپنی ذہانت سے حاصل کر سکتی ہے اور اس کے بعد اس نے مجھ پر ڈورے ڈالے تھے اور بالآخر وہ اپنے دعوے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ آپ غور کریں سکندر صاحب اس انکشاف کے بعد میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ میں نے اپنی مظلوم بیوی پر ظلم کیا۔ اس مکار عورت پر اعتماد کیا اور اتنا بڑا دھوکا کھایا۔ میری آنکھیں کھل گئیں اور میں خاموشی سے واپس چلا آیا۔ اور پھر میں اپنی بیوی کی تیمارداری میں لگ گیا۔ میں نے اس سے اپنی زیادتیوں کی معافی مانگی۔ ہر طرح سے اس کی دلجوئی کی تب اس نے بتایا کہ وہ ہار اس کے لیے ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس ہار سے بہت سی روایات وابستہ ہیں۔ اس ہار کے بغیر اس کی زندگی ممکن نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک بار پہلے بھی یہ ہار اس کے خاندان سے گم ہوگیا تھا لیکن اس وقت یہ جس کی ملکیت تھا وہ جانبر نہ ہوسکی تھی۔ سکندر صاحب، میری مظلوم بیوی نے کہا کہ وہ بھی زندہ نہ رہ سکے گی۔ اس نے اس کے باوجود مجھ سے ہار واپس لینے کی فرمائش نہیں کی تھی۔''

سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ اس کی آواز بھرا گئی اور میں بغور اس کا جائزہ لیتا رہا۔

''سکندر صاحب! میں نے اس سنگدل عورت سے ہار واپس مانگا۔ میں نے اس کی منہ مانگی قیمت پیش کرنے کے لیے کہا لیکن وہ تیار نہ ہوئی۔ میں ایک شریف انسان ہوں اس سے زیادہ کچھ کرنے کی جرأت مجھ میں نہیں ہے۔ میں ہر کوشش کر کے ہار گیا اور اب میں آپ کے پاس اپنی یہ مشکل لے کر آیا ہوں۔''

کام میرے لائق تھا اور دلچسپ تھا۔ گویا مجھے وہ ہار حاصل کرنا تھا۔ لیکن کس طرح یہ میرا کام تھا۔ اور میں خود اس شخص کی مدد کے لیے آمادہ پاتا تھا۔ لیکن اس سے قبل کچھ اطمینان ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

''کیا آپ مجھے اس ہار کے کاغذات دکھا سکتے ہیں۔''

''ہاں میں ساتھ لایا ہوں۔'' اس نے کہا اور جیب سے ایک بوسیدہ لفافہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اس لفافے میں چند دستاویزات تھیں، ایک غیر معروف خاندان کی دستاویزات جس میں مختلف عورتوں نے ہار اپنی اولاد میں منتقل کرنے کا اعتراف کیا تھا۔ آخری دستاویز پر انگوٹھا لگا ہوا تھا اور اس پر ایک خاتون کا نام لکھا ہوا تھا۔ گویہ کاغذات کوئی مکمل ثبوت نہ تھے۔ لیکن بہرحال کام ہی ایسا تھا کہ مجھے ان پر یقین کرنا ہی تھا۔ تاہم میں نے اس سے ایک بات اور کہی۔

''اکبر نوید صاحب کیا میں آپ کی بیگم سے ملاقات کر سکتا ہوں؟''

''کس حیثیت سے؟'' اس نے پوچھا۔

''حیثیت کا تعین آپ خود کرلیں۔ میں ان سے ہار کا تذکرہ نہ کروں گا۔ میرا خیال ہے آپ مجھے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ان سے ملا سکتے ہیں۔''

''مجھے اعتراض نہیں ہے۔''

''تب ٹھیک ہے میں آپ کا کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کیا آپ کچھ اور باتیں بتا سکتے ہیں؟''

''مثلاً۔''

''وہ خاتون کون ہیں جن کے پاس آپ کا ہار ہے؟''

''اس کا نام نیلم شوکت، باپ ہندوستانی تھا۔ ماں جرمن دونوں کا امتزاج ہے۔ سترہ ڈاؤن اسٹریٹ میں رہتی ہے۔''

''گڈ کیا۔ ہار اس کے پاس موجود ہے۔ اس نے کسی لاکر وغیرہ میں رکھوا دیا ہے۔''

''مجھے اس بارے میں نہیں معلوم۔''

''خیر یہ میں معلوم کرلوں گا، لیکن مجھے کچھ وقت لگ جائے گا۔''

''کوئی ہرج نہیں ہے۔''

''تب پھر آپ کل صبح تشریف لایئے۔ میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے آپ کے ساتھ چلوں گا۔''

''بہت بہت شکریہ..... آپ میرے اوپر اور ایک مظلوم عورت پر احسان کریں گے۔'' اس نے کہا پھر میری رقم میں سے آدھی رقم ایڈوانس دے دی اور مصافحہ کر کے واپس چلا گیا۔

ان دنوں میرے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ چنانچہ میں پوری دلچسپی سے اس کیس میں کام کرنے پر غور کرنے لگا اور پھر اب تو میں ایڈوانس کی رقم بھی وصول کر چکا تھا۔ میں غور کرتا رہا اور پھر اپنے آفس سے نکل آیا۔ مجھے اسی وقت سے اپنا کام شروع کر دینا تھا۔ چنانچہ میری چھوٹی سی کار ڈاؤن اسٹریٹ کی طرف چل پڑی۔ ڈاؤن اسٹریٹ پہنچ کر میں نے اپنے ذرائع سے نیلم شوکت کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل کیں۔ پتہ چلا کہ سیاہ رنگ کی مرسڈیز اکثر آتی ہے جس سے ایک نوجوان اترتا ہے اور کافی دیر گزار کر جاتا ہے۔ عام حالات مین تنہا رہتی ہے۔ شام کو کسی کلب وغیرہ میں جاتی ہے۔ بہرحال اس کی سرگرمیاں پڑوسیوں کے لیے تکلیف دہ نہیں تھیں۔ لیکن پڑوسیوں کو اس کے بارے میں تجسس ضرور تھا۔

یہ معلوم نیلم کے کردار کو واضح کرتی تھیں، بہرحال اتنا انداز ہو جاتا تھا کہ وہ کوئی شریف عورت نہیں ہے، خود مختار ہے اور ایسی عورت ناجائز ذرائع آمدنی رکھ سکتی ہے۔ جیسے اکبر نوید کا معاملہ تھا، یہ معلومات کر کے میں واپس آ گیا۔

پھر دوسرے دن صبح مجھے اکبر نوید کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ ساڑھے دس بجے کے قریب آ گیا۔ میرے پاس ڈاکٹر کا بیگ اور اسٹیتھو اسکوپ وغیرہ تیار تھا۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ چل پڑا، ایک خوب صورت سے علاقے میں ایک فلیٹ میں اکبر نوید کی رہائش تھی۔ وہ مجھے اپنے چھوٹے سے لیکن اعلا پیمانے پر ڈیکوریٹ فلیٹ میں لے گیا اور پھر اس نے مجھے اپنی بیوی سے ملایا۔

ایک خوب صورت سی زرد چہرے والی عورت تھی مسہری پر ایک ریشمی کمبل ڈالے لیٹی تھی۔ آنکھوں اور چہرے سے بیماری کا اظہار ہوتا تھا۔ میں اس سے ایک ڈاکٹر کی طرح پیش آیا۔

''ڈاکٹر صاحب! دراصل میرے شوہر مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ اس لیے میرے بارے میں فکر مند رہتے ہیں۔ مجھے کوئی بیماری نہیں ہے بس کمزوری ہے۔ جس کی وجہ سے بخار وغیرہ آ جاتا ہے۔ براہ کرام آپ ان کا وہم دور کریں۔'' اس نے نحیف آواز میں مجھ سے کہا اور اس کی وفا پرستی سے بہت متاثر ہوا حالانکہ اکبر نوید نے اس پر کتنا ظلم کیا تھا۔ لیکن آج بھی اس کی آنکھوں میں محبت کروٹیں بدل رہی تھی۔ آج بھی اس کے دل میں وفا کا سمندر موجزن تھا۔

میں نے اکبر نوید کی طرف دیکھا اس کا چہرہ شرمندگی کا آئینہ دار تھا۔ بیوی کے الفاظ نے اسے اور شرمندہ کر دیا تھا۔ بہرحال اس سے اور کوئی اندازہ ہوا یا نہ ہوا ہو مجھے اکبر نوید کی کہانی پر ضرور یقین آ گیا تھا۔ میں نے رسمی طور پر ڈاکٹروں کے انداز میں اکبر کی بیوی کو دیکھا۔ کچھ نسخے لکھے اور پھر اکبر مجھے چھوڑنے آیا۔

''کہیے سکندر صاحب، آپ کو میری بات کا یقین آیا؟''

''یقین تو اسی وقت آ گیا جب میں نے آپ کے لیے کام کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔'' میں نے کہا۔

''شکریہ.....'' وہ خوش ہو کر بولا۔ ''پھر اب میں کب آپ سے ملاقات کروں۔''

''میرا خیال ہے آپ مجھ سے قطعی ملاقات نہ کریں۔ بلکہ میرے سائے سے بھی دور رہیں تاکہ اسے کسی طرح میرے اور آپ کے تعلقات کا علم نہ ہو۔ بس اس وقت آپ سے خود ملوں گا جب آپ کا کام کر لوں گا۔ یا اگر کسی وجہ سے آپ سے ملاقات کی ضرورت پیش آئی۔''

''میں منتظر رہوں گا۔ براہ کرم جلدی کریں، مجھ سے اپنی بیوی کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔''

''آپ فکر نہ کریں۔'' میں نے اسے طمینان دلایا اور واپس دفتر پہنچ گیا۔ نیلم سے راہ و رسم بڑھائی جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ وہ ہار کہاں رکھتی ہے۔ ویسے اگر وہ قیمتی ہار ہے تو اسے گھر میں رکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، پھر بھی اس کے گھر کی تلاش لینے میں کیا ہرج ہے۔

پھر اس کی غیر موجودگی میں نے تمام گھر کی تلاش لے ڈالی اور مجھے وہاں کچھ نہ ملا۔ اس کے بعد میں نے نیلم کے اس کلب تک رسائی حاصل کی اور پھر ایک شام وہ لڑکی نیلم ہار پہن رک کلب میں داخل ہوئی اور میں چونک پڑا۔ میں نے اسے ڈانسنگ فلور پر جالیا اور اس کے ساتھ ڈانس کرنے لگا۔ پھر ایک موقع پر میں نے وہ ہار اڑالیا۔ اور پارکنگ میں اپنی کار کی طرف چل پڑا۔ اتفاقیہ طور پر ہی یہ کامیابی ملی تھی۔ بہرحال اپنی کار تک پہنچا، کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا ابھی کچھ دور ہی گیا ہوں گا کہ اچانک ہی ایک عورت میری کار کے سامنے آگئی اور کار رکنے کا اشارہ کرنے لگی۔ میں نے کار روک دی اور اس نے میرے قریب آکر ایک پتا بتا کر چھوڑنے کی درخواست کی میں نے ازراہ ہمدردی اسے اپنے ساتھ بٹھالیا۔ کار تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ اس نے اچانک ہی کہا۔

''میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتی لیکن میں نے چالاکی سے آپ کو ہار اتارتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔''

''اوہ ..... میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں اس کی بات سے کافی محظوظ ہوا تھا۔ ظاہر ہے وہ مجھے چور سمجھی تھی لیکن یہ الفاظ ادا کرنا بھی اس کے لیے مشکل تھا بہرحال وہ اجنبی لڑکی میری حقیقت سے واقف نہیں تھی۔

''آپ وہاں کیا کر رہی تھیں؟'' میں طنز سے پوچھا۔

''سچ پوچھیں تو میں بھی اس کی تاک میں تھی۔ آپ کو شاید یقین نہیں آئے گا۔ نیلم جس کلب میں جاتی ہے میرے ڈیڈی بھی اسی کلب کے ممبر تھے۔ انہیں جوئے کی لت پڑ گئی اور وہ تمام دولت کے ساتھ ساتھ یہ ہار بھی جوئے میں ہار گئے جو نیلم نے جیت لیا تھا۔ سب کچھ ہارنے کے بعد وہ گھر واپس آگئے۔ وہ خودکشی تو نہ کرسکے لیکن شدید بیمار پڑ گئے اور اس دن سے مسلسل بیمار ہیں۔ میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ مجھے یہ ہار دے دیں اس کی کوئی قیمت بھی مجھ سے وصول کرلیں۔ میں اپنے ڈیڈی کی زندگی کے لیے اپنی عزت اپنی نسوانیت بھی قربان کرنے کو تیار ہوں۔'' وہ رونے لگی اور میں اس کی اداکاری کو دیکھنے لگا۔ ہاں اسے اداکاری ہی کہہ سکتا تھا اور اگر یہ اداکاری نہیں تھی تو پھر اور کیا تھی۔ میں اکبر نوید کی بیمار بیوی کو بھی دیکھ چکا تھا اور اب کسی بیمار ڈیڈی کی بات کی جارہی تھی۔ دونوں میں سے کس کو سچا سمجھتا لیکن پھر مجھے لڑکی کی اداکاری حقیقت سے قریب معلوم ہونے لگی۔ کیا وہی سچی ہے میں نے سوچا تب پھر وہ کاغذات جو اکبر نوید نے مجھے دکھائے تھے۔ دفعتہً میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے کہا۔

''کیا آپ مجھے اپنی ڈیڈی سے ملوا سکتی ہیں۔ ابھی اور اس وقت۔'' میرے اس سوال پر وہ خاموش ہوگئی پھر دھیمے میں بولی۔

''یقیناً آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں لیکن میں آپ کو ان سے ابھی ملواؤں گی۔'' پھر وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔ جہاں اس کا باپ عسرت زدہ سا پڑا تھا۔ بہرحال اس سے کچھ باتیں ہوئیں یہاں بھی مجھے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ہی روشناس کرایا گیا تھا۔ میں نے اس لڑکی سائرہ سے کہا کہ ایک اور صاحب بھی اس ہار کے دعوے دار ہیں۔ مجھے اپنی تسلی کرلینے دو اگر وہ فراڈ ثابت ہوئے تو میں ہار تمہیں واپس کردوں گا میرا وعدہ ہے۔ واپسی پر میں نے ایک فیصلہ کیا کہ اکبر نوید سے وہ کاغذات لے کر انہیں جانچ کرلوں، اگر وہ صحیح ہوئے تو اس کا مطلب ہے کہ اکبر سچ بول رہا ہے۔

پھر دوسرے دن میں اکبر کے گھر پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر چونک سا گیا۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے کہا۔

''براہ کرام وہ ہار کی تفصیل والے کاغذات جو آپ نے مجھے دکھائے تھے ایک بار پھر دکھائیں۔''

''ضرور..... لیکن ان کی کیا ضرورت پیش آگئی؟''

''اپنی تشفی چاہتا ہوں اور کوئی بات نہیں ہے۔''

''میں لاتا ہوں۔ اکبر کمرے سے چلا گیا۔ آج مجھے اس کا رویہ کچھ مشکوک سا محسوس ہوا تھا۔ پھر کچھ

دیر کے بعد وہ کاغذات لے آیا اور میں نے کاغذات اس سے لے لیے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو انہیں ایک دن کے لیے رکھ لوں۔''

''اگر کوئی ایسی ہی ضرورت ہے تو رکھ لیجیے حالانکہ یہ اصول کے خلاف ہے؟'' اس نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

''آپ بے فکر رہیں اکبر صاحب۔ میں آپ سے ایمانداری کا وعدہ کر چکا ہوں۔ شام تک کاغذات آپ کو واپس مل جائیں گے اور شاید ہار بھی میں نے کہا اور وہ گردن ہلانے لگا۔ پھر میں نے چند منٹ اس سے رسمی گفتگو کی اور پھر اجازت لے کر نکل آیا۔ اب میرا رخ پروفیسر ہمدانی کی طرف تھا جو تحریروں کے ماہر تھے۔ آفس میں مل گئے میں نے اپنا مدعا بیان کیا اور کاغذ ان کے سامنے رکھ دیے۔ وہ انہیں لے کر اپنی لیب میں چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد واپس آئے۔

''کچھ معلوم ہوا؟'' میں نے بے قراری سے پوچھا۔

''بہت کچھ۔'' پروفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو بتاؤ۔''

''پہلی بات..... کاغذ بہت پرانے استعمال کیے گئے ہیں۔ لیکن سیاہی نئی ہے۔ ایک ہفتے سے زیادہ پرانی نہیں ہو سکتی۔ گو مختلف تحریری میں انداز میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور سیاہیاں بھی مختلف قسم کی استعمال کی گئی ہیں۔ لیکن تحریر ایک ہی ہیں۔ ایک ہی ہاتھ سے لکھی گئی ہے۔''

''کافی ہے۔'' میں نے کہا اور وہ کاغذات سمیٹ کر رکھ لیے۔ پھر اس سے اجازت لے کر میں باہر نکل آیا۔ اکبر نوید کا فراڈ ثابت ہو گیا تھا۔ اب صرف اس لڑکی سائرہ کے بارے میں اطمینان کرنا تھا۔ چنانچہ میں نیلم کے مکان کی طرف چل پڑا۔ نیلم کے مکان پر پہنچ کر میں نے بیل بجائی اور ملازم نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے اپنا کارڈ اسے دیا اور چند منٹ کے بعد مجھے اندر بلا لیا گیا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا گیا۔ جہاں میں پہلے چوروں کی طرح گیا تھا۔ اور میں نیلم کا انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ کے بعد ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور نیلم اندر آ گئی۔ مجھے دیکھ کر اس پر وہی ردعمل ہوا جو ہونا چاہیے تھا وہ بھونچکی رہ گئی اور پھر اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''خوب بڑے دیدہ دلیر ہو، چوری کرنے کے بعد شکایت بھی کرنے آئے ہو۔''

''شکایت۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''میں تمہارا کارڈ پڑھ چکی ہوں۔ غیر ممالک میں بھی پرائیویٹ سراغ رساں تمہاری طرح ہوتے ہیں لیکن شاید چور نہیں ہوتے۔''

''ممکن ہے کسی نے مجھے اس کے لیے مجبور کیا ہو؟''

''اس کا نتیجہ بھی انہوں نے دیکھ لیا۔ اب کیا تم مجھ سے اصلی ہار مانگنے آئے ہو۔''

''اصلی ہار.....'' میں اچھل پڑا اور وہ غور سے میری شکل دیکھنے لگی پھر بولی۔

''پھر تم شاید ابھی تک حقیقت سے بے خبر ہو، خیر بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''

''مس نیلم، درحقیقت آپ حد سے زیادہ چالاک ہیں۔ میں آپ کو پوری تفصیل بتاتا ہوں۔ امید ہے آپ میری مدد کریں گی۔''

''ضرور۔'' اس نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے اپنی داستان اسے سنانا شروع کر دی، اس نے دلچسپی سے پوری داستان سنی اور سائرہ یا اکبر کے نام پر اس نے حیرت کا اظہار نہیں کیا بلکہ اسی طرح مسکراتی رہی۔ پھر میری پوری داستان سن کر ہنس پڑی اور بولی۔

''غیر ممالک کے سراغ رساں تم سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں میرا خیال ہے ابھی تمہیں اپنے پیشے میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ سنو دونوں فراڈ ہیں۔ نہ سائرہ کا کوئی باپ بیمار ہے اور نہ ہی اکبر کی بیوی، ہار میری ملکیت ہے اور وہ تمہارے ذریعے اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں، لیکن دونوں بے وقوف ہیں اور تیسرے تم، کیا تمہارے خیال میں اس قیمتی ہار کی طرف سے میں غافل تھی۔ وہ ہار جو تم نے اس رات میری گردن سے

اتارا ہے چند سو روپے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ اس ہار کی کامیاب نقل ہے اور صاف شیشے کا بنا ہوا ہے۔ اصلی ہار میرے پاس ہے۔ ٹھہرو میں تمہیں دکھاتی ہوں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ میں سکتے عالم میں تھا یہ گورکھ دھندہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ یہ خیال ہے میرے پر ہتھوڑے برسا رہا تھا کہ جوہار میں لے کر گیا ہوں نقلی ہے۔

کئی منٹ گزر گئے لیکن واپس نہ آئی۔ تب میں اچھل پڑا۔ نکل گئی میرے ذہن میں نعرہ گونجا اور دوڑتا ہوا باہر آیا۔ ملازمہ سے میری ٹکر ہوتے ہوئے بچی۔

''مس نیلم کہاں ہیں؟'' میں نے ساختہ پوچھا۔

''میم صاحب کسی ضروری کام سے گئی ہیں اور یہ خط آپ کے لیے دے گئی ہیں۔'' اس نے کہا اور میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے لفافے سے پرچا نکالا لکھا تھا۔

''مسٹر۔ درحقیقت ان دونوں کے ساتھ تم بھی گدھے ہو۔ سنو گدھے نمبر تین، سائرہ فراڈ ہے۔ اکبر نوید بھی فراڈ ہے۔ دراصل وہ قیمتی ہار ہم تینوں نے مل کر فرانس کے ایک میوزیم سے چرایا تھا۔ تم اگر تحقیقات کرو تو ہار کی چوری کی تفصیل معلوم ہوسکتی ہے، لیکن وہ دونوں گدھے اس کے اہل نہیں تھے۔ اس لیے میں انہیں جل دے کر یہاں آگئی۔ یہاں میں نے ہار کی نقل تیار کرائی کیونکہ مجھے یہ خطرہ تھا کہ وہ اسے حاصل کرنے کی کوشش ضرور کریں گے اور وہی ہوا۔ انہوں نے تمہیں آلہ کار بنایا۔ لیکن بہرحال وہ یہاں ہیں اس لیے میرا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ تم میری گرد بھی نہ پاسکو گے۔ خدا حافظ۔''

اور درحقیقت میں اس کی گرد بھی نہ پاسکا۔ میں نے شام تک اسے جگہ جگہ تلاش کیا لیکن بے سود میں نے فرانس کے میوزیم سے ہار کی چوری کی تفصیل بھی معلوم کی اور نیلم کے بیان کی تصدیق ہوگئی۔ اب کیا کیا جاسکتا تھا۔ سوچتا رہا اور پھر ایک بات میرے ذہن میں آئی اور میں مطمئن ہوگیا۔

شام کو میں نے نقلی ہار اس جگہ سے نکالا جہاں میں نے اسے محفوظ کیا تھا اور اسے لے کر اکبر نوید کے گھر کی طرف چل پڑا۔ اکبر نوید مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ تب میں نے اس کے کاغذ اور نقلی ہار اس کے سامنے رکھ دیا۔ ہار دیکھ کر اس کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہوگیا تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے ہار اٹھالیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ پھر بڑے جذباتی انداز میں بولا۔

''تم نہیں جانتے کہ تم نے میرے لیے کیا کیا ہے۔ اب میری بیوی کی حالت اچھی ہوجائے گی اور میں اس بے شرم نیلم کو ہمیشہ کے لیے بھول جاؤں گا۔''

''ویری گڈ، لیکن وہ اس وقت نظر نہیں آرہی ہیں۔'' میرے اس اچانک سوال پر وہ جز بز ہوگیا پھر سنبھل کر بولا۔

''وہ اس کے رشتے کی ایک خالہ ہیں وہ اپنے گھر لے کر گئی ہیں تاکہ دل تھوڑا بہل جائے۔ دو تین دن میں واپس آجائے گی۔''

''جی تو آپ آپ کو آپ کا ہار مل گیا اور حسب وعدہ میرا معاوضہ۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں، بالکل تمہارا معاوضہ ملے گا۔ ویسے تم نے یہ ہار اس سے کیسے حاصل کیا؟''

''جانے دیجیے۔ سراغ رساں بھی کہتے ہیں اور سراغ لگانے کے بعد کام ہوگیا تو حیران ہیں۔ بلکہ کام تو مجھے ڈبل کرنا پڑا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے کہ ہار میں نے اس کی ملکیت سے چرایا ہے۔ اس طرح میں نے نہ صرف ہار کا سراغ لگایا ہے بلکہ اسے اڑا بھی ہے۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں تمہیں اس کا ڈبل معاوضہ دوں گا۔'' اکبر خوشی سے دیوانہ ہوا جارہا تھا۔ پھر وہ اندر گیا اور میری مطلوبہ رقم کا ڈبل مجھے ادا کردیا گیا۔ میں نے نوٹ جیب میں رکھ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور باہر نکل آیا۔ پھر دوسرے میں نے نیلم کے خط کی فوٹو اسٹیٹ کی کاپیاں نکلوائیں جن میں سے ایک میں نے سائرہ کو پوسٹ کردی اور دوسری اکبر نوید کو۔ میں گدھا نہیں بن سکا تھا اور میں نے اپنا کام پورا کردیا تھا۔

☆☆

سال نو

جمیل احمد

ایک معصوم شخص کا احوال جو ایک اسپتال میں سپروائزر کے طور پر کام کرتا تھا۔ وہ درحقیقت ایک سرجن تھا لیکن کسی بھی قسم کے آپریشن کے دوران اس کے ہاتھوں میں لرزش آجاتی تھی۔ نئے سال کی آمد کے جشن پر اسپتال میں اسے ایک بچی کو سنبھالنا پڑا جو زخمی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی پر اس کی کمزوری ظاہر ہو، مگر حالات کے تحت وہ مجبور تھا کہ اس کام کو وہی انجام دے..... پھر جب اس نے ہمت باندھی تو.....؟

ایک ماہر ڈاکٹر کا قصہ، وہ ایک الجھن کا شکار تھا

ڈاکٹر فریڈ خاموشی کے ساتھ انگلیوں سے میز پر ایک مقبول نغمے کی دھن بجانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بیوی صوفیہ پر حسب معمول ہسٹیریا کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر اسے برا بھلا کہہ رہی تھی۔ اب اسے کان بند رکھنے کی خاصی مشق ہوگئی تھی۔ صوفیہ کی چیخ و پکار سننے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اسے وہ سارے دلائل ازبر یاد تھے جو اب کثرت استعمال کے باعث باسی ہوگئے تھے۔ صوفیہ سانس لینے کے لیے رکی تو اس نے جلدی سے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ فرار ہونے کا موقع تلاش کر رہا تھا لیکن اس کی بیوی آج اس کی جان نہ چھوڑنے کا تہیہ کیے ہوئے تھی کیونکہ آج اکتیس دسمبر کی شب تھی اور چند گھنٹوں بعد نیا سال شروع ہونے والا تھا۔ کرسمس کے بعد سب سے بڑا تہوار جب ٹھیک بارہ بجے ہر شخص اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہوجاتا ہے اور کچھ دیر کے لیے عقل کے پاسبان کو پابند سلاسل کر دیتا ہے۔

''ڈھول بجاتے رہو گے، میری بات نہیں سنو گے۔'' صوفیہ نے اسے اپنی طرف متوجہ نہ پا کر کہا۔

اس کی انگلیاں منجمد ہوگئیں۔ ''سن رہا ہوں۔''

''کیا تم اس گھٹیا ملازمت سے وقت نکال کر مجھے ڈاکٹر سیمسن کی پارٹی میں نہیں لے جاسکتے؟''

''اس گھٹیا ملازمت کی بدولت ہی یہ چھت ہمارے سروں پر قائم ہے صوفیہ!'' اس کا یہ جواب بھی بہت پرانا ہوگیا تھا۔ ''یہ ان کی مہربانی ہے کہ انہوں نے مجھے یہ ملازمت دے دی، ورنہ میں اس کے قابل بھی نہیں تھا۔''

''نہیں، یہ ملازمت ڈاکٹر سیمسن کی مہربانی سے ملی ہے اور یہ پارٹی بھی ڈاکٹر سیمسن کے گھر پر ہو رہی ہے۔ انہوں نے بہت سے مہمانوں کو مدعو نہیں کیا ہے۔ وہاں ڈاکٹر سیمسن اور اس کی بیوی، اس کی لڑکی اور داماد، ڈاکٹر فریم اور اس کی منگیتر اور اس ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر سیمسن تمہارا محسن ہے۔ اس نے تمہیں مدعو کیا ہے۔ کیا تم اپنے محسن کی دعوت ٹھکرا دو گے؟'' اور پھر اپنے شوہر پر ان حوالوں کا کوئی اثر نہ دیکھ کر وہ خوشامدانہ لہجے میں کہنے لی۔

''صرف آج رات، فریڈ! پلیز آج رات

اسپتال کو کسی سپروائزر کی ضرورت نہیں۔ تم نے خود بتایا تھا کہ اسپتال کے آدھے سے زیادہ وارڈ خالی پڑے ہیں۔ جو مریض ذرا بھی صحت یاب ہو گئے تھے، وہ نئے سال کا تہوار منانے کے لیے اپنے اپنے گھر چلے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ تم نے کرسمس کی چھٹیوں اور کرسمس کے موقع پر بھی چھٹی نہیں کی تھی۔ تم اس وقت بھی اسپتال میں ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔''

''اس لیے کہ تم کرسمس کا تہوار منانے کے لیے اپنے والدین کے گھر چلی گئی تھیں۔'' ڈاکٹر فریڈ دوبارہ انگلیوں سے میز کی سطح بجانے لگا۔ ''تم اکیلی پارٹی میں چلی جاؤ۔''

صوفیہ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا پھر اس کے چہرے پر سرخی چھانے لگی۔ اس کے وجود میں دہکتی ہوئی آگ بس اچانک ہی بھڑکتے ہوئے شعلوں میں تبدیل ہو گئی تھی، جس کی تپش اب اس کے وجود سے باہر بھی محسوس کی جا سکتی تھی۔

''نہیں، نہیں..... نہیں۔'' وہ بری طرح چیخنے لگی اور دونوں ہاتھوں سے اپنے ریشم جیسے بال نوچنے لگی۔ ''میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں یہاں تنہا اس قید خانے مین رہوں گی۔ میں تنہا نئے سال کا استقبال کروں گی۔ نیا زرق برق لباس پہن کر، خوب بن کر سنور میں یہاں ٹھنڈے فرش پر بیٹھ جاؤں گی۔ میرے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا گلاس ہوگا اور جب گھنٹہ ٹن ٹن کر کے بارہ جائے گا تو میں اسپرین کی دو گولیاں منہ میں ڈال کر پانی کا گلاس پی جاؤں گی اور پھر اس قید خانے کی دیواروں سے چیخ چیخ کر پوچھوں گی کیوں؟ آخر کیوں.....؟''

اور پھر صوفیہ کو بھی احساس ہو گیا کہ وہ بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ وہ اذیت پسندی کی حد پھلانگ کر اذیت کوشی کی سرحدوں میں بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ سب ہی کو اس کیوں کا جواب معلوم تھا۔ وہ خبر تمام اخباروں میں شائع ہوئی تھی۔ اس رات اس کا شوہر

اا لٹر فریڈی رات گئے واپس گھر آ رہا تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ وہ بہت تیز گاڑی چلا رہا تھا کہ ایک موڑ پر اچانک دوسری گاڑی سامنے آ گئی۔ پھر ایک زوردار دھماکے کے ساتھ دونوں گاڑیاں ٹکرائیں۔ دوسری گاڑی میں ایک معمر جوڑا سفر کر رہا تھا۔ عورت کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ کر پانچ جگہوں سے باہر نکل آئی اور شریانوں سے خون بہنے لگا۔ اس کا شوہر خوف و دہشت سے کانپتا ہوا ڈاکٹر فریڈ کو مغلظات بک رہا تھا اور ڈاکٹر فریڈ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بہتے ہوئے خون کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہنگامی حالات میں استعمال ہونے والی ادویات کا بکس اس کے ساتھ تھا لیکن ہاتھوں کی کپکپاہٹ نے اس کی ہر کوشش ناکام بنا دی۔ وہ زخمی عورت کو بچانے کی کوشش کرتا رہا، کرتا رہا اور وہ عورت آہستہ آہستہ اس کی نظروں کے سامنے مرتی رہی اور پھر ایک ہچکی لے کر ہمیشہ کے لیے موت کی آغوش میں سو گئی۔

کیوں؟ آخر کیوں.....؟

ڈاکٹر فریڈ کی مٹھی پوری قوت سے بھینچی ہوئی تھی۔ میز پر بچھا ہوا کپڑا، اس کی مٹھی میں دبا ہوا تھا۔ بدن کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ کر بہہ رہا تھا۔ اس کے عضلات کھنچے ہوئے تھے۔ وہ پسینے میں نہا گیا تھا۔ صوفیہ کی آواز ایک چیخ کے بعد خاموش ہو گئی، دوسرے لمحے وہ دوڑ کر اس کے پاس آئی اور اس کے شانے پکڑ کر لرزتی آواز میں بولی۔

''نہیں، نہیں۔'' وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

''اوہ فریڈ! پلیز میں پاگل ہوں۔ ڈارلنگ پلیز مجھے معاف کر دو..... مجھے معاف کر دو..... پلیز مجھے معاف کر دو۔''

فریڈ پوری قوت کے ساتھ خود کو ٹوٹنے پھوٹنے سے بچائے ہوئے تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں پر نظریں جما رکھی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ بھاری سانسوں کا بوجھ کم کرتا گیا۔ اس کی اعصاب جو پیانو کے تاروں کی طرح تنے ہوئے تھے، ڈھیلے پڑنے لگے۔ کانوں میں بجنے والی سیٹیاں دھیمی پڑنے لگیں۔ چند لمحوں بعد اس نے ایک گہرا سانس لیا اور مڑ کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا، جس کا خوب صورت چہرہ شرمساری کے جذبے سے عرق آلود تھا۔ وہ بڑی محنت و اپنائیت کے ساتھ اپنے رومال سے فریڈ کا پسینہ خشک کرنے لگی۔ اس نے اٹھ کر کوٹ پہنا اور خاموشی سے باہر چلا گیا۔

☆☆☆

اسپتال میں ڈاکٹر فریڈ کی ڈیوٹی رات آٹھ بجے سے صبح آٹھ بجے تک تھی۔ صوفیہ کی وجہ سے اسے کچھ تاخیر ہو گئی تھی۔ چیف سپروائزر تھامس بے تابی سے ٹہلتے ہوئے اس کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ فریڈ پر نظر پڑتے ہی اس نے سکون کا گہرا سانس لیا اور مسکرانے لگا۔ دوسروں کی طرح وہ بھی اپنی بیوی اور دوستوں کے ساتھ نئے سال کو خوش آمدید کہنا چاہتا تھا۔

''ہیلو فریڈ۔'' تھامس نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ اس نے بہت پہلے اس کے لیے ڈاکٹر فریڈ کا لفظ استعمال کرنا ترک کر دیا تھا۔ ''ایڈمنسٹریشن اسکول کا ایک ہونہار طالب علم۔ بارٹن یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ یہ جو تعلیم حاصل کر رہا ہے اس کا آخر کیا انجام ہوگا۔'' تھامس نے زبردستی قہقہہ لگایا۔

فریڈ نے آگے بڑھ کر اس نوجوان سے ہاتھ ملایا جس سے متعلق ہر شے صاف ستھری اور چمک دار تھی۔

''اسے اپنے ساتھ اسپتال کے تمام شعبے دکھا دو، مردہ خانہ بھی۔ بارٹن بھی کیا یاد کرے گا۔'' تھامس اس روز غیر ضروری طور پر خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ فریڈ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا تو اسے وہاں احساس جرم کے تاثرات نظر آئے۔ وہ سمجھ گیا کہ بارٹن اس کا کوئی بھانجا بھتیجا ہے جو اسپتال کے انتظامی امور کی باقاعدہ تعلیم حاصل کر رہا ہے یا کر چکا ہے اور بہت جلد مسٹر تھامس اپنے بھانجے بھتیجے کو اس کی جگہ لا کر بٹھا دیں گے جس کے بعد وہ اس ملازمت سے بھی محرومی ہو جائے گا۔

تھامس چلا گیا۔ ''سگریٹ۔'' بارٹن نے اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

''شکریہ، یہاں نہیں۔'' فریڈ نے کہا اور میز پر

رکھا ہوا پیڈ دیکھنے لگا جس پر تھامس نے اس کے لیے ضروری ہدایات لکھی تھیں۔

وارڈ نمبر پانچ کی مریض کو شعبہ نفسیات میں منتقل کرنا ہے۔ مزاحمت کی طرف سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

غیر فنی ملازمین پر کڑی نظر رکھی جائے۔ نئے سال کے تہوار پر وہ بے قابو ہو سکتے ہیں۔

[illegible] وارڈ اسٹاف کی کمی کا شکار ہے، اس لیے [illegible]

[illegible] ہیں۔

اور نیورو، یورولوجی اور پیڈریاٹک میں تینوں فنی ماہرین نئے ہیں، انہیں مشورے اور رہنمائی کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

آکسیجن تھراپسٹ بیمار ہے۔ اس کا نعم البدل تلاش کرنا ہوگا۔

فریڈ نے پیڈ سے ہدایت نامہ پھاڑ کر جیب میں ڈال لیا۔ بارٹن غور سے اس کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔

''آؤ چلیں، ذرا ایک راؤنڈ لگانا ہے۔''

وہ ہال عبور کرتے ہوئے لفٹ میں داخل ہوئے۔

''بائیسویں منزل۔'' فریڈ نے لفٹ مین کو ہدایت کی۔

بارہویں منزل پر ایک نرس لفٹ میں داخل ہوئی، وہ فریڈ کو دیکھ کر مسکرائی۔

''ہیلو ڈاکٹر فریڈ! رات بارہ بجے آپ ہمارے کمرے میں آئیں، ہم نے نئے سال کے استقبال کے لیے کچھ انتظام کیا ہوا ہے۔''

بائیسویں منزل پر جب وہ لفٹ سے باہر نکلے تو بارٹن نے سگریٹ جلاتے ہوئے غور سے فریڈ کی طرف دیکھا۔

''کیا آپ باقاعدہ ڈاکٹر ہیں؟''

فریڈ نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس جواب پر بارٹن کچھ پریشان سا ہو گیا۔ چند لمحے توقف کے بعد اس نے پھر سوال کیا۔

''لیکن سپروائزر کے لیے ڈاکٹر ہونا قطعی ضروری نہیں ہے۔ کیا اس اسپتال میں سپروائزر کے لیے سند یافتہ ڈاکٹر ہونا ضروری ہے؟''

فریڈ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ بارٹن کے چہرے پر فکرمندی کی اثرات نمایاں تھے۔ تب فریڈ کو یقین ہو گیا کہ بارٹن اس کی ملازمت کے پیچھے ہے۔ مسٹر اسمتھ اس کی جگہ بارٹن کو سپروائزر کی ملازمت دینا چاہتے ہیں۔

''نہیں، سپروائزر کے لیے سند یافتہ ڈاکٹر ہونے کی ضرورت نہیں۔''

بارٹن نے نمایاں طور پر سکون کا سانس لیا۔

''اگر آپ فزیشن ہیں تو پھر آخر......''

''میں فزیشن نہیں، سرجن تھا اور چھ ماہ قبل تک سرجن سیمسن کا نائب ہوا کرتا تھا پھر ایک حادثے کی وجہ سے میرا اعصابی نظام درہم برہم ہو گیا۔ سرجن سیمسن کو کسی دکان پر جوتے فروخت کر کے روزی کمانے کا خیال پسند نہیں تھا، اس لیے انہوں نے اسی اسپتال میں مجھے سپروائزر کی اسامی پر لگا دیا اور کوئی سوال؟''

''سوری ڈاکٹر! مجھے بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔''

بائیسویں منزل پر آکسیجن تھراپسٹ کا انتظام کیا وہاں سے پانچویں منزل پر آیا، جہاں ایک دولت مند مریض کا نفسیات کے وارڈ میں منتقل کرنا تھا۔ یہ کام بھی بخیر و خوبی انجام پا گیا۔ وہاں سے وہ بارٹن کو مردہ خانے میں لایا۔ اس طرح راؤنڈ لگاتے ہوئے رات کے گیارہ بج گئے۔ راہداری میں نصب لاؤڈ اسپیکرز پر ایک نرس بار بار اس کا نام دہرانے لگی۔

''ڈاکٹر فریڈ......ڈاکٹر فریڈ......آپ کے لیے ضروری فون ہے۔ ڈاکٹر فریڈ......''

فریڈ نے راہداری میں رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھایا اور آپریٹر کو کال ملانے کا حکم دیا۔ ٹیلی فون کا ذکر سنتے ہی وہ پریشان ہو گیا تھا۔ ضرور اس کی بیوی صوفیہ نے اسے فون کیا ہے، کوئی نیا طوفان اٹھنے والا ہے۔ جب دوسری طرف اسے سرجن سیمسن کی آواز سنائی دی

Waqar Azeem Pakistanipoint

تو اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ وہ سرجن سیمسن کا دل سے احترام کرتا تھا۔ پانچ سال قبل جب ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اس نے اس اسپتال میں قدم رکھا تھا، اس وقت سے آج تک سرجن سیمسن اس اسپتال کا سب سے بڑا ڈاکٹر تھا۔ اس نے سیمسن سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ وہ گونج دار آواز اسے غلطیوں پر ٹوک دیتی تھیں۔ اس کی رہنمائی کرتی تھی اور موقع پڑنے پر اسے مشورہ دیتی تھی۔ جلد ہی وہ سیمسن کا نائب بن گیا اور سرجن بھی اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ حادثے کی بعد جب اس پر انکشاف ہوا کہ وہ سرجری کا کوئی آلہ چند لمحوں کے لیے بھی ساکت نہیں پکڑ سکتا تھا تو اس کی دنیا پر مایوسیوں کی تاریکی چھا گئی۔ اس کے ہاتھ کپکپانے لگتے تھے۔ کانوں میں زخمی عورت کی چیخیں گونجنے لگتی تھیں اور آنکھوں کے سامنے الجھی ہوئی ٹوٹی پھوٹی شریانیں گھومنے لگی تھیں۔

''ابھی ابھی میں نے تمہاری بیوی سے بات کی ہے۔'' سرجن سیمسن دوسری طرف سے کہہ رہا تھا۔

''بڑی مشکل سے میں نے اسے یہ بات سمجھائی ہے کہ پارٹی میں اس کی شرکت انتہائی ضروری ہے، خواہ اسے تنہا ہی آنا پڑے۔ ویسے فریڈ! کیا تم اس خوب صورت لڑکی کو تاریک الوبنانے کی چکر میں ہو؟''

''بہت بہت شکریہ سرجن! مجھے خوشی ہے کہ آپ اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔''

''تمہیں صوفیہ کے ساتھ اپنے رویے پر نظر ثانی کرنا چاہیے فریڈ!'' سرجن سیمسن کی آواز سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ سرجن سیمسن کا رویہ اس کے ساتھ پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے پھوٹنے لگے۔ ''انسانی دل محض رگوں اور شریانوں کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ یہ ٹشو پیپر کی طرح بہت ہی نازک ہوتا ہے، اگر اس سے زیادہ کھیلا جائے تو ٹشو پیپر کی طرح آسانی کے پھٹ جاتا ہے۔''

''میں سمجھ گیا جناب!''

''تو اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لو کہ عورت کی محبت کا تمام تر انحصار صرف اس کے دل پر ہوتا ہے۔ بس مجھے یہی کہنا تھا فریڈ!'' دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

فریڈ چند لمحے خالی خالی نظروں سے ریسیور کو گھورتا رہا اور پھر بے جان ہاتھوں سے اسے کریڈل پر ڈال دیا۔ بارٹن کو بھی کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔

''گیارہ بج گئے ہیں ڈاکٹر فریڈ! کچھ کھانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''سوری، میں بھول گیا تھا۔'' فریڈ نے پیشانی کا پسینہ خشک کرتے ہوئے جواب دیا اور لفٹ کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ ''آؤ، میں تمہیں کیفے ٹیریا میں چھوڑ دوں۔ مجھے تو بارہ بجے نرسوں کے ساتھ نئے سال کا استقبال کرنا ہے۔''

بارٹن کو کیفے ٹیریا میں چھوڑ کر وہ بچوں کے وارڈ کی طرف چل دیا۔ چلو کچھ دیر کے لیے بارٹن سے جان چھوٹ گئی۔ وہ بری طرح اس کے سر پر سوار ہو گیا تھا۔ مس مارتھا بچوں کے وارڈ کی انچارج تھی۔ وہ درمیانی عمر کی بے حد شفیق اور مہربان عورت تھی۔ فریڈ کو یاد آیا کہ صوفیہ سے اس کی پہلی ملاقات بچوں کے وارڈ ہی میں ہوئی تھی، جہاں وہ نئی نئی نرس بن کر آئی تھی پھر وہ اپنی بیوی کے متعلق سوچنے لگا۔ بالآخر سرجن سیمسن اس کی بیوی کو پارٹی میں شریک ہونے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت وہ غالباً سرجن سیمسن کے مکان پر ہوگی اور ذہنی طور پر اس کوشش میں مصروف ہوگی کہ باتوں کے دوران کسی طرح اس کے ناکارہ شوہر کا ذکر نہ آنے پائے۔ صوفیہ نے بتایا تھا کہ پارٹی میں سرجن سیمسن، اس کی بیوی، بیٹی اور داماد کے علاوہ ڈاکٹر فریم اور اس کی منگیتر بھی مدعو تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ سرجن سیمسن نے چھ ماہ تک اس کی صحت یابی کا انتظار کرنے کے بعد اب ڈاکٹر فریم کو اپنا نائب بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

''ہیلو مس مارتھا!'' فریڈ نے مسکراتے ہوئے کہا اور بچوں کے وارڈ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جو اسٹاف کی کمی کا شکار تھا اور چیف سپروائزر نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ اس وارڈ پر خصوصی توجہ دے۔ ''سب ٹھیک ہے۔''

''ہاں آج تو سکون ہے ڈاکٹر فریڈ۔'' مس مارتھا نے جواب دیا۔ ''اس وقت میرے پاس صرف پانچ کیس ہیں۔''

وارڈ میں حسب معمول بہت ہلکی روشنی تھی۔ مس مارتھا نے ٹارچ روشن کی اور سوئے ہوئے بچوں کا معائنہ کرنے لگی۔ فریڈ اس کے ساتھ تھا۔ دو بچوں کا آپریشن ہوا تھا اور دونوں بچے تیزی سے صحت یاب ہو رہے تھے۔ ایک چینی بچی اپنی گڑیا کے ساتھ بڑے سکون سے سو رہی تھی، جس نوزائیدہ بچے کو نمونیا ہو گیا تھا' وہ آکسیجن ٹینٹ میں محو خواب تھا۔ آخری کیس ایک نو سالہ بچی تھی۔ ٹارچ کی روشنی پڑتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ بالوں کی طرح اس کی آنکھیں بھی کالی تھیں۔ وہ انہیں خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ مس مارتھا اس کی طرف بڑھی۔

''میرے پاس مت آنا۔ خبردار، میرے پاس مت آنا۔''

''گڑیا! تمہیں بخار ہے۔ ذرا دیکھیں تو ہماری بٹی کا بخار اب کیا ہے۔ منہ کھولو، شاباش۔ یہ تھرمامیٹر اپنی زبان کے نیچے دبالو۔''

بچی نے تھرمامیٹر منہ میں رکھ لیا۔

''اس بچی کا نام پاؤلا ہے۔ اسے نیند بہت مشکل سے آتی ہے۔ یہ دو بہنیں ہیں اور پاؤلا بڑی بہن ہے۔ گزشتہ ایک سال سے وہ بڑی بہن ہونے کے ساتھ ماں کے فرائض بھی انجام دیتی رہی ہے۔'' مس مارتھا نے تھرمامیٹر نکالتے ہوئے فریڈ کو پاؤلا کے متعلق کچھ معلومات فراہم کرتے ہوئے کہا اور غور سے تھرمامیٹر دیکھنے لگی۔ فریڈ نے جھک کر بچی کا معائنہ کیا جو سینے سے کولہوں تک بینڈیج میں جکڑی ہوئی تھی۔ مس مارتھا نے تشویش زدہ انداز میں سر ہلایا اور بچی کے سرہانے لٹکے ہوئے چارٹ پر ٹمپریچر نوٹ کیا پھر اس نے پاؤلا کا کمبل درست کیا اور جھک کر بچی کے رخسار کا بوسہ لیا۔

''اب اپنی آنکھیں بند کرلو گڑیا! اور ساری دعائیں پڑھ کر سو جاؤ، شاباش۔''

''نہیں، میں دعا نہیں مانگوں گی۔'' پاؤلا نے ضدی لہجے میں کہا۔ ''میں نے چار دن سے ایک بھی دعا نہیں پڑھی۔ جب تک میں گھر نہیں جاؤں گی، کوئی دعا نہیں پڑھوں گی۔''

مس مارتھا جھک کر پیار بھرے لہجے میں، چپکے چپکے پاؤلا کو کچھ سمجھاتی رہی۔ فریڈ وارڈ سے باہر نکل آیا اور راہداری میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد مس مارتھا بھی باہر نکل آئی۔

''مجھے اس بچی کی طرف سے تشویش ہے ڈاکٹر فریڈ! تین روز سے یہ ٹھیک ٹھاک تھی لیکن آج صبح سے اس کو بخار ہے۔ پہلے معمولی سی حرارت تھی لیکن درجہ حرارت بتدریج بڑھتا جا رہا ہے۔ اس وقت ایک سو ایک ڈگری سے کچھ اوپر ہے۔''

''ناک، کان، چیک کیے تھے؟''

''سب ٹھیک ہے۔ سینہ بھی صاف ہے۔ پیٹ میں بھی درد نہیں۔ بخار کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''خون ٹیسٹ کیا گیا ہے؟''

''ابھی رپورٹ نہیں آئی۔''

''ڈاکٹر کون ہے؟''

''سرجن یمسن۔'' مس مارتھا نے جواب دیا۔

''اوہ، تب فکر کی بات نہیں۔ بہت جلد وہ بخار کی وجہ دریافت کرلیں گے۔''

''میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ نفسیاتی ہے۔''

''تمہیں کیا ہو گیا ہے مارتھا! نو سال کی بچی کو نفسیاتی مریضہ بنا دیا۔''

''آپ کو اس کے پس منظر کا علم نہیں ہے ڈاکٹر! ایک سال پہلے اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ دونوں بہنوں میں یہ بڑی ہے۔ سال بھر تک یہ بڑی بہن کے ساتھ ساتھ ماں کے فرائض انجام دیتی رہی۔ ابھی کوئی مہینہ بھر پہلے ان کے باپ نے دوسری شادی کی ہے۔ سوتیلی ماں دونوں لڑکیوں سے بہت محبت کرتی ہے۔ اس نے ہی پاؤلا کی کمر میں موجود زخم کو محسوس کر کے اسے ڈاکٹروں کو دکھایا اور پھر اس بات پر اصرار کیا کہ اس کا علاج کرے لیکن پاؤلا کا ردعمل یہ ہے کہ سوتیلی ماں نے اسے گھر سے نکال دیا ہے اور وہ بھی نئے سال کے موقع

پ۔ وہ گھر واپس جانے کے لیے بہت بے تاب ہے۔''

''سوتیلی ماں سے حسد۔'' فریڈ نے کہا۔ ''نو سالہ بچی کے لیے یہ بڑی تشویش ناک پرابلم ثابت ہوسکتی ہے۔ خیر وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ کیسا ہی زخم ہو، مندمل ہو جاتا ہے۔''

''ہاں وقت اور محبت۔'' مس مارتھانی بڑی نرمی سے کہا۔ ''صوفیہ کیسی ہے ڈاکٹر؟''

''اسے کیسا ہونا چاہیے؟ بے حد خوش اور مطمئن۔'' پھر اس نے نظریں جھکالیں۔ ''اچھا مس! میں چلتا ہوں، میرے ساتھ ایک دم لگادی گئی ہے جو میری ملازمت کے درپے ہے۔''

''اسے کچھ دیر کے لیے مردہ خانے میں چھوڑ دو، آئندہ کبھی یہاں کا رخ نہیں کرے گا۔''

''میں نے کوشش کی تھی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ خدا حافظ، شب بخیر۔''

مس مارتھا بہت دور تک اسے بوجھل قدموں سے جاتے دیکھتی رہی پھر اس نے رومال سے آنکھوں کے کونے صاف کیے اور واپس بچوں کے وارڈ میں چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ ٹیلی فون پر سرجن سیمسن کو پاؤلا کا درجہ حرارت اور ذہنی کیفیت کی اطلاع دے رہی تھی۔

فریڈ کینے ٹیریا پہنچا تو بارٹن بڑے اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ فوراً کھڑا ہوگیا۔

''ایمرجنسی میں بڑی گڑبڑ نظر آتی ہے۔ بہت سے ڈاکٹر اور نرسیں دوڑتے ہوئے ایمرجنسی میں گئے ہیں۔''

''چلو، دیکھتے ہیں کیا ہوا۔'' اس نے تھکے تھکے سے انداز میں کہا۔

لفٹ کا دروازہ کھلا اور اسپتال کا ایک ملازم ٹرالی دھکیلتا ہوا باہر نکلا۔ فریڈ کے استفسار پر اس نے بتایا کہ مسافروں سے بھری ہوئی دو کاریں آپس میں ٹکرا گئیں اور ایک تیز رفتاری سے موڑ کاٹتے ہوئے الٹ گئی۔ ایک ساتھ تین گاڑیوں کے زخمی آجانے پر اسپتال کی ایمرجنسی وارڈ میں کھلبلی مچ گئی۔ نئے سال کے تہوار پر ویسے بھی اسپتال میں ڈاکٹروں اور نرسوں کا عملہ بہت کم ہوتا ہے۔

''ہر سال کرسمس اور نئے سال کے تہوار پر ایسے ہی حادثات ہوتے ہیں۔'' فریڈ نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا اور لفٹ میں داخل ہوگیا۔ ایمرجنسی وارڈ گراؤنڈ فلور پر تھا اور چیف سپروائزر کا کمرہ بھی وہیں تھا۔ اس نے بارٹن کو سرجیکل گاؤن، ٹوپی اور ماسک پہننے کی ہدایت کی اور خود بھی اپنے لباس پر گاؤن پہننے لگا۔ اتنی دیر میں ایکسرے ٹیکنیشن بھیگی ہوئی بہت سی ایکسرے فلمیں لے آیا۔ ڈاکٹر جونس تیز روشنی میں ایک ایک فلم کا معائنہ کرنے لگا۔

ڈاکٹر جونس اسپتال کا چیف آرتھوپیڈک تھا۔ دو گٹھے ہوئے بدن اور نیلی آنکھوں والا نوجوان تھا۔ ایکسرے فلموں کے معائنے سے فارغ ہوکر فریڈ کی طرف پلٹا۔

''اس وقت ہمارے پاس پانچ سیریس کیس ہیں ڈاکٹر! جن میں سے تین کا فوری آپریشن ہونا ضروری ہے۔ ایک لڑکے کا جبڑا ٹوٹ گیا ہے، دوسرے کی گردن کی ہڈی کھسک گئی ہے۔ تیسرے کے کولہے کی ہڈی ٹوٹی ہے۔ آج رات اسٹاف بہت کم ہے۔ آپ ہماری مدد کریں ڈاکٹر فریڈ!''

چند لمحے تکلیف دہ سکوت طاری رہا۔

''سوری ڈاکٹر! مجھے اپنا کام دیکھنا ہے۔''

ڈاکٹر جونس کچھ دیر اسے حقارت بھری نظروں سے گھورتا رہا پھر پلٹ کر اس نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا۔

''فوری طور پر ایمرجنسی وارڈ میں تین بے ہوش کرنے والے ماہرین بھیجو.....'' فون بند کرکے اس نے فریڈ کے سرجیکل گاؤن اور چہرے کے ماسک کی طرف دیکھا۔ ''اگر تم فینچی بھی نہیں پکڑ سکتے تو یہ لباس پہننے کا ڈراما کیوں کررہے ہو؟''

فریڈ نے بپھرتے ہوئے غصے کو سینے کی گہرائیوں میں دفن کردیا۔

''مسٹر بارٹن!'' اس نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جلد ہی اسپتال کی انتظامیہ

میں شامل ہونے والے ہیں۔ مسٹر تھامس نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں انہیں آج رات اسپتال کی کارکردگی کا معائنہ کرادوں۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو یہ ایمرجنسی وارڈ کی کارکردگی دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''اگر مسٹر تھامس کی خواہش ہے تو کوئی ہرج نہیں۔'' ڈاکٹر جونس نے جواب دیا اور بیسن پر صابن سے ہاتھ صاف کرنے لگا۔ وہ آپریشن کی تیاری کررہا تھا۔

ایک لڑکے کو پہیے دار کرسی پر بٹھا کر ایمرجنسی وارڈ میں لایا گیا۔ نرس اور ڈاکٹر بڑی خاموشی کے ساتھ ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ ہنگامی صورت حال میں اس طرح اطمینان سے کھڑے رہنا ڈاکٹر فریڈ کی فطرت کے خلاف تھا۔

''کیا میں بلڈ بینک کو تیار رہنے کی اطلاع کردوں؟'' اس نے ڈاکٹر جونس سے سوال کیا۔

''ایک نرس پہلے ہی ان کے خون کے نمونے لے جاچکی ہے۔'' ڈاکٹر جونس نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ''سنو فریڈ! میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔ اگر تم کوئی مدد نہیں کرسکتے تو.....'' وہ فقرہ نامکمل چھوڑ کر خاموش ہوگیا۔

''اگر تم کوئی مدد نہیں کرسکتے تو مہربانی کرکے یہاں سے دفع ہوجاؤ۔'' فریڈ نے دل ہی دل میں ڈاکٹر جونس کا فقرہ مکمل کردیا۔ پانچ سال پہلے جب وہ خود نیا نیا یہاں ملازم ہوا تھا تو اس وقت ڈاکٹر جونس اس کا ماتحت تھا اور اس کی حیثیت ایک کلرک جیسی تھی اور آج وہی ڈاکٹر جونس اسے آپریشن تھیٹر سے باہر نکل جانے کا حکم دے رہا تھا۔ اس نے لاکر کھولا اور سرجیکل گاؤن اتار کر اندر پھینک دیا اور پھر ٹوپی اور ماسک اوپر ڈال کر لاکر بند کرکے وہ ایمرجنسی وارڈ سے باہر نکل گیا۔

وہ صدموں کی رات تھی۔ پرانے سال نے جاتے جاتے بھی کئی پہاڑ اس پر توڑ دیے تھے۔ اسے بار بار روندا، کچلا گیا، پامال کیا گیا۔ وہ اپنی مسخ شدہ انا کی لاش کاندھوں پر ڈالے کسی بادل کے ٹکڑے کی طرح پورے اسپتال میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ شعور کو اس نے بے لگام چھوڑ دیا۔ سوچنے سمجھنے کی ضرورت زندہ انسان محسوس کرتے ہیں۔ عقل کا پاسبان بے مہار ہوا تو مختلف النوع قسم کے خیالات بگولوں کی طرح دندنانے لگے۔ گزرا ہوا روپہلی، چمک دار دھوپ کی طرح تابناک ماضی طلائی خنجر کی طرح مندمل زخموں کو ہرا کرنے لگا۔ جب وہ ایک کامیاب سرجن تھا، اس کے ہاتھوں میں مسیحائی تھی۔ سب ہی اس کی عزت کرتے تھے اور مریض اسے عقیدت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ جب وہ تھکا ہارا گھر جاتا تو صوفیہ کھل اٹھتی تھی اور اپنی ساری خوشبو اس پر نچھاور کردیتی تھی۔ جب موسم بدلا اور خزاں کا سورج ساری شادابی بھسم کرتا ہوا سر پر آیا تو اپنی ذات کا سایہ بھی گھٹنے لگا۔ اب تو یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دے گا۔ جس کا سایہ نہ ہو اسے کوئی انسان بھی تسلیم نہیں کرتا۔ خیالوں کے بگولے اپنے ساتھ اسے بھی اڑائے اڑائے پھر رہے تھے۔ کوئی اسے دور سے پکار رہا تھا، اسے بار بار آواز دے رہا تھا۔ اس کے قدم خود بخود بلا ارادہ ٹھہر گئے۔ اس نے سر جھٹک کر ذہن پر چھائی ہوئی دھند صاف کرنے کی کوشش کی۔ تب اسے مس مارتھا کا ہیولا نظر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں فون کا ریسیور تھا اور وہ اسے پکار رہی تھی۔

''ڈاکٹر فریڈ..... ڈاکٹر فریڈ.....''

''کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟'' اس نے بے جان سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بہت اچھا ہوا، آپ واپس آگئے۔ تمام ڈاکٹر ایمرجنسی میں مصروف ہیں۔ سرجن سیمسن کے گھر سے کوئی جواب نہیں مل رہا ہے۔ پاؤلا کی حالت بہت خراب ہوگئی ہے ڈاکٹر فریڈ۔''

''تو میں کیا کروں، کسی ڈاکٹر کو تلاش کرو۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھائے۔

مس مارتھا تیزی سے آگے بڑھی اور مضبوطی سے اس کا بازو تھام لیا۔

''مجھے ایک ڈاکٹر مل گیا ہے۔'' اس نے سخت لہجے

میں کہا۔ ''اندر چل کر پاؤلا کو دیکھو، اسے کیا ہو رہا ہے۔''

مس مارتھا اسے تقریباً گھسیٹتی ہوئی بچوں کے وارڈ میں لائی۔ وہ بے جان سا پاؤلا کے بستر کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مس مارتھا نے وارڈ کی تیز روشنیاں جلادیں۔ پاؤلا نے جلدی سے چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپالیا۔ کچھ دیر وہ اس بچی کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا پھر برسہا برس کی ذہنی تربیت بیدار ہوگئی اور اس کا ذہن ایک ڈاکٹر کے انداز میں سوچنے لگا۔ بچوں میں غم کی شدت اتنی طاقت ور نہیں ہوتی کہ وہ بخار کی کیفیت پیدا کردے۔ وہ پاؤلا کے متعلق سوچنے لگا۔ ہاں غم کی شدت انہیں کمزور ضرور کردیتی ہے جس کی وجہ سے درجہ حرارت معمول سے بھی کم ہوجاتا ہے۔ پاؤلا کا درجہ حرارت صبح سے بتدریج بڑھ رہا تھا اور اس وقت بہت تیز بخار تھا۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کے دو بج گئے تھے۔ تقریباً گیارہ بجے مس مارتھا نے اس کے سامنے پاؤلا کا درجہ حرارت دیکھا تھا جو ایک سو ایک ڈگری سے کچھ زیادہ تھا۔

''اس وقت کیا ٹمپریچر ہے مس مارتھا؟''

''ایک سو چار اعشاریہ تین۔ اگر درجہ حرارت بڑھنے کی یہی رفتار رہی تو ایک گھنٹے کے اندر اندر ٹمپریچر ایک سو چھ تک پہنچ جائے گا۔''

''انفیکشن۔'' ڈاکٹر فریڈ کے ذہن میں یہ لفظ بار بار گونجنے لگا۔ بخار توڑنے کی دوائیں اور انجکشن اپنا اثر کھو بیٹھیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ مریض کسی زبردست انفیکشن کا شکار ہے اور بچوں میں انفیکشن بڑی سرعت کے ساتھ پھیلتا ہے۔

''پاؤلا۔'' ڈاکٹر فریڈ نے بڑی محبت سے بچی کو پکارا۔ ''میری طرف دیکھو پاؤلا! تمہیں کہیں چوٹ لگی ہے؟ کہاں چوٹ لگی ہے؟ زخم کس جگہ ہے پاؤلا؟''

''نہیں..... نہیں۔ مجھے کہیں چوٹ نہیں لگی۔''

ڈاکٹر فریڈ نے زبردستی پاؤلا کے چہرے پر سے ہاتھ ہٹادیے۔ بچی کے ہونٹ خشک تھے، اس نے آنکھیں مضبوطی سے بند کی ہوئی تھیں لیکن ان کی گرد سیاہ حلقے صاف نظر آرہے تھے۔ فریڈ نے پاؤلا کے بدن پر پڑا ہوا کمبل اتار دیا اور غور سے بینڈ یج کا معائنہ کرنے لگا۔ سرجن سیمسن نے دائیں کولہے پر پلاستر چڑھایا تھا جو اتنا سخت تھا کہ کولہے کو ایک خاص زاویے پر رو کے رکھے اور اس میں اتنی گنجائش بھی تھی کہ خون کا دوران رکنے نہ پائے۔ کولہوں سے سینے تک کا حصہ بہت مضبوطی کے ساتھ بینڈ یج میں جکڑا ہوا تھا۔ پیروں میں نبض کی رفتار صحیح تھی اور بلڈ پریشر بھی معمول کے مطابق تھا۔ پیروں کے ناخن گلابی تھے۔ فریڈ نے ایک بار پھر غور سے پلاستر والے حصے کا معائنہ کیا۔ نجانے کیوں اسے شک ہو رہا تھا کہ پلاستر کے نیچے ران کے حصے پر ورم آیا ہوا ہے۔ پلاستر کے اوپر بندھی ہوئی بینڈ یج بھی بے ترتیب تھی۔ پٹیاں اس طرح اوپر کھسکی ہوئی تھیں کہ اندر سے پلاستر کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا پھر اچانک اس کی نظریں ایک نقطے پر مرکوز ہوگئیں۔ اس جگہ پلاستر کا کنارا اکھڑا ہوا تھا۔

''پاؤلا۔'' اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''پلاستر کا کنارا اکھڑا ہوا ہے، تم نے اسے کس طرح اکھاڑا پاؤلا۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا، میں نے کچھ نہیں کیا۔'' بچی نے چیخ کر کہا اور دوبارہ اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپالیا۔

مس مارتھا جھک کر غور سے پلاستر کے اس حصے کا جائزہ لے رہی تھی۔

''سنو پاؤلا۔'' فریڈ نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارا دوست ہوں، مجھے معلوم ہے تم نے پلاستر اکھاڑنے کی کوشش کی تھی۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا، ذرا بھی نہیں ڈانٹوں گا۔ بس یہ بتادو کہ تم نے کس طرح پلاستر اکھاڑا تھا۔''

''میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے، بتیاں بجھادو۔ تم لوگ باہر چلے جاؤ، میں سونا چاہتی ہوں۔''

''ابھی نہیں، ہم یہ پلاستر کاٹیں گے پاؤلا! تمہیں اس کے کٹنے سے خوشی ہوگی نا؟''

''نہیں، نہیں۔''

ڈاکٹر فریڈ نے آہستہ سے کمبل واپس پاؤلا پر

ڈال دیا اور اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔

''جب تک یہ پلاسٹر نہیں کٹے گا، اس وقت تک یہ پتا نہیں چلے گا کہ پاؤلا کا بخار کیوں نہیں اتر رہا ہے۔''

''اسے خواب آور دوا کھلا دی جائے؟'' مس مارتھا نے سوال کیا۔

''ہاں، بہت ہلکا ڈوز۔''

''تمام ڈاکٹر ایمرجنسی میں مصروف ہیں ڈاکٹر فریڈ! آپ ہی شیٹ پر دستخط کر دیں۔'' مس مارتھا نے بڑے سرسری انداز میں کہا تھا لیکن وہ اسے دھوکا دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ مس مارتھا کا خیال تھا کہ اس کی یہ حالت خود اعتمادی کے فقدان کی باعث بنی ہے اور اگر کسی طرح اس کی خود اعتمادی بحال ہو جائے تو وہ ایک بار پھر سپر وائزر سے سرجن فریڈ بن جائے گا۔ شاید مس مارتھا نے اس کے مرض کی صحیح تشخیص کی تھی۔ شاید وہ اعصابی نظام درہم برہم ہونے کی وجہ سے خود اعتمادی کے بحران کا شکار ہو گیا تھا لیکن کسی بچی کے لیے خواب آور دوا لکھ دینے سے کہیں خود اعتمادی بحال ہوتی ہے۔ مس مارتھا کے بھولپن پر وہ بے اختیار مسکرانے لگا۔ اس نے مارتھا کے بڑھے ہوئے ہاتھوں سے پاؤلا کی ہسٹری شیٹ لی اور ایک ہلکی سی خواب آور دوا کا نام لکھ کر نیچے دستخط کر دیے۔ مارتھا فون اٹھا کر کسی سے گفتگو کرنے لگی۔ چند لمحوں بعد زیر تربیت ایک لیڈی ڈاکٹر بچوں کے وارڈ میں داخل ہوئی۔

''ڈاکٹر فریڈ کے مطابق پلاسٹر کے نیچے انفیکشن ہو گیا ہے۔'' مس مارتھا نے پاؤلا کی ہسٹری شیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مریض کو پہلے خواب آور دوا کھلانا ہے اور پھر پلاسٹر کاٹنا پڑے گا۔''

''بچی کس ڈاکٹر کے زیر علاج ہے؟''

''سرجن سیمسن۔'' مس مارتھا نے جواب دیا۔

''اوہ۔'' زیر تربیت لیڈی ڈاکٹر چند لمحے کچھ سوچتی رہی۔ ''میں اگر ڈاکٹر فریڈ کی جگہ ہوتی تو خواب آور دوا لکھنے میں تو نہیں جھجکتی لیکن میں اس پلاسٹر کو کاٹنے سے پہلے کئی مرتبہ اپنے اقدام پر غور کرتی، جسے چیف سرجن سیمسن نے خود مریضہ پر چڑھایا ہے۔'' وہ آگے بڑھ کر کچھ دیر پاؤلا کا بغور جائزہ لیتی رہی۔ ''بچی کی حالت بہت خراب ہے۔'' اس نے واپس آ کر کہا۔

''مس مارتھا! آپ کسی آر ایم او کو کیوں طلب نہیں کرتیں؟''

''سب کے سب ایمرجنسی میں مصروف ہیں۔''

''تو آپ سرجن سیمسن کو اطلاع کریں۔''

''میں وقفے وقفے سے انہیں برابر فون کر رہی ہوں لیکن گھر پر کوئی فون نہیں اٹھاتا۔''

''اوہ۔'' زیر تربیت لیڈی ڈاکٹر پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ ''کم از کم میں تو چیف سرجن سیمسن کا چڑھایا ہوا پلاسٹر کاٹنے کا حوصلہ نہیں کر سکتی۔ بچی کی حالت بہت خراب ہے لیکن..... سمجھ میں نہیں آتا..... خیر.....'' وہ بڑبڑاتی ہوئی وارڈ سے باہر نکل گئی۔

ڈاکٹر فریڈ کے ذہن میں زیر تربیت لیڈی ڈاکٹر کے الفاظ گونجنے لگے۔

زیر تربیت لیڈی ڈاکٹر چند منٹ بعد واپس آئی' اس نے پاؤلا کو خواب اور انجکشن لگایا۔

''اسٹریچر گاڑی طلب کرو، ڈاکٹر فین کو تلاش کرو۔ ممکن ہے پاؤلا کو بے ہوش کرنا پڑے۔ میں مریضہ کو سرجری میں لے جا رہا ہوں۔'' ڈاکٹر فریڈ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ وہ حتمی فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔ تھوڑی دیر کی تاخیر بچی کے لیے زندگی اور موت کا سوال بن سکتی تھی۔ ہر گزرتا ہوا لمحہ قیمتی تھا۔

مس مارتھا فون پر مصروف ہو گئی۔

جب وہ آپریشن تھیٹر میں پہنچے تو سرجری کا سارا سامان تیار تھا۔ ڈاکٹر فین بھی لاؤنج میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ ڈاکٹر فریڈ نے خوب رگڑ کر اپنے ہاتھ صاف کیے۔ گزشتہ چھ ماہ کے دوران اس طرح ہاتھ صاف کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی' اس لیے ہتھیلیوں کی کھال سرخ ہو گئی۔ وہ چند لمحے دلچسپی سے اپنے ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ سرجری کا خصوصی لباس پہن کر اس نے برقی قینچی اٹھائی اور روشنیوں کے زاویے درست کیے۔

''گھبرانا مت پاؤلا۔'' اس نے جھک کر دھیمے

لہجے میں کہا۔ ''اس مشین سے آواز تو بہت پیدا ہوتی ہے لیکن تکلیف بالکل نہیں ہوتی۔ ممکن ہے مجھے سارا پلاستر نہ کاٹنا پڑے۔''

''نہیں۔'' پاؤلا نے کمزور لہجے میں کہا۔ خواب آور انجکشن اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ پاؤلا کی قوت مدافعت جواب دے گئی تھی۔ فریڈ نے دائیں کولہے پر چڑھے ہوئے پلاستر کو کاٹنا شروع کیا۔ سب ٹھیک ہے، میرے ہاتھ ذرا بھی نہیں کانپ رہے۔ میرے اعصاب پرسکون ہیں۔ ڈاکٹر فریڈ کے ذہن میں یہ خیالات گونج رہے تھے۔ وہ پوری توجہ سے برقی قینچی استعمال کر رہا تھا۔

اچانک برقی قینچی ترچھی ہو کر دوسرا حصہ کاٹنے لگی۔ ڈاکٹر نے فوراً اسے بند کر دیا۔ یہ کیا ہوا؟ اس کے ذہن میں خوف کی ایک لہر پیدا ہوئی اور پورے بدن میں پھیل گئی۔ کیا اس کے اعصاب پھر جواب دے گئے؟ کیا اسے خود اپنی ذات پر کوئی اختیار نہیں رہا؟ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور قوت ارادہ مجتمع کر کے دوبارہ برقی قینچی سنبھالی۔ اس مرتبہ اس نے پلاستر کاٹنے کی رفتار دانستہ بہت کم رکھی لیکن قینچی دوبارہ اچھلی اور مدہوش شرابی کی طرح لڑکھڑاتی ہوئی دوسری سمت بڑھنے لگی۔ فریڈ نے فوراً رو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ آہستہ آہستہ اس کی پیشانی پر پسینہ پھوٹنے لگا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ڈاکٹر فین اور نرس دونوں ہی اسے تعجب بھی نظروں سے گھور رہے تھے۔ وہ کس طرح اس موقع پر کام کو ادھورا چھوڑ سکتا تھا؟ ایک بار پھر اس نے برقی قینچی سنبھالی اور پلاستر میں جو گول دائرہ اسے کاٹنا تھا اس مرتبہ اس نے دائرے کے دوسرے سرے پر قینچی آزمانے کا فیصلہ کیا۔ برقی قینچی آہستہ پہلے والے سر کے قریب پہنچی تو قینچی ایک بار پھر اچھلی اور بے قابو ہونے لگی۔

فریڈ نے شکست خوردہ انداز میں قینچی رکھ دی۔ فضول ہے۔ یہ معمول سا کام بھی نہیں کر سکتا۔ اس نے سوچا۔ فوراً ہی اس کے ذہن میں دوسرا خیال پیدا ہوا۔ کیا ایک معصوم بچی کو اس طرح مرتے ہوئے دیکھ سکے گا؟ پاؤلا کو مدد کی سخت ضرورت ہے۔ ہر گزرتا ہوا لمحہ اسے موت کے قریب کھینچ رہا ہے۔ اس نے جو کام شروع کیا ہے، اسے کسی نہ کسی طرح مکمل کرنا ہی پڑے گا۔ وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا، وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔

اس نے تھکے تھکے سے انداز میں قینچی اٹھائی اور بڑی احتیاط سے اس کا ایک پھل کٹے ہوئے پلاستر کے نیچے گھسانے لگا۔ پاؤلا کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور پھر وہ چیخ اس عورت کی چیخوں کے ساتھ مدغم ہو گئی جو حادثے والی رات اس نے سنی تھی اور گزشتہ چھ ماہ کے دوران وہ چیخیں اس کے کانوں میں گونجتی رہی تھیں۔ وہ چیخیں ایک بار پھر اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں اور وہ ان کے بھنور میں دھنسنے لگا۔ اس کا پورا..... وجود آہستہ آہستہ ان چیخوں میں ڈوب رہا تھا جن میں اب پاؤلا کی چیخیں بھی شامل تھیں لیکن اس کا ذہن اس قابل نہ رہا تھا کہ وہ انہیں الگ الگ شناخت کر سکے۔ تب اسے اپنی آواز سنائی دی، وہ کسی گہرے کنویں سے بول رہا تھا، جیسے ڈوبتا ہوا آدمی آخری بار مدد کے لیے پکار رہا ہوں۔

''ایتھر..... ایتھر..... پلیز.....'' وہ ڈاکٹر فین سے کہہ رہا تھا کہ پاؤلا کو بے ہوش کر دے۔ اس کی آواز بہت کمزور تھی۔ ان چیخوں کے درمیان خود اسے بھی اپنی آواز بمشکل سنائی دے رہی تھی۔ تب اس نے بے اختیار میز کا کنارا پکڑ لیا۔ اس کا سر اور کاندھے جھک گئے۔

''کیا کہا آپ نے؟ ڈاکٹر فریڈ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ یہ آپ کو کیا ہوا؟'' ڈاکٹر فین بہت دور سے اسے آوازیں دے رہا تھا۔

وہ کیا کہہ رہا تھا؟ فریڈ نے ذہن پر زور ڈالا۔ چیخوں کے اس طوفان میں وہ الفاظ کہیں گم ہو گئے تھے۔ اس کی نظروں کے سامنے ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا؟ اس نے آنکھیں پھاڑ کر تاریکی کے اس ریگ زار میں لفظوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی، جہاں ایک مرتی ہوئی عورت چیخ رہی تھی۔

نہیں نہیں، وہ چیخیں، پاؤلا کی تھیں جسے مدد کی اشد ضرورت تھی۔ وہ اس معصوم بچی کی مدد کرسکتا تھا، اسے ہر قیمت پر پاؤلا کی مدد کرنا تھی۔

وہ سر جھٹک کر نظروں کے سامنے چھائی ہوئی تاریکی دور کرنے لگا۔ اسے ہر قیمت پر پاؤلا کی مدد کرنا چاہیے۔ یہ فقرہ اس کے ذہن میں بار بار گونج رہا تھا اور اس کی گونج تیزی سے چیخوں کے طوفان پر غالب آرہی تھی۔ اس طرح کئی صدیاں گزر گئیں اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے چھایا ہوا اندھیرا چھٹنے لگا۔ مرتی ہوئی عورت کی چیخیں مغلوب ہوکر کمزور پڑتی جارہی تھیں اور پھر اچانک ہر طرف سکوت طاری ہوگیا اور تاریکی چھٹ گئی۔ اس نے سر اٹھا کر پاؤلا کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں کٹے ہوئی پلاستر پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک چھوٹی سی آواز ذہن کے کسی گوشے میں ابھی۔ پلاستر کے نیچے کوئی ٹھوس چیز وجود ہے، دھات کی بنی ہوئی کوئی ٹھوس چیز جس سے ٹکرا کر برقی قینچی اچھل جاتی ہے اور اپنا راستہ تبدیل کردیتی ہے۔ یقیناً یہی بات ہے۔ اس نے آسودگی سے سوچا اور پھر سارا معاملہ صاف ہوگیا۔ اگر قینچی کے راستے میں یہ رکاوٹ نہ آئے تو وہ آسانی کے ساتھ پلاستر کاٹ لے گا۔

''ایتھر پلیز۔'' فریڈ نے ڈاکٹر فین کو مضبوط لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بچی کا بے ہوش کیا جانا ضروری ہے۔''

''پلاستر کاٹنے کے لیے ایتھر؟'' نوجوان ڈاکٹر نے تحیر زدہ لہجے میں دریافت کیا۔

''خاموشی کے ساتھ اسے ایتھر سنگھاؤ، بچی کو ڈرانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ڈاکٹر فریڈ کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ نوجوان ڈاکٹر چند لمحے فریڈ کی نظروں سے نظریں ملائے رہا اور جب اسے یقین ہوگیا کہ اس کے مقابل کھڑے ہوئے سرجن کا ذہنی توازن درست ہے تو وہ ایک گہرا سانس لے کر اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایتھر کے چند قطرے ماسک پر ٹپکائے۔

''زور سے سانس لا پاؤلا! اس کی خوشبو اچھی نہیں ہے لیکن بعد میں بڑا آرام ملتا ہے۔''

''نہیں نہیں..... تم مجھے مارنا چاہتے ہو۔'' پاؤلا نے کمزور سے لہجے میں احتجاج کیا۔

''شش..... ایسی بات نہیں کرتے پاؤلا! چلو شاباش، دو سے تین گہرے گہرے سانس لو۔''

فریڈ ہٹ کر ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ جب تک پاؤلا بے ہوش نہیں ہوتی، وہ سرجری کا عمل شروع نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا ذہن مکمل یکسوئی کے ساتھ پاؤلا کے کیس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ ایک تربیت یافتہ سرجن کا ذہن تھا اور ڈاکٹر فریڈ کو یہ محسوس کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ اس کا ذہن بالکل اسی انداز سے اس کیس پر غور کررہا تھا جس طرح چھ ماہ قبل آپریشن سے پہلے وہ ہر پہلو سے فنی زاویوں پر غور کرتا تھا۔

ڈاکٹر اٹھ کر اس کے قریب آیا۔ ''اب آپ اپنا کام شروع کرسکتے ہیں ڈاکٹر فریڈ۔''

اس مرتبہ ڈاکٹر فریڈ نے سابقہ دائرے کے گرد ایک بڑا دائرہ بنایا اور برقی قینچی سنبھال لی۔ پلاستر بڑی صفائی سے کٹ رہا تھا۔ چند منٹ بعد پلاستر کا ایک گول دائرہ کٹ کر الگ ہوا تو پاؤلا کا داہنا کولہا نظر آنے لگا۔ کولہے کے گوشت میں ناخن گھسنے والی ایک ریتی پھنسی ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہاں گہرا زخم پیدا ہوگیا تھا۔ اسی زخم کی وجہ سے پاؤلا کو انفیکشن ہوا تھا اور اس انفیکشن کی وجہ سے درجہ حرارت متواتر بڑھتا جارہا تھا چونکہ زخم پلاستر کے اندر چھپا ہوا تھا اور اس کا علاج ممکن نہیں ہوا تھا، اس لیے وہ خطرناک حد تک خراب ہوگیا تھا۔ پاؤلا اسپتال سے فرار ہوکر گھر جانا چاہتی تھی لیکن پلاستر کی وجہ سے وہ بے بس تھی۔ نجانے کہاں سے اسے ناخن گھسنے والی ریتی مل گئی۔ اس کے چھوٹے سے ذہن نے اسے ریتی سے پلاستر کاٹنے کا فیصلہ کیا اور اس کوشش میں ریتی کولہے کے گوشت میں گھس گئی۔ پاؤلا کو احساس بھی نہیں ہوا کہ ایک چھوٹی سی غلطی اسے موت سے ہم کنار کرسکتی ہے۔

''میرا خیال ہے کہ ہڈی ابھی محفوظ ہے۔'' فریڈ نے ڈاکٹر فین سے کہا جو آنکھیں پھاڑے اس زخم کو دیکھ رہا تھا۔ ''اگر کچھ دیر ہو جاتی تو انفیکشن خون میں شامل ہو جاتا۔''

ڈاکٹر فین نے اثبات میں سر ہلایا اور فریڈ سرجیکل چمٹی سے ناخن گھنے کی ریتی زخم سے باہر نکالنے لگا۔ بے ہوش پاؤلا ایک بار ہلکے سے کراہی اور پھر خاموش ہوگئی۔ ڈاکٹر فریڈ ماہر سرجن کی طرح زخم کے گرد کا گلا سڑا گوشت نکالنے میں مصروف ہوگیا۔

''دو بج کر دس منٹ۔'' ڈاکٹر فین نے آپریشن شیٹ پر وقت لکھا اور سرجری کی تفصیلات نوٹ کرنے لگا۔ اس نے پاؤلا کا درجہ حرارت ناپا اور بلڈ پریشر چیک کیا۔ انہیں بھی شیٹ پر نوٹ کیا، تب اچانک آپریشن روم کا دروازہ کھلا۔

''بہت اچھے فریڈ!'' چیف سرجن سیمسن کی بھاری دار آواز کمرے میں گونجی۔ ''ڈریسنگ بعد میں کرنا، پہلے مجھے اپنے کارنامے کا معائنہ کرنے دو۔''

سرجن سیمسن کی آواز سن کر فریڈ رک گیا اور احتراماً جھکتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی ناخن گھنے کی ریتی اٹھا کر سرجن سیمسن کو دکھائی۔

''یہ دیکھیے، پلاستر کے نیچے سے یہ ریتی نکلی ہے، کولہے کے گوشت میں گھسی ہوئی تھی۔ چند گھنٹے مزید تاخیر ہو جاتی تو بلڈ انفیکشن کا زبردست خطرہ تھا۔''

چیف سرجن نے ریتی کا معائنہ کیا اور پھر جھک کر زخم کی حالت دیکھنے لگا۔

''تم نے ٹھیک کیا فریڈ! ڈریسنگ مکمل کر کے لڑکی کو وارڈ میں بھیج دو۔ اس کے والدین آئے ہوئے ہیں اور اپنی بچی کی طرف سے بے حد تشویش میں مبتلا ہیں۔''

ڈاکٹر فریڈ جلدی جلدی ڈریسنگ کرنے لگا۔ اس دوران سرجن خاموشی سے اس کے کام کا جائزہ لیتا رہا۔ جب اسپتال میں نرسیں پاؤلا کو آپریشن روم لے گئیں تو ڈاکٹر فریڈ نے معذرتی لہجے میں سرجن سیمسن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے آپ کی آمد کا علم نہیں تھا چیف! ورنہ میں انتظار کر لیتا۔''

چیف سرجن زور سے ہنسا۔ ''تمہارا کیا خیال تھا فریڈ؟ یہاں میرے لڑکے ایمرجنسی میں مشغول تھے اور میں اپنے گھر بیٹھا تمہاری بیوی سے عشق لڑاتا رہتا؟ میں کئی گھنٹے سے ایمرجنسی میں موجود ہوں۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے اپنی اور تمہاری بیوی کو ایک اور پارٹی میں بھیج دیا تھا تاکہ وہ نئے سال کی آمد پر تنہائی کا شکار نہ ہو جائیں۔''

''تمام آپریشن کامیاب رہے جناب؟''

''ناکامی کا کیا سوال؟ جب میں خود وہاں موجود تھا تو کوئی آپریشن کیسے ناکام ہو سکتا تھا۔ ہاں یاد آیا، اب تم گھر جاؤ، صوفیہ بڑی شدت سے تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔ کل صبح تمہیں اسپتال آنا ہے کیونکہ کل سارا دن آپریشن روم میں گزرے گا۔ سرجری کے چھ کیس ہیں۔ صبح آ کر تمہیں ان تمام کیسوں کی ہسٹری کا مطالعہ کرنا ہے۔''

''مجھے.....؟'' فریڈ نے تحیر زدہ لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں تمہیں۔'' چیف سرجن سیمسن نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ان تمام کیسوں کی ہسٹری زبانی یاد ہے۔ تم چھ مہینے سے عیش کر رہے ہو۔ اب نیا سال شروع ہوگیا ہے، اس کے ساتھ تمہارے عیش بھی ختم صاحبزادے! کل صبح سے کام میں جت جاؤ۔''

ڈاکٹر فریڈ نے سحر زدہ انداز میں دستانے اتارے اور حیران حیران سا کچھ دیر اپنے ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ اس کی انگلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں حرارت بھرا خون رواں دواں تھا اور وہ بالکل ساکت تھیں جیسے کہ ایک سرجن کی انگلیاں ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر فریڈ نے چہرے کا ماسک اتار کر ایک طرف پھینکا اور دوڑتا ہوا آپریشن روم سے باہر نکل گیا۔

چیف سرجن سیمسن مشفقانہ انداز میں مسکراتے ہوئے دور تک اسے دیکھتا رہا۔

☆☆

زندگی ہزار رنگ

عاصمہ زیدی

ایک شخص کی کتھا جو خطاکار تھا۔ اس سے غلطی ہوئی تھی، وہ اپنی غلطی کی تلافی کے لیے کوشاں تھا۔ کیا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا؟

ایک لڑکی جو ایک شخص کی چکنی چپڑی باتوں کے جال میں پھنس گئی تھی۔ اب وہ اس شکاری کے جال سے نکلنا چاہتی تھی کیا وہ اس جال کو توڑ سکی؟

ایک شخص جو اپنی بربادی کا بدلہ اس شخص کی بیٹی سے لے رہا تھا جو اس کی تباہی کا ذمہ دار تھا۔ کیا وہ بدلہ لے پایا؟

زندگی ہزار رنگ ہوتی ہے اس کہانی میں آپ کو مختلف رنگ نظر آئیں گے

اس مرتبہ حیدر نے جان بوجھ کر مولوی صاحب کی روانگی کا وقت پریس والوں کو نہیں بتایا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا تھا کہ حیدر اور مولوی صاحب کی دوسری بیوی فائزہ کے علاوہ کوئی تیسرا شخص انہیں رخصت کرنے ایئرپورٹ نہیں پہنچا تھا اور مولوی صاحب دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئے تھے۔ مولوی رحمان الٰہی ہر سال تبلیغ کے لیے مختلف ملکوں میں جاتے رہتے تھے، ہر مرتبہ ان کی روانگی کا وقت بتایا جاتا تھا لیکن چند لمحے غور کرنے کے بعد ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ سارا گھپلا اخبار میں شائع ہونے والی خبر نے کیا ہے، لیکن مولانا نے اپنے سیکریٹری حیدر سے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے ادھوری خبر اخبارات کے لیے کیوں جاری کی تھی۔ اسے جہاز کی روانگی کا وقت ضرور دینا چاہیے تھا۔ مولانا اگر چاہتے تو سیکریٹری کو سخت سست کہہ سکتے تھے، لیکن وہ یہ سوچ کر خاموش ہو گئے کہ واپس آنے کے بعد نہ صرف اس سے جواب طلب کریں گے بلکہ ملازمت سے ہی جواب دے دیں گے، بہت پر پرزے نکال لیے ہیں حیدر نے۔

مولوی صاحب کے جہاز کے روانے ہوتے ہی فائزہ اور حیدر ایئرپورٹ بلڈنگ سے باہر آئے، اس دوران میں دونوں خاموشی رہی، کار میں بیٹھنے کے بعد بھی اس وقت تک فائزہ نے کچھ نہیں کہا جب تک کار ایئرپورٹ کے علاقے سے باہر نہیں آ گئی۔

''میرا خیال ہے تمہاری اس حرکت پر مولوی بہت ناراض تھا۔'' وہ اس کے سامنے اپنے شوہر کا ذکر اسی انداز میں کرتی تھی۔

''میری نہیں آپ کی حرکت پر۔'' حیدر نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''آپ نے خود کہا تھا کہ جہاز کی روانگی کا وقت نہ دیا جائے۔''

''تمہاری اس بات پر اس کو یقین نہیں آئے گا۔''

''میں انہیں یقین دلانے کی کوشش بھی نہیں کروں گا، پھر ان کی واپسی میں ابھی تین ماہ پڑے ہیں۔''

''وہ دورہ مختصر کر کے جلد واپس بھی آ سکتا ہے۔'' فائزہ نے کہا۔ ''یوں بھی اس کی بڑی بیگم بیمار ہے، اس کی بیوی کی موت کی اطلاع پر بھی اسے واپس آنا پڑے گا۔''

''مرنا تو ایک دن سبھی کو ہے، ابھی ہمیں بھی کوئی حادثہ پیش آ سکتا ہے اور ہم میں سے کوئی ایک یا پھر دونوں۔''

''تم مجھے موت سے ڈرا رہے ہو کیا؟''

''نہیں حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں۔'' حیدر نے کہا۔ ''میں تو آفس جاؤں گا آپ کو کہاں چھوڑوں؟''

''مجھے مولوی کی بیمار بیگم کے گھر پر تار دو۔'' فائزہ نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ ''اس نے جاتے ہوئے کہا تھا کہ میں شاکرہ کا خیال رکھا کروں، حالانکہ اس کے پاس اپنا ایک جوان بیٹا اور ایک جوان بیٹی بھی ہے، پھر مولوی کا سبھی کچھ اس کے پاس رہتا ہے۔''

''وہ سبھی کچھ آپ کے پاس بھی آ سکتا ہے لیکن۔''

''فکر مت کرو، میرے پاس ہی آئے گا، جب مولوی دوسرے سے واپس آئے گا تو اس مسئلے پر بھی بات ہو جائے گی، میں اسے اپنا وعدہ یاد دلاؤں گی۔ اس نے نکاح سے قبل یہی کہا تھا کہ نہ صرف میں تمہارا بے دام غلام ہوں بلکہ میری جائداد بھی تمہاری اپنی ہوگی، میں شاکرہ کے پاس اتنا ہی چھوڑوں گا کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ عزت سے زندگی گزارے۔''

''یہ بات بہت پرانی ہو گئی۔'' حیدر نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے مولانا کو بھولنے کی عادت بھی ہے۔''

''میں اسے اچھی طرح یاد دلا دوں گی۔'' فائزہ نے کہا۔ ''اچھا یہ باتیں رہنے دو، شام کا کیا پروگرام ہے؟''

''شام کی چائے تو شاید دفتر ہی میں۔''

''کیوں کیا بات ہے؟'' فائزہ نے حیدر کی بات کاٹ کر کہا۔

''حساب کتاب کرنا ہے، ملازمین کی تنخواہوں کا مسئلہ بھی ہے، رقم کی وصولی کے لیے بھی کئی جگہوں پر فون کرنا ہے، ممکن ہے ان میں سے کسی کے پاس جانا بھی پڑے، پھر مدرسے کی تعمیر کا مسئلہ بھی ہے، اس سلسلے میں بھی میں آج ہی پارٹی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''مدرسے کی تعمیر کا کام تو مولوی کہہ رہا تھا کہ شروع ہوگیا ہے۔''

''شروع تو کر دیا گیا تھا، لیکن بعد میں مولانا نے یہ کہہ کر رکوا دیا تھا کہ میرے بیرون ملک جانے تک اسے رکوا دو۔ جب میں چلا جاؤں تو سیٹھ رحیم سے بات کرنا کہ مولانا تو چلے گئے اور مدرسے کی تعمیر بہت ضروری ہے۔''

''مطلب یہ کہ اب تعمیر کے اخراجات سیٹھ رحیم برداشت کریں گے۔'' فائزہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''تو اور کون برداشت کرے گا؟'' حیدر نے کار کی رفتار کم کر کے دائیں طرف ٹرن لیتے ہوئے کہا۔ ''بینک کے اکاؤنٹ تو زیادہ رقم نہیں ہے۔''

''مولوی کے ذاتی اکاؤنٹ میں تو بہت کچھ ہے۔''

''جس اکاؤنٹ کا حساب کتاب میرے پاس ہے، اس میں شاید جان بوجھ کر زیادہ رقم نہیں رکھی جاتی۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو چند کھاتوں کا علم تو مجھے بھی ہے۔''

''آپ کے کھاتے میں بھی تو وہ بہت کچھ رکھتے ہوں گے؟'' حیدر نے بریک لگاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی منزل آ گئی۔''

''میرے کھاتے میں وہ جو کچھ رکھتے ہیں اس کا علم تمہیں رہتا ہے، میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔'' فائزہ نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔ ''رات فلیٹ پر آ جانا رات کا کھانا ہم ساتھ ہی کھائیں گے۔ بہت دن ہوگئے تمہارے ساتھ کھائے ہوئے۔''

حیدر نے دوسری طرف جھک کر دروازہ بند کیا اور سیدھے ہو کر کار آگے بڑھا دی۔ اپنی سوکن کے بنگلے کے گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے فائزہ نے سوچا کہ یہ حیدر تو بڑا اکڑو ہے، اسے اپنے ساتھ ملائے بغیر مولوی سے کچھ حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔

شاکرہ سے ملنا اسے اپنی سبکی یا توہین محسوس ہوتا تھا، اگر مولوی نہیں کہتا تو وہ اس بنگلے کا رخ نہیں کرتی، اسے یقین تھا کہ جہاں سے بھی موقع ملے گا اس کا شوہر نامدار شاکرہ کو فون ضرور کرے گا اور سب سے پہلا سوال یہی کرے گا کہ فائزہ آئی تھی یا نہیں، وہ گیٹ کے قریب پہنچی تو چوکیدار نے بتایا کہ بیگم صاحبہ گھر پر نہیں ہیں۔

''مگر ہم نے تو سنا تھا کہ بیگم صاحبہ بیمار ہے۔'' فائزہ نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا لیکن اس کا یہ طنز چوکیدار کے سر سے گزر گیا۔

''وہ بیمار تو ہے پر بچہ لوگ ضد کرتا تھا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' فائزہ نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ ''بیگم صاحبہ آئے تو کہنا کہ ہم آیا تھا۔''

''ہم ضرور بول دے گا۔''

بنگلے سے مین روڈ تک پہنچتے ہوئے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ٹیکسی لے کر سیدھی فلیٹ پر جائے گی، کہیں اور جانے کا موڈ نہیں بن رہا تھا، حالانکہ ایئرپورٹ جاتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ واپسی میں اپنی امی کے گھر جائے گی، دو ہفتے سے ان کی خبر ہی نہیں لی تھی، ٹیکسی اسے جلد ہی مل گئی تھی، ٹیکسی میں سوار ہونے سے پہلے اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو پتا بتایا اور پھر سیٹ پر بیٹھ کر پشت سے گردن ٹکائی اور آنکھیں بند کرتے ہی اس کا ذہن بھی ٹیکسی کی رفتار سے چلنے لگا۔ اس کی سوچ کا دائرہ رحمٰن الٰہی کے گرد ہی گردش کر رہا تھا۔

دو سال قبل اس نے مولوی رحمٰن الٰہی کو ایک گھریلو نشست میں دیکھا تھا، محلے کی خواتین نے انہیں مدعو کیا تھا، اسلام میں عورتوں کے حقوق کے بارے میں انہیں تقریر کرنی تھی۔ فائزہ بھی اپنی امی کے ساتھ اس گھر تک پہنچی تھی جہاں نشست کا اہتمام کیا گیا تھا، مولانا ٹھیک وقت پر پہنچے اور انہوں نے تقریر شروع کر دی، مولوی رحمٰن الٰہی تقریباً ایک گھنٹے تک اسلام میں عورتوں کے حقوق کے بارے میں تقریر کرتے تھے، درمیان میں وہ مختلف سوالات کے جوابات بھی دیتے رہے، آخر میں انہوں نے اپنے تبلیغی مشن کے بارے میں باتیں کیں۔ انہوں نے شہر سے دور اپنے مدرسے کے قیام کے مقصد اور اس کی کارکردگی کے بارے میں بتاتے ہوئے فائزہ کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ تقریر کے دوران بھی

فائزہ نے مولانا کی نگاہوں کو کئی بار اپنے جسم کے مختلف حصوں میں چبھتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ وہ بیٹھی بھی تو پہلی کار میں تھی، جب مولانا نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا تو اس کے دل کی دھڑکن نجانے کیوں تیز ہوگئی تھی۔

''میں..... آؤں مولانا، میں.....''

''ہاں بھئی تم، میں تمہیں بلا رہا ہوں۔'' مولانا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم تو یوں گھبرا اور ڈر رہی ہو جیسے جنگل میں تنہا ہو اور شیر تمہاری طرف بڑھ رہا ہو۔''

مولانا کے لبوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ اور ان کے چہرے پر چھائی ہوئی نرمی نے فائزہ کو اپنی جگہ سے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا، پھر اس کی امی نے بھی کہا تھا۔ ''جاؤ ڈر کیوں رہی ہو۔''

''جی فرمائیے۔'' فائزہ نے ان کے قریب پہنچ کر کسی قدر تیز آواز میں کہا، اس نے خود پر قابو تو پالیا تھا، لیکن اس کے لہجے میں خوف کے آثار موجود تھے۔

''پہلی قطار سے آخری قطار تک تم اپنے دوپٹے کا ایک پلو پھیلا کر گزرو'' مولانا نے کہا ان کے لبوں پر مسکراہٹ ہنوز باقی تھی ''جتنی خواتین یہاں موجود ہیں وہ تمہاری جھولی میں کچھ نہ کچھ ڈالیں گی، یہ چندہ مدرسے کے لیے ہے۔ اب آخری قطار سے ہو کر تم میرے پاس آؤ گی تو رقم کو گننے کے بعد یہیں سے سب خواتین کو بتاؤ گی کہ چندے کی رقم کتنی ہے، جتنی رقم ہوگی اتنے کی رسید میں خاتون خانہ کے نام روانہ کر دوں گا۔''

فائزہ نے مولانا کے کہنے پر عمل کیا آخری قطار سے مولانا کے پاس آنے کے بعد اس نے رقم گنی اور پھر اس کا اعلان کر دیا، پھر ساری رقم مولانا کے حوالے کر کے وہ جانے لگی تو مولانا نے اس کا نام پوچھ لیا۔

''تمہارا نام بھی اللہ کی رحمت سے خوب صورت ہی ہوگا، بتاؤ کیا نام ہے؟''

''جی میرا، فائزہ احمد۔''

''پڑھتی ہو؟''

''میں نے اسی سال بی اے کیا ہے؟''

''بہت خوب! مولانا نے کہا۔ ''مدرسے کا مرکزی دفتر شہر ہی میں ہے، تم نے دیکھا ہے؟''

''جی ہاں کئی بار دیکھا ہے۔''

''میں عصر سے لے کر مغرب تک عموماً دفتر ہی میں ہوتا ہوں، مدرسے کے لیے تم جیسی ذہین اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کی ضرورت ہے، اگر تم کبھی دفتر آؤ تو میں تمہیں تفصیل بتاؤں گا، میرا خیال ہے تم نیک کام میں دیر نہیں کرو گی۔''

فائزہ نے واقعی دیر نہیں کی تھی، وہ دوسرے ہی دن مرکزی دفتر پہنچ گئی۔

''مجھے توقع تو نہیں تھی بس دل کہہ رہا تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔'' مولانا نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا پینا پسند کرو گی؟''

''کچھ نہیں۔'' فائزہ نے دبی آواز میں کہا۔

اس کے منع کرنے کے باوجود مولانا نے اپنے اور اس کے لیے مشروب منگوا لیا تھا ''تم تو جانتی ہو میں گزشتہ دنوں ہی تبلیغی دورے سے واپس آیا ہوں۔''

''ہاں میں نے اخبار میں پڑھا تھا، میرا خیال ہے آپ سال میں چار پانچ ماہ باہر ہی گزارتے ہیں۔''

''اصل میں یہاں کی ذمے داریاں بھی بہت ہیں، ورنہ میں تو اس سے زیادہ وقت اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں گزارنا چاہتا ہوں۔''

فائزہ تقریباً پون گھنٹے مولوی رحمٰن کے ساتھ رہی، پہلی ملاقات میں مولانا نے معقول تنخواہ پر مرکزی دفتر میں کام کرنے کی پیشکش کی۔ فائزہ نے گھر والوں سے مشورہ کرنے کی بات کی، گھر آ کر اس نے مشورہ نہیں کیا، اس کا خیال تھا کہ گھر والے انکار کر دیں گے۔ وہ خود ہی کوئی فیصلہ کرنا چاہتی تھی، پھر رات گئے اس نے ملازمت قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

مولانا نے دفتر کی جو صورت حال بتائی تھی اس نے فائزہ کو بہت متاثر کیا تھا۔ مولانا نے بتایا تھا کہ جس کو انہوں نے دفتر کی ذمے داری سونپی ہے وہ دفتری کاموں کے لیے مناسب نہیں ہے، ان کا خیال تھا کہ ارمان صاحب دفتر میں بہتر کام کر سکیں گے، لیکن ایسا نہیں ہوا، انہیں دفتر کے لیے کسی مناسب فرد کی تلاش تھی، فائزہ میں انہیں ۰۰ ساری خوبیاں نظر آئی تھیں جو

ایک دفتر کے ذمے دار فرد میں ہونی چاہیے تھیں۔

دوسرے دن فائزہ مقررہ وقت پر دفتر پہنچی، مولانا اس کے منتظر تھے، وہ ان کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہی اپنا فیصلہ سنا دینا چاہتی تھی لیکن مولانا نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں گفتگو چھیڑ بیٹھے، پھر یہ گفتگو طویل ہوتی چلی گئی، ان کے کہنے کے مطابق ان کی بیوی شاکرہ نے ان کی زندگی میں زہر گھول رکھا تھا۔ وہ جب چاہتے اسے طلاق دے سکتے تھے لیکن ایک تو شاکرہ ان کے ماموں کی بیٹی تھی، دوسرے وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے شاکرہ کو طلاق دے دی تو اس کی زندگی برباد ہو جائے گی، اس کی زندگی کو آباد رکھنے ہی کے خیال سے وہ شاکرہ جیسی بے ڈھنگی، مغرور، ناسمجھ، کوتاہ نظر، محبت نہ کرنے والی معمولی صورت شکل کی عورت کو برداشت کر رہے تھے۔

''اس کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ کی ازدواجی زندگی ناقابل برداشت حد تک خراب ہے۔'' فائزہ نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''خیر میری نیکیوں کا صلہ میرا مالک مجھے ضرور دے گا۔'' مولانا نے لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''ایک بات تو میں نے تمہیں شرم کے مارے بتائی ہی نہیں۔''

''کون سی بات؟'' یہ سوال فائزہ کے لبوں سے غیر ارادی طور پر ہی نکل گیا تھا ''میں سمجھی نہیں آپ کون سی بات؟''

''کیا بتاؤں، میں بڑا بدنصیب ہوں، میرے پاس کس چیز کی کمی ہے، عمر میری کوئی زیادہ نہیں، صحت مند اور توانا ہوں، نیکیاں میں نے بے حساب کمائی ہیں اور پھر صاحب حیثیت بھی ہوں، جب میں کام کرنے بیٹھتا ہوں تو کوئی نوجوان بھی میرے مقابلے میں تیزی اور پھرتی سے دیر تک کام نہیں کر سکتا۔ اللہ نے مجھے صرف صورت شکل ہی اچھی نہیں دی، صحت بھی عطاء کی ہے، یہ سب کچھ دینے کے باوجود اللہ نے ایک بیوی ایسی عطاء کر دی جو میرے حقوق بھی ادا کرنے کے قابل نہیں ہے۔''

فائزہ، مولانا کی باتوں سے متاثر ہوئی تھی۔ انہوں نے اشاریوں کنایوں میں اور کہیں کہیں صاف لفظوں میں اپنی مظلومیت کی داستان کچھ اس انداز میں سنائی کہ فائزہ کے دل میں مولانا کے لیے ایک نرم گوشہ وا ہو گیا ''آپ کی گفتگو سننے کے بعد میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ کے ساتھ.....''

''مجھے تم سے اچھے سلوک ہی کی توقع ہے۔'' مولانا نے لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''کاش میں اپنا دل چیر کر تمہارے آگے رکھ سکتا، میری عمر زیادہ نہیں ہے، یوں بھی اسلام میں عمر کی کوئی قید بھی نہیں۔ بس فریقین حقوق زوجیت ادا کرنے کے قابل ہوں، میں بہت صاف گو آدمی ہوں، میری باتوں کا کوئی غلط مطلب مت نکال لینا، اگر میں حرام کاری کو گناہ کبیرہ تصور نہیں کرتا تو میرے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے، میری ہر رات رنگین ہو سکتی ہے، لیکن نہیں، سبھی کی طرح مجھے بھی اللہ کے پاس روبرو جانا ہے، میں کیا منہ لے کر جاؤں گا اپنے رب کے سامنے، بس یہی سوچ کر راتیں کروٹیں بدل بدل کر گزار دیتا ہوں، اللہ میری حالت پر رحم کرنے والا ہے۔''

فائزہ کا خیال تو یہی تھا کہ آج دفتر میں اس کا تقرر ہو جائے گا اور مولانا اسے دفتر کی ذمے داری کی ساتھ دفتر کی چابیاں بھی پیش کریں گے، لیکن مولانا نے اتنی دیر کی گفتگو کے بعد بجائے دفتر کی چابیاں فائزہ کے حوالے کرنے کے اپنی نجی زندگی کے محل کی چابیاں فائزہ کے پرس میں ڈال دیں۔ مرکزی دفتر سے اپنے گھر تک کا فاصلہ فائزہ نے مولانا کی ایک ایک بات پر غور کرتے ہوئے طے کیا، وہ رات سکون سے سو بھی نہیں سکی تھی۔

دوسرے دن شام پانچ بجے شام فائزہ یہ فیصلہ کر کے گھر سے نکلی تھی کہ مولونا کی نجی زندگی کے شیش محل میں داخل ہو جائے گی، یوں تو یہ فیصلہ اس نے بہت غور کرنے کے بعد کیا تھا لیکن غور و فکر کے ساتھ مولانا کی مظلومیت بھی فائزہ کے پیش نظر تھی۔ فائزہ نے مولانا کو جب اپنا فیصلہ سنایا تو انہوں نے شوخ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا

تھا۔

''اللہ تمہیں خوش رکھے، تم نے جی خوش کر دیا، بس اب اس نیک کام میں دیر بالکل نہیں کرنی چاہیے۔''

اور مولانا نے دیر بالکل نہیں کی تھی، ایک ہفتے کے اندر ہی فائزہ احمد، فائزہ رحمٰن ہوگئی تھی۔ نکاح کے بعد کے دو ہفتے تو فائزہ نے مولانا کے کسی دوست کے خالی فلیٹ میں گزارے اور پھر اپنے فلیٹ میں منتقل ہوگئی۔ بہت اچھے علاقے میں مولانا نے اسے فلیٹ خرید کر دیا تھا۔ اسے مولانا کے گھر میں کوئی تکلیف نہیں تھی، جو اس کے منہ سے نکلتا مولانا اسے پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس کے باوجود بھی بعض اوقات وہ مولانا سے اس نفرت کا اظہار کر دیتی تھی جو اسے پہلی ہی رات کو ان سے ہوگئی تھی۔

اس رات کے بعد پورے دو سال فائزہ کو انہیں برداشت کرتے گزر گئے، نکاح کے دوسرے ماہ حیدر علی مرکزی دفتر میں سیکریٹری کی حیثیت سے ملازم ہوا تھا۔ تین چار ملاقاتوں کے بعد فائزہ کو ایسا ہی لگا تھا جیسے اللہ نے حیدر علی کو فائزہ ہی کے لیے بھیجا ہو، لیکن حیدر کسی چکنی مچھلی کی طرح اس کے ہاتھوں میں آ کر پھسل جاتا تھا، پہلے تو اس نے اپنے دل کی بات آنکھوں کی زبان سے کہنے کی کوشش کی، پھر گفتگو اشاروں کنایوں میں شروع ہوئی اور اب اس نے کھل کر گفتگو شروع کر دی تھی۔

فائزہ کو مولوی رحمٰن الٰہی کے جانے کا ہی انتظار تھا، گزشتہ چار ماہ سے وہ اس وقت کے انتظار میں تھی، وہ اپنے اور حیدر علی کے درمیان کوئی ڈر کوئی خوف اور کوئی دھڑکا رکھ کر اپنی راتوں کو رنگین بنانا نہیں چاہتی تھی، اسی لیے وہ بڑے صبر و سکون سے مولانا کی بیرون ملک روانگی کا انتظار کر رہی تھی، آج رات کے کھانے کے بعد اسے اپنے خوابوں کی تعبیر ملنے کی امید تھی۔

ٹیکسی کو کرایہ دے کر رخصت کرنے کے بعد جب فائزہ فلیٹ پر پہنچی تو فلیٹ کا دروازہ کھلا دیکھ کر اسے بڑا تعجب ہوا۔ وہ گھریلو ملازمہ جو دن رات اس کے ساتھ ہی رہتی تھی کبھی دروازہ کھلا نہیں رکھتی تھی۔ شریفہ بی بی کو فلیٹ خریدنے کے بعد ہی سے مولانا نے ملازم رکھ لیا تھا، شریفہ بی بی کی عمر پچپن ساٹھ کے درمیان تھی۔ اس کے باوجود اس کی صحت قابل رشک تھی، دو چار دنوں ہی میں فائزہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ موصوفہ مولانا کی عقیدت مند اور فائزہ کی نگراں ہیں، مولانا نے ظاہر تو یہی کیا تھا کہ جیسے وہ شریفہ بی بی کو جانتے نہیں ہیں لیکن بات بہت کھل گئی تھی۔ شریفہ بی بی کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا، بیٹیاں شادی شدہ تھیں اور بیٹا غیر شادی شدہ تھا جو کبھی کبھی فلیٹ پر آ جاتا تھا، شریفہ بی بی نے کبھی اسے ڈرائنگ روم سے آگے نہیں بڑھنے دیا تھا۔ فلیٹ کے دروازے میں داخل ہوتے ہی فائزہ کو یہ خیال آیا کہ شریفہ کا بیٹا ہی ہوگا، لیکن جب وہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچی تو خوشی سے جھوم اٹھی۔ ڈرائنگ روم میں حیدر علی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے حیدر کے برابر والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ شام سے پہلے ہی تم سے ملاقات ہو جائے گی۔ تھکن سی ہو گئی تھی اور میں یہ سوچتی ہوئی آ رہی تھی کہ فلیٹ پہنچتے ہی بیڈ روم کا رخ کروں گا اور دھڑام سے بیڈ پر گر کر بے خبر سو جاؤں گی، ویسے دوپہر کے کھانے کا وقت بھی یونہی گزر گیا ہے، شریفہ بی بی نے چائے وغیرہ.....''

''پی کر بیٹھا ہوں۔'' حیدر علی نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پورے چالیس منٹ ہو گئے یہاں بیٹھے ہوئے۔''

''تو کیا تم سیدھے یہاں پہنچ گئے تھے مجھے چھوڑنے کے بعد؟''

''نہیں دفتر گیا تھا، دو تین فون کیے، سیٹھ رحیم سے ملاقات کا وقت لیا، میرا خیال تھا کہ وہ آج ہی ملے گا، لیکن اس نے کل صبح دس بجے کا وقت دیا ہے، بہرحال مولانا مجھے بڑی الجھن میں ڈال کر چلے گئے ہیں، بہت سارے معاملات میں وہ مجھے آخری وقت

تک اندھیرے میں رکھتے ہیں۔''

''جو معاملات تم سے آسانی سے نمٹ سکتے ہیں انہیں نمٹاؤ باقی رہنے دو، تم تھوڑی دیر مزید تنہا بیٹھو میں منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل کر آتی ہوں۔''

''کیا یہ بہت.....ضروری ہے؟''

''اتنا ضروری بھی نہیں، باہر سے آئی ہوں، دھول مٹی جمع ہے، پھر موسم بھی زیادہ بہتر نہیں ہے۔''

''اصل میں میں الجھ گیا تھا اس لیے یہاں چلا آیا، آپ نے بعض اوقات بڑے مفید مشورے دیے ہیں۔''

''کیا الجھن ہے؟''

''الجھن یہ ہے کہ مدرسے کا جو ڈھائی ہزار گز کا پلاٹ ہے اس کا قبضہ ناجائز ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو، میری معلومات تو یہ ہیں کہ وہ پلاٹ شاکرہ کے نام ہے اور الاٹ ہے۔'' فائزہ نے پرخیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''آپ کی معلومات بھی ٹھیک ہیں۔'' حیدر نے کہا۔ ''وہ پلاٹ شاکرہ بیگم کے نام سے ہی الاٹ کرایا گیا تھا لیکن اس پلاٹ کا رقبہ صرف دو سو چالیس گز کا تھا۔ اس پلاٹ کے الاٹ ہونے کے بعد احاطے کی دیوار بنائی گئی اور آگے پیچھے دائیں بائیں زمین بڑھائی گئی تو اس طرح دو سو چالیس گز کا پلاٹ ڈھائی ہزار گز کا ہو گیا۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ شاکرہ بیگم کا پلاٹ درمیان میں آ گیا۔''

''ہاں یہ بھی ایک مصیبت ہے، اگر اس پلاٹ کو ایک کونے میں چھوڑ کر زمین گھیر لی جاتی تو بہت سی مشکلیں آسان ہو جاتیں۔''

''میرا تو خیال ہے مدرسے کی عمارت کو تعمیر ہوئے بھی تقریباً بیس سال ہو گئے ہیں۔''

''ہاں احاطے کی دیوار تو بیس بائیس سال پہلے بنائی گئی تھی، پھر رفتہ رفتہ احاطے کے اندر مختلف حصے صرف کاغذات پر بنائے گئے۔ اب صورت یہ ہے کہ مولانا نے مدرسے کا نقشہ بنوا لیا ہے، وہ چاہتے ہیں اب جو تعمیر ہو وہ نقشے کے مطابق ہو۔''

''تم اس سلسلے میں کیوں پریشان ہو رہے ہو، تعمیر یعنی نقشے کے مطابق تعمیر شروع کرا دو۔''

''یوں کیسے تعمیر شروع کرا دوں، نقشے کی منظوری کا مسئلہ ہے، نقشہ منظور کرانے سے قبل پلاٹ کا الاٹ ہونا اور پھر لیز ہونا ضروری ہے، مولانا تو افسران کے نام پتے بتا کر چلے گئے ہیں اور کہا ہے کہ اگر یہ کام نہ بھی ہو تو کوئی بات نہیں تم سیٹھ رحیم سے مل کر اس رقم کا چیک ضرور وصول کر لو جو وہ مدرسے کی تعمیر نو کے لیے دے رہا ہے۔''

''تو وصول کر لو، اس میں کیا حرج ہے، چیک وصول کرو اور مدرسے کے اکاؤنٹ میں جمع کر دو۔''

''سیٹھ رحیم کا کہنا ہے کہ مجھے نقشہ دکھاؤ، پلاٹ کا الاٹمنٹ دکھاؤ، میں اپنے انجینئر سے بات کر کے رقم کا بندوبست کروں گا۔''

''یہ باتیں تو اس نے مولوی سے بھی کہی ہوں گی۔''

''شاید نہیں کہیں۔''

''اگر ایسا ہے تو تم سارے کاموں پر مولوی کے آنے تک لعنت بھیجو اور اس وقت کوئی اور بات کرو۔''

''اور کیا بات کی جا سکتی ہے آپ سے؟''

''یہ بھی بتاؤں تمہیں تم ننھے بچے تو نہیں ہو۔''

''آپ کے مقابلے میں تو عقل و شعور کے حساب سے بچہ ہی ہوں۔''

''میں سمجھی نہیں تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''میں نے دو ماہ تک مولانا کی ملازمت حاصل کرنے کے لیے پاپڑ بیلے تھے اور آپ تیسری ہی ملاقات میں مولانا کے سر پر سوار ہو گئی تھیں، یعنی بیوی بن گئی تھیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن اس میں میری ہوشیاری اور چالاکی کا کوئی دخل نہیں نہ یہ نکاح کسی منصوبے کا حصہ ہے، مولوی نے بڑی مظلومیت سے آفر دی اور میں نے قبول کر لی۔''

''ایک ساٹھ سالہ بڈھے کی آفر، آپ جیسی

حسین خوب صورت اور پڑھی لکھی لڑکی نے قبول کر لی، یہ سوال میرے ہی نہیں ہر شخص کے ذہن میں ابھرتا ہے، آخر کیوں؟''

''اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔'' فائزہ نے کہا، اس کے بعد وہ دیر تک حیدر سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہی پھر حیدر نے کہا۔

''میرا خیال ہے اب مجھے جانا چاہیے بہت دیر ہوگئی مجھے یہاں بیٹھے ہوئے، ممکن ہے دفتر میں کوئی میرا انتظار کر رہا ہو۔''

''تم فون کرلو یہاں سے۔ بس زیادہ سے زیادہ میں پچیس منٹ میں تیار ہو جاؤں گی۔'' فائزہ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے بی بی کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''بی بی چائے بنالیں، میں نہا کر ابھی آتی ہوں۔ چائے ڈرائنگ روم میں رکھنا، وہاں حیدر صاحب موجود ہیں۔''

''وہ گئے نہیں ابھی تک؟''

''نہیں میں نے انہیں روک لیا ہے، بس چائے پی کر چلے جائیں گے۔''

فائزہ جلد ہی نہا کر آ گئی تھی، پھر دونوں نے چائے پی اس کے بعد فائزہ نے بی بی کو بلا کر کہا۔ ''آج رات تمہیں فلیٹ پر تنہا ہی سونا پڑے گا۔''

''کیوں مجھے تنہا کیوں سونا پڑے گا؟''

''اس لیے کہ آج میں اپنی امی کے گھر جاؤں گی رات وہیں رک جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے تو پھر میں بھی اپنی بیٹی کے گھر چلی جاتی ہوں۔'' اس نے فائزہ کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس تو پھر ساتھ ہی نکلتے ہیں، کیا تم کار لے کر آئے ہو حیدر؟''

''ہاں دفتر کی کار ہے، لیکن وہ واپس دفتر کی پارکنگ میں کھڑی کرنی ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، پہلی بی بی کو ان کی بیٹی کے گھر چھوڑ دو اور مجھے امی کی طرف۔''

حیدر نے بی بی کو ان کی بیٹی کے گھر چھوڑ دیا اور جب وہ گھر کے اندر پہنچ گئی تو حیدر نے فائزہ سے پوچھا۔

''کیا آپ واقعی اپنی امی کے گھر جائیں گی؟''

''تمہیں کوئی شک ہے اس میں۔''

''نہیں بس یونہی پوچھ لیا تھا۔''

''پہلے تم کار پارکنگ میں چھوڑ دو پھر ٹیکسی کر کے کہیں چلتے ہیں۔''

''کار تو میں رات کو بھی پارک کر سکتا ہوں۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے، چلتے ہیں۔''

اس کے بعد وہ ایک بہترین تفریحی مقام پر پہنچ گئے، اس کے بعد رات کا کھانا ایک عمدہ سے ہوٹل میں کھایا گیا۔ اس کے بعد آفس کی پارکنگ میں کار پارک کر دی گئی اور دونوں باہر نکل آئے۔ ایک ٹیکسی روکی گئی اور ٹیکسی کے رکتے ہی فائزہ نے اسے فلیٹ کا پتا بتا دیا، حیدر خاموش نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بہر حال کچھ نہیں بولا اور دونوں فلیٹ پر پہنچ گئے، فلیٹ میں داخل ہوتے ہی فائزہ کی آنکھوں میں سرور کی کیفیت ابھر آئی تھی، وہ حیدر کو اپنے بیڈ روم میں لے گئی اور آدھی رات سے قبل ہی وہ اخلاق کی ساری حدیں پار کر گئے تھے۔ فائزہ کے بیڈ روم کے در و دیوار ان کے گناہ کے گواہ تھے، صبح ہونے تک دونوں اپنے گناہوں کی داستان رقم کرتے رہے اور پھر سورج چڑھنے تک سوتے رہے۔

فائزہ سے قبل حیدر کی آنکھ کھل گئی، اس نے سوچا کہ بہت دیر ہوگئی، اب یہاں زیادہ رکنا نہیں چاہیے، وہ کپڑے بدل کر فوراً ہی دفتر جانا چاہتا تھا، فائزہ کی طرف اس نے نگاہ کی، وہ بے خبر سو رہی تھی، وہ فائزہ کو جگاتے بغیر ہی فلیٹ سے نکل گیا، فلیٹ کا بیرونی دروازہ اس نے باہر سے بند کر دیا تھا۔

پھر مولانا کو گئے ہوئے ڈیڑھ ماہ گزر گیا، اس دوران حیدر نے ہاسٹل چھوڑ کر ایک کمرہ کرائے پر لے لیا تھا اور اب فائزہ بے دھڑک اس کے کمرے پر آ جاتی تھی، پھر ایک شام حیدر نے اپنے بارے میں

فائزہ کو بہت ساری باتیں بتائی تھیں، اس نے اپنے گاؤں یا والد نے نام کا حوالہ دیے بغیر بتایا کہ ایک زمانے میں مولانا اس کے گھر آتے تھے اور اس کے والد اور مولانا کی گہری دوستی تھی۔ اسی دوستی کے چکر میں حیدر کے والد نے مولانا کے کہنے پر کراچی میں پلاٹ خریدنے اور بنگلہ بنانے کا منصوبہ بنایا، مولانا نے بنا بنایا بنگلہ لینے پر زور دیا، حیدر کے والد مولانا کے ساتھ کراچی آئے ایک بنگلہ پسند کیا گیا اس کا بیعانہ بھی دیا گیا، پھر مولانا والد کے ساتھ ہی گاؤں آئے، حیدر کے والد نے پانچ لاکھ روپے ان کے حوالے کیے۔ یہ رقم بنگلے کے مالک کو دینا تھی۔ ایک ماہ کے بعد حیدر کے والد بقایا رقم لے کر جاتے اور پھر بنگلے کے کاغذات وغیرہ تیار ہوتے۔

''جن دنوں بنگلے کی خریداری کی بات ہو رہی تھی، انہیں دنوں میں پورے پاکستان کی سیر پر جانے کی ضد کر رہا تھا، چونکہ اس وقت میری عمر کم تھی اس لیے والد صاحب مجھے اکیلے جانے نہیں دینا چاہتے تھے، اپنی والدہ کو میں نے نیم رضامند کر لیا تھا لیکن والد کا فیصلہ اٹل تھا، چونکہ میں بھی انہی کا بیٹا تھا اس لیے میرا فیصلہ بھی اٹل تھا میں نے اپنے والد سے کہا کہ اگر آپ نے مجھے جانے کے لیے پیسے نہ دیے اور جانے کی اجازت نہ دی تو کچھ بھی کر کے چلا جاؤں گا، میری اس بات پر والد نے مجھے بہت برا بھلا کہا تھا، پھر انہوں نے مجھے گھر سے باہر قدم نہ نکالنے کا حکم دے دیا۔''

''پھر تم گھر سے بھاگ لیے؟''

''نہیں میں نے والد صاحب کو جو دھمکی دی تھی تو مولانا سامنے ہی تھا۔ پھر مجھے گھر سے بھاگنے پر مولانا نے مجبور کیا تھا، والد صاحب سے پانچ لاکھ روپے لینے کے بعد مولانا نے دوسرے دن جانے کا پروگرام بنایا تھا جبکہ اسی دن گھر سے نکلنے کی بات طے پائی تھی۔ اسی شام مولانا نے مجھے گھر سے نکالا اور دو چار دن گاؤں میں کہیں اور رہنے کا مشورہ دیا، اس کا کہنا تھا کہ دو چار دن کے بعد جب میں گھر پہنچوں گا تو پھر میرے والد صاحب مارے محبت کے اور اس خوف کے کہ کہیں میں فرار نہ ہو جاؤں میری بات مان جائیں گے۔''

''تم نے مولانا کے مشورے پر عمل کیا؟''

''ہاں میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا، دوسرے دن صبح مولانا نے شور مچا دیا کہ میں اس کے پاس رکھے ہوئے پانچ لاکھ روپے لے کر فرار ہو گیا ہوں، میرے والد نے میری تلاش میں اپنے آدمی دوڑائے، لیکن میں ان کے ہاتھ نہیں آیا، اس ڈرامے اور سازش کے بعد مولانا دو دن ہمارے گھر رہا اور پھر رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد ہی مجھے اطلاع ملی کہ وہ پانچ لاکھ کی چوری کا الزام مجھ پر لگا گیا ہے اور یہ کہ میرے والد نے مجھے پولیس کے حوالے کرنے اور سزا دلوانے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''کیا وہ ایسا کر سکتے تھے؟''

''ہاں، میرے والد اسی مزاج کے آدمی ہیں، مجھے یقین تھا کہ میں گھر پہنچا تو میرے والد مجھے پولیس کے حوالے کر دیں گے چونکہ وہ مولانا پر اندھا اعتماد کرتے تھے اس لیے اس کا ایک فیصد بھی امکان نہیں تھا کہ وہ میری بات پر یقین کر لیں گے، اگر میں ان کے سامنے سر پھوڑ لیتا تب بھی وہ مولانا کے مقابلے پر میری بات پر یقین نہیں کرتے، پہلے تو وہ خود مجھے سزا دیتے پھر پولیس کے حوالے کر دیتے، انہوں نے میری والدہ سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ بچ میں آئیں تو پھر اپنا اچھا برا سوچ لیں، میں کسی چور کو اپنی اولاد کہنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

''یہ تو تمہارے ساتھ بہت برا ہوا۔''

''بس یہی کچھ نہیں ہوا، میں ذہنی طور پر بچہ ہی تھا اس لیے مولانا کے بچھائے ہوئے جال کا کوئی توڑ میرے ذہن میں نہیں آیا پھر میں جس مکان میں تھا مجھے ان سے خطرہ ہو گیا کہ وہ میرے والد کو میرے بارے میں اطلاع دے سکتے تھے اس لیے میں وہاں سے بھی بھاگ لیا۔''

''کم از کم تم اپنی والدہ۔''

''نہیں، میں والدہ سے نہیں مل سکتا تھا، اگر میں ان سے ملتا تو یقیناً میری حمایت کرتیں اور والد صاحب انہیں اپنے ساتھ رکھنے سے ہی انکار کر دیتے، ممکن ہے بات طلاق تک بھی پہنچ جاتی، ہمارے ہاں ایک تو شادی خاندان میں ہی ہوتی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ بیوی کی حیثیت لونڈی سے زیادہ نہیں ہوتی۔''

''تو کیا نکاح کے بعد تم بھی مجھے لونڈی ہی سمجھو گے؟'' فائزہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم نے یہ کون سی بات کر دی؟'' حیدر نے فائزہ کو خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم سنجیدہ ہو گئے تھے بہت اس لیے میں نے سوچا۔''

''میں سنجیدہ ہوں فائزہ، کئی سالوں سے دھکے کھا رہا ہوں۔''

''میں سمجھتی ہوں اسی لیے تو تمہارا ساتھ دینے پر تیار ہو گئی ہوں، تم مولوی سے اپنا حساب چکاؤ، میں اپنا چکاتی ہوں، معاملہ برابر ہو جائے گا۔''

''بڑی بیگم جس بنگلے میں رہتی ہے اس میں میرے والد کے پیسے لگے ہوئے ہیں۔''

''پھر کیا خیال ہے؟''

''اس بنگلے پر بھی مجھے قبضہ کرنا ہے۔''

''میرا خیال ہے یہ کام ممکن نہیں ہے۔''

''ممکن کرنا میرا کام ہے؟''

''وہ کیسے؟''

''مولانا کی ایک ہی بیٹی ہے۔ وہ اس کے لیے سب کچھ کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔''

''تو تو کیا تم، تم رانیہ سے بھی شادی۔''

''یہ کون کہہ رہا ہے، میں اسے شیشے میں اتار کر نوبت دور تک پہنچا دوں گا، پھر شرط رکھ دوں گا کہ شادی اس وقت تک نہیں کروں گا، جب تک وہ بنگلا میرے نام نہ ہو جائے، پھر جب بنگلا میرے نام ہو جائے گا اس کے بعد میں اور تم ان سب کو بنگلے سے نکال کر وہیں رہیں گے۔''

''یہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو، بڑا خطرناک منصوبہ ہے تمہارا۔''

''جان من اس منصوبے میں تمہارے ساتھ نکاح بھی شامل ہے۔'' فائزہ خاموش ہو گئی تھی۔ پھر وہ جلد ہی وہاں سے رخصت ہو گئی تھی۔

واپس فلیٹ پہنچ کر وہ بہت دیر تک سوچتی رہی، کچھ بھی سہی رانیہ اس کو بہت پسند تھی اور وہ معصوم سی لڑکی کو کسی بھی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتی تھی، رات اسے نیند بھی نہیں آ سکی تھی، صبح ہونے تک اس نے ایک فیصلہ کیا اور پھر اسی فیصلے کے تحت اس نے مولانا کو خط لکھنا شروع کیا، اس میں اس نے مولانا کو حیدر کے ارادے بتائے اور کہا کہ وہ جلد واپس آ جائیں۔ ساتھ ہی اس نے اپنے کرتوت کے بارے میں بھی مولانا کو بتا دیا تھا اور معافی کی درخواست کی تھی۔

دوسرا کام اس نے یہ کیا تھا کہ شاکرہ کے بنگلے پر گئی تھی اور اسے تمام صورت حال بتا دی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس نے مولانا کو تمام باتیں خط میں لکھ دی ہیں، شاکرہ بیگم ہل کر رہ گئی تھیں، بیٹا پہلے ہی بیرون ملک تھا اور اب شوہر بھی باہر ہی تھا، ایسے میں یہ خبر ان پر بجلی کی طرح گری تھی، بیٹی سے پوچھا تو اس نے سادگی سے اقرار کر لیا کہ وہ حیدر سے محبت کرنے لگی ہے۔ انہوں نے سر پکڑ لیا تھا، بہر حال فائزہ نے کہا تھا۔

''مولوی صاحب کے آنے تک آپ رانیہ کو کچھ نہیں کہیں گی اور ہاں حیدر کی طرف سے ہوشیار رہیں، میں خود بھی کوشش کروں گی کہ ان کے آنے تک حیدر یہاں نہ آ سکے۔''

پھر اس نے ایسا ہی کیا حیدر کو بھی تھوڑا شک ہو چلا تھا کہ اس نے جلد بازی میں فائزہ کو سب کچھ بتا دیا اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا حل کیا ہو، اچانک دوسرے ہی دن دفتر میں مولانا صاحب کا فون موصول ہوا جس میں انہوں نے واپس آنے کی اطلاع دی اور حیدر کا شک یقین میں بدلنے لگا۔

☆☆☆

رات دس بجے مولانا بنگلے پر پہنچ گئے تھے، رانیہ اور بڑی بیگم سے ملنے کے بعد جب ان کی نگاہ فائزہ پر پڑی تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ وہ اپنی حیرت کا اظہار کرنے ہی والے تھے کہ شاکرہ نے کہا۔

''فائزہ صبح سے ہی یہاں ہے، مغرب کے وقت یہ جارہی تھی لیکن میں نے اسے روک لیا، میں نے کہا تھا کہ جب رک ہی گئی ہو تو ان سے مل کر جاؤ۔''

''ٹھیک ہے، اب میں جارہی ہوں، صبح پھر آجاؤں گی، بی بی فلیٹ پر اکیلی ہیں۔'' اس نے غلط کہا تھا کہ وہ بی بی سے کہہ کر آئی تھی کہ بیٹے کو بلا لینا وہ دیر سے آئے گی۔ مولانا نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی، دس بجے رات کو بنگلے سے فلیٹ تک پہنچنا مشکل کام تھا، اگر مولانا اسے رکنے کا کہتے تو وہ رک جاتی لیکن کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ فائزہ کے جانے کے بعد مولانا نے پوچھا۔

''کیا فائزہ یہاں روز آنے لگی ہے؟''

''نہیں آج رانیہ کے بلانے پر آئی تھی۔'' شاکرہ نے رانیہ کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ صبح کالج بھی جانا ہے۔''

رانیہ کے جانے کے بعد مولانا نے کہا۔ ''اسے کیوں بھیج دیا، بیٹھنے دیتیں۔''

''اگر وہ بیٹھی ہوتی تو پھر میں کھل کر بات نہیں کر سکتی تھی، تمہاری بیٹی محبت کرنے لگی ہے وہ بھی اس سے جو ہمارے خاندان کا دشمن ہے، جو آپ کے دینی مشن کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔'' مولانا کے مختلف سوالوں کے جوابات دیتے ہوئے شاکرہ نے وہ سب کچھ بتایا جو فائزہ نے اسے بتایا تھا۔

''یہ میں جانتا ہوں کہ حیدر میرے دوست کا بیٹا ہے، جس دن میں نے اسے ملازم رکھا تھا اسی دن میں اسے پہچان گیا تھا۔ اپنی درخواست میں جو اس نے ولدیت لکھی تھی اس پر پہلے تو میں چونکا اور پھر جب اسے غور سے دیکھا تو پہچان گیا، اس کا قد کاٹھ اور چہرہ بہت بدل گئے ہیں، اس کے باوجود بھی میں اسے پہچان گیا تھا، اس پر زیادہ اعتماد کرنے کی وجہ بھی یہی تھی، میں کسی موقع پر اسے بتانا چاہتا تھا لیکن پھر میں الجھ گیا، تمہیں تو پتا ہے کہ مدرسے کی تعمیر کے سلسلے میں اب سنجیدہ ہو گیا ہوں، اس سنجیدگی نے میری بھاگ دوڑ میں اضافہ کر دیا ہے۔ ابھی میں بھاگ دوڑ کر رہا تھا کہ باہر جانے کا پروگرام بن گیا اور میں فوراً ہی چلا گیا، اس دوران میں مجھے حیدر سے بات کرنے کا بالکل موقع نہیں مل سکا تھا، اصل میں اسے میں چونکانا بھی چاہتا تھا، جب وہ میری بات حیرت سے سنتا تو میں اس سے کہتا کہ اب اپنے والد کو حیرت زدہ کر دو۔''

''آپ کی ایک بات بھی میری سمجھ میں نہیں آرہی، معلوم نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' شاکرہ نے الجھے الجھے انداز میں کہا۔

''حیدر نے جو پانچ لاکھ روپے والی بات بتائی ہے وہ بالکل درست ہے، لیکن صرف اس حد تک کہ میں نے وہ پانچ لاکھ ہڑپ کرنے کے لیے اسے گھر سے فرار کرایا تھا لیکن دوسرے دن میرے ضمیر نے مجھے ملامت کیا اور پھر میں نے دوسری کہانی سنائی کہ حیدر چوری کیے ہوئے پانچ لاکھ روپے پتا نہیں کیوں چھوڑ گیا ہے، میں نے اپنے دوست سے کہا کہ یہ رقم مجھے اپنے سوٹ کیس میں رکھی ہوئی ملی ہے جبکہ یہ میرے سرہانے گدے کے نیچے سے غائب ہوئے تھے، بس شاکرہ، زندگی کا یہ پہلا نیک کام تھا جو میں نے کیا اور پھر اس نیک کام نے مجھے نیکی کے راستے پر ڈال دیا۔''

''لیکن حیدر کو نہیں معلوم کہ آپ نے رقم.....''

''اسے کس طرح معلوم ہو سکتا تھا، وہ تو گھر سے فرار ہو گیا تھا، اپنے والد کے خوف نے اسے گھر کی طرف دیکھنے بھی نہیں دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ فرار ہو کر اسی شہر میں آیا ہوگا، اس خیال کے تحت میں چپکے چپکے اسے تلاش کرتا رہا۔ مجھے اس وقت تک ذہنی سکون نہیں ملا جب تک حیدر میرے سامنے نہیں آ گیا، میں یہی

سوچتا رہا کہ میری وجہ سے میرے دوست کو اولاد کی جدائی کا غم برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ اسی شرمندگی کی وجہ سے میں نے اپنے دوست سے بھی رشتہ توڑ لیا، اس نے مجھے کئی خط بھی لکھے، میں نے ایک خط کا جواب بھی نہیں دیا، پھر جب مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ مجھ سے ملنے یہاں آ رہا ہے تو میں نے اسے لکھ دیا کہ میں ایک لمبے عرصے کے لیے بیرون ملک جا رہا ہوں واپسی پر اس سے ملاقات کروں گا۔ شاید وہ سمجھ گیا کہ میں اس سے جان چھڑا رہا ہوں۔''

''یہ تو آپ عجیب بات کر رہے ہیں، پہلے تو کبھی آپ نے اپنے دوست کا۔''

''ہاں میں نے تم سے یہی کہا تھا کہ کسی نے مجھے کاروبار میں دھوکا دیا تھا اس لیے اب میں بہاولپور نہیں جاتا لیکن ایسی بات نہیں تھی، مجھے بس یہ خلش اپنے دوست کے پاس جانے سے روکتی تھی کہ میری وجہ سے اس کا لختِ جگر فرار ہو گیا، جب حیدر از خود مجھے مل گیا تو پھر میں نے دوسرا منصوبہ بنایا۔''

''کیا منصوبہ بنایا آپ نے؟''

''منصوبہ کیا بس یہ سوچا تھا کہ حیدر رانیہ کے لیے ٹھیک ہے، لیکن حیدر کے رویے سے میں کچھ مشکوک سا ہو گیا اور پھر یہ سوچنے لگا کہ پتا نہیں حیدر میری رانیہ کو خوش رکھ سکے گا یا نہیں۔ ایک اور بات مجھے کھٹکنے لگی تھی، فائزہ مجھ سے متنفر سی ہو گئی اور اس کا جھکاؤ حیدر کی طرف میں نے محسوس کیا، بہرطور کئی باتیں گڈمڈ ہو گئی تھیں، یہی وجہ ہے کہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ فائزہ سے نکاح کر کے میں نے واقعی زندگی کی بڑی غلطی کی تھی۔''

''اللہ کا شکر ہے کہ آپ کو احساس تو ہوا۔''

''احساس تو مجھے نکاح کے چند دنوں کے بعد ہو گیا تھا، خیر میں نے باہر جانے سے قبل فیصلہ کر لیا تھا کہ واپسی پر فائزہ کو اپنے نکاح کے بندھن سے آزاد کروں گا اور حیدر کو وہ سب بتا دوں گا جو اسے معلوم نہیں ہے اور پھر اس سے رانیہ کی بات کروں گا۔''

''رانیہ حیدر کو پسند کرتی ہے۔''

''اور حیدر۔''

''وہ اسے برباد کرنا چاہتا ہے تاکہ آپ سے انتقام لے سکے، یہی کچھ رانیہ نے مجھے بتایا ہے، اس لیے اب آپ یہ خیال تو دل سے نکال دیں کہ رانیہ اور حیدر کے رشتے کی بات آگے چلے۔''

''ایسی بات نہیں، جب حیدر کو حقیقت کا علم ہو گا تو وہ یقیناً اپنے سارے منصوبوں پر خاک ڈال دے گا۔ پھر میں اس سے معذرت کر لوں گا۔ اسے بتاؤں گا کہ اس کے ساتھ جو کچھ میں نے کیا تھا اسی نے مجھے نیکی کا راستہ دکھایا میرے خوابیدہ ضمیر کو جگایا اور میں نے فراڈ کا کاروبار چھوڑ کر انسانیت اور دین کے راستے پر چلنے کا عزم کیا، یہ الگ بات ہے کہ میں اب تک کوئی کارہائے نمایاں انجام نہیں دے سکا کیونکہ مدرسے کے سلسلے میں جب میں نے نیک نیتی سے چندے جمع کرنے کی مہم چلائی تو مجھے زیادہ کامیابی نہیں ہوئی، ممکن ہے یہ اللہ کی کوئی مصلحت ہو، جب میں مدرسے کے نام پر اپنے عیش وعشرت کے لیے عطیات طلب کرتا تھا تو لوگ میرا دامن بھر دیتے تھے۔''

''میرا خیال ہے آپ کا یہ دورہ بھی ناکام ہوا ہو گا۔''

''ہاں لیکن میں نے اب دوسری بات سوچی ہے۔''

''کیا سوچا ہے آپ نے؟''

''اب میں اپنا یہ بنگلا بیچ دوں گا، بڑی گاڑی بیچ کر چھوٹی گاڑی لے لوں گا، اور جیسے تیسے کر کے مدرسہ مکمل کر لوں گا۔''

''یہ کیا بات کر رہے ہیں، ہم لوگ رہیں گے کہاں؟''

''کرائے کے مکان میں، دنیا میں بہت سے لوگ کرائے کے مکانوں میں رہتے ہی ہیں۔''

''یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے، اسی بنگلے پر تو میرے بیٹے کا حق ہے۔''

''میں جب تک زندہ ہوں تمہارے بیٹے کا اس پر حق نہیں ہے، خیر اس بحث میں مت پڑو، میں نے جو کچھ کہا ہے وہی کروں گا۔ سب سے پہلے تو میں صبح حیدر سے ملوں گا، اس کے بعد فائزہ کو نکاح کی زنجیر سے آزاد کر دوں گا اور پھر بنگلے کی فروخت کے سلسلے

میں پراپرٹی ڈیلر سے بات کروں گا۔''

بنگلا فروخت کرنے کی بات پر بیگم کا منہ پھول گیا، وہ کچھ کہے بغیر اپنی جگہ سے اٹھیں اور بیڈ روم کی طرف چل پڑیں۔

حیدر دو دن تک اپنی رہائش گاہ میں رہا۔ تیسرے دن وہ یہ فیصلہ کرکے نکلا تھا کہ فلیٹ جا کر فائزہ سے تمام حالات معلوم کرے گا، فلیٹ پہنچ کر اسے جو کچھ معلوم ہوا اسے سن کر اسے زبردست جھٹکا لگا، فائزہ نے اسے دروازے پر ہی روک لیا اور بولی۔

''اندر میرا ہونے والا شوہر موجود ہے، تم چلے جاؤ۔''

''کون، تم کس کی بات کر رہی ہو؟'' حیدر نے حیرانی سے پوچھا اور فائزہ کے پیچھے بی بی باہر نکل آئیں۔

''مجھے مولوی نے طلاق دے دی ہے اور میں بی بی کے بیٹے سے شادی کر رہی ہوں۔''

''لیکن کیوں۔''

''اس لیے کہ تم ایک دھوکے باز انسان ہو، تم نے رانیہ کو بھی دھوکا دینے کا پلان بنایا ہے، میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' یہ کہہ کر فائزہ نے فلیٹ کا دروازہ جھٹ سے بند کر دیا، حیدر کے لیے پہلی خبر یہ تھی کہ مولوی صاحب بتائے بغیر واپس آ گئے تھے اور انہوں نے فائزہ کو بھی طلاق دے دی تھی، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ شاید فائزہ نے انہیں ساری بات بتا دی ہے، بہرحال وہ پریشان سا اپنی رہائش پر پہنچا تھا، لیکن اس گھر کے ڈرائنگ روم میں مولوی صاحب اور رانیہ کو بیٹھے دیکھ کر چونک پڑا۔ شاید اس کے ساتھی نے مولوی صاحب کو اندر بٹھا دیا تھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ وہ بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ رانیہ اور مولانا اسے دیکھ کر نہ صرف مسکرائے تھے بلکہ والہانہ انداز میں اس کی طرف بڑھے بھی تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ کہتا مولانا خود ہی بول پڑے۔

''چونکہ تم میرے بہت گہرے دوست کے بیٹے ہو اس لیے تم جو کچھ میرے خلاف کر رہے تھے یا کرنے والے تھے اسے میں معاف کرتا ہوں، ویسے میں نے بھی تمہارے ساتھ زیادتی کی تھی، لیکن تم میری زیادتی کو میری خاطر نہ سہی، رانیہ کی خاطر معاف بھی تو کر سکتے ہو۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' حیدر نے رانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بابا سب کچھ سمجھا دیں گے، گھر چلیں۔'' رانیہ نے شرم سے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ ''بابا نے اصرار کیا تو میں آ گئی ورنہ میں تو آپ سے بہت ناراض ہوں۔''

آدھے گھنٹے کے بعد ہی حیدر مولانا صاحب کے بنگلے میں بیٹھا ہوا ان کی زبان سے ادا ہونے والے ہر لفظ کو غور سے سن رہا تھا اور دل ہی دل میں پشیمان ہو رہا تھا کہ وہ بغیر کچھ جانے یہ کیا کرنے چلا تھا۔ مولانا اور رانیہ سے گفتگو کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ ہی گیا تھا کہ انہیں رانیہ سے اس کے تعلق کا علم نہیں ہے۔

''اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم سب ساتھ ہی بہاولپور چلیں گے تاکہ تمہیں تمہارے والد کے حوالے کیا جا سکے اور اگر وہ پسند کریں گے تو میں رانیہ کو ان کی بہو بنانے کے لیے تیار ہوں۔''

''کب چلیں گے بابا؟''

''آج رات۔'' مولانا نے کہا پھر حیدر سے بولے۔ ''یہ بتاؤ دفتر کی کار تمہارے پاس موجود ہے کہ اسے تم نے۔''

''وہ دفتر کی پارکنگ میں موجود ہے۔'' حیدر نے شرمندگی سے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''میں نے اسے بیچ کر چھوٹی کار لینے کا فیصلہ کیا ہے اس کے علاوہ بنگلا اور عیش کا دوسرا سامان بھی بیچ دوں گا تاکہ مدرسے کی تکمیل کر سکوں، تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔''

''سب کچھ آپ کا ہے، بھلا مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے اور پھر یہ سب ایک نیک کام کے لیے ہو رہا ہے، خدا آپ کو اس میں کامیاب کرے۔''

''آمین۔'' مولانا نے اونچی آواز میں کہا۔

اس رات سب لوگ بہاولپور کے لیے ٹرین میں سوار ہو گئے۔ حیدر کو امید تھی کہ اس کے والد رانیہ کو دیکھتے ہی اسے پسند کر لیں گے پھر رانیہ ان کی جگری دوست کی بیٹی بھی تو تھی۔

☆☆

گدھ

صادق ہدایت

ہمارے اردگرد کی کہانی۔ ایران کے معروف ادیب صادق ہدایت نے اس تحریر میں انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ انہوں نے ایک ایسے گھر کی روداد بیان کی ہے جہاں ایک شخص کے مرنے پر گھر میں کہرام بپا ہے اور اس سے تعلق رکھنے والا ہر شخص اس کے ترکے کو ہڑپ کرنے کے چکر میں ہے۔

معاشرے کے تلخ حقائق کو بیان کرتی سچ بیانی

طاقچے میں نفتی چراغ رکھا ہے۔ اس سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ قریب گدے پر دو عورتیں بیٹھی ہیں۔ ان میں سے ایک جس نے برقعہ پہن رکھا ہے مہمان معلوم ہوتی ہے۔ دوسری جس نے چادر نماز اوڑھ رکھی ہے سوگ منا رہی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور ایک کسی قدر جوان عورت داخل ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک حقہ ہے۔ اسے مہمان کے سامنے رکھ دیتی ہے اور خود ایک جگہ بیٹھ جاتی ہے۔ وہ عورت جو چادر نماز اوڑھے ہے دفعتاً رو دیتی ہے۔

"ہائے بی بی خانم! وہ موتی کا دانہ تھا شوہر نہ تھا۔ مجھ کرموں جلی سے اس کی قدر نہ ہو سکی۔ قسم لے لو جو اس نے زندگی میں ایک مرتبہ بھی برا بھلا کہا ہو۔ یا پھول کی چھڑی تک ماری ہو۔ ہائے مشہدی اب تم سا شوہر کہاں سے لاؤں۔"

یہ کہتے ہوئے چادر اس کے سر سے سرک جاتی ہے۔ مہندی رنگے بال نمودار ہو جاتے ہیں اور وہ غش کھا کر زمین پر گر جاتی ہے۔ بی بی خانم حقے کی نے بدستور منہ میں رکھے ہوئے جوان عورت سے مخاطب ہوتی ہے۔

"نرگس خانم گھر میں برگ گل یا عرق گل ہے۔"

نرگس بے اعتنائی سے اٹھتی ہے اور انگیٹھی پر سے گلاب کی شیشی لے کر بی بی خانم کو دیتی ہے۔

"بہن تم کس جھمیلے میں پڑ گئیں۔ یہ عشق بناوٹی ہے۔ میں خوب جانتی ہوں ان نخروں کو۔ لو اب تم مانو گی نہیں۔ جس وقت مشہدی مرحوم آخری دموں پر تھا اس بے حیا نے سب کی آنکھ بچا کر اس کی کھڑی جیب سے نکال لی تھی۔"

بی بی خانم مریضہ کے بازوؤں پر مالش کرتی ہے۔ عرق کے چند قطرے اس کے چہرے پر چھڑکتی ہے اور شیشی اسے سنگھاتی ہے۔ اس سے مریضہ سنبھل جاتی ہے اور اٹھ بیٹھتی ہے۔

"دیکھ رہی ہو میری کیا حالت ہو رہی ہے؟ یہ صدمہ تو اب میری جان ہی لے کے رہے گا۔"

"اے بوا صبر سے کام لو۔ تقدیر کا لکھا پورا ہوا۔ آدمی کی کیا مجال کہ دم مار سکے۔"

"کیا کروں بہن؟ رہ رہ کر اس کی باتیں یاد آتی ہیں اور کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے۔ آج صبح بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ کہنے لگا سگریٹ سلگا کر مجھے دو۔ میں نے سگریٹ سلگا کر اس کے ہاتھ میں دیا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ اب میں چند گھڑیوں کا مہمان ہوں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ پر تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے

Waqar Azeem pakistanipoint

کہا۔ یہ کیا باتیں لے کر بیٹھے تم۔ خدا کرے تم زندہ رہو اور بیٹے کی خوشیاں دیکھو۔ اس نے کہا۔ حسن کے بارے میں تو میں کسی قدر مطمئن ہوں۔ پر فکر ہے تو تمہاری، تمہارا میرے سوا کوئی نہیں۔ تم یوں کرو کہ ابھی بیٹھ کر مکان کے متعلق اپنے نام کا وصیت نامہ لکھ لو۔ میں اس پر دستخط اور مہر ثبت کیے دیتا ہوں۔''

بی بی خانم پر معنی انداز میں گلا صاف کرتی ہے اور نرگس کی طرف دیکھتی ہے جو مسکرا دیتی ہے۔

''منیجہ (منیرہ) بہن اپنے آپ کو اس طرح ہلکان مت کرو۔ اللہ رکھے حسن اب جوان ہو گیا ہے۔ آج کل میں کسی کام پر لگ جائے گا۔''

یہ کہہ کر بی بی خانم حقہ منیرہ کی طرف بڑھا دیتی ہے۔ وہ چادر سے ہاتھ نکال کر اپنے منہ میں رکھ لیتی ہے۔ ایسا کرنے سے اس کی کلائی پر پہنی طلائی چوڑیاں نظر آ جاتی ہیں۔ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتی ہے۔

''مشہدی کے بعد تو میری زندگی اجیرن ہو کے رہ گئی۔ میں بے چاری عورت ذات سرتاپا قرض میں غرق۔ اب میں جی کے بھی کیا کروں گی؟''

نرگس جواب تک خاموش رہی ہے، یکا یک رونے پیٹنے لگتی ہے۔ بی بی خانم اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتی ہے۔

''اے بہن صبر سے کام لو۔ خدا کو یہی منظور تھا۔

خدا کے سامنے بندے کا کیا زور۔ ایسا نیک شخص روز روز پیدا نہیں ہوتا۔ اسی ہفتے کا واقعہ ہے کہ میں بازار میں مشہدی مرحوم کی دکان پر گئی۔ رقیہ کے لیے کپڑا لینا تھا۔ میں نے بڑے جتن کیے کہ کسی طرح قیمت لے لے۔ پر اس اللہ کے نیک بندے نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ رقیہ جیسی تمہاری بیٹی ویسی میری بیٹی اور پھر تم لوگ تو اہل بیت میں سے ہو۔ تم سے دام لے کر میں اپنی عاقبت خراب کروں۔ نہ بہن یہ مجھ سے نہ ہو گا۔''

منیرہ کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔

''ہائے بہن تمہاری تو آنکھیں سوج رہی ہیں۔''

منیرہ آہ بھرتی ہے۔

''کیا کہوں بہن؟ تین دن اور تین رات سے برابر جاگ رہی ہوں۔ حرام ہے جو لمحے بھر کے لیے بھی پلک تک جھپکی ہو۔ تمام وقت مرحوم کی پٹی سے لگی بیٹھی رہی ہوں۔ پر خدا کو میری محنت منظور نہ تھی۔ ورنہ کیا کیا جتن نہیں کیا میں نے۔ جامع مسجد میں دعا منگوائی حکیم موسیٰ کو بلوایا۔ اس نے کہا مریض کی انتڑیوں میں سردی نفوذ کر گئی ہے۔ رات بھر جاگ کر اس کے پیٹ کو گرم رکھا۔ گل گاؤزبان کا جوشاندہ پلایا۔ سونف اجوائن سنبل ہر قسم کی دوائیں اسے کھلائی پلائیں۔ پرسوں سے اس کی طبیعت ذرا سنبھلی ہوئی تھی۔ آج صبح جو میں اس کے سرہانے بیٹھی ذرا اونگھ گئی تو اس نے بڑے پیار سے کہا۔ منیرہ تم نے میرے لیے بہت تکلیف اٹھائی۔ میری خبر گیری میں رات دن ایک کر دیے۔ بھئی اب ہمارا آخری وقت ہے۔ کہا سنا معاف کر دو۔ میں نے نرگس سے شادی اس لیے کی تھی کہ وہ تمہاری کنیز بن کر رہے۔ لو کہہ دو نا ہمیں معاف کیا۔ میں نے کہا۔''

''اے بس جانے دو۔ کیا تھڑدلوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ اب تم ٹھیک ہو گئے ہو۔ کل سے دکان پر جا کر کام پر لگو۔ ایسی بدشگونی کی باتیں منہ سے نہیں نکالا کرتے۔ اس کے بعد بی بی خانم کیا کہوں مجھے اس کی حالت سے قدرے اطمینان ہو گیا۔ ادھر میری آنکھیں نیند کے مارے جھکی پڑتی تھی۔ کم بختی جو آئی تو میں نے نرگس سے کہا۔ تم جا کر مشہدی کے پاس بیٹھو میں ذرا کمر سیدھی کر لوں۔ بی بی خانم میں اپنے اکلوتے بیٹے کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ جب میں ظہر کے قریب اٹھ کر اس کے کمرے میں آئی تو مشہدی کی حالت بہت نازک تھی۔ بس اسی ایک گھنٹے میں جو میں اس سے جدا ہوئی، اس کی یہ حالت ہو گئی۔''

نرگس یہ سن کر چمک اٹھتی ہے۔

''لو اب بس کرو بہت کچھ کہہ چکی ہو۔ جب تک مشہدی زندہ تھا تم اس کے خون کی پیاسی تھیں۔ اب کیسے چہیتا شوہر بن گیا تمہارا۔ دیکھو بی بی خانم مجھ سے سنو۔ میں اپنی جوانی کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میں نے اکیلے ہی اس کی تیمارداری کی ہے۔ اس کا کام تو کھا پی کر سو رہنا تھا۔ اب الٹی مجھ پر تہمت لگا رہی ہے کہ میں نے مشہدی کو قتل کیا۔ کیا قاتل وہ نہیں ہے جس نے تمام چابیاں اپنے قبضے میں کر رکھی ہیں۔''

منیرہ کو آگ سی لگ جاتی ہے۔

''اجی بکواس بند کرو۔ تم سے کون بات کرتا ہے۔ خواہ مخواہ پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑا رہی ہو؟''

بی بی خانم سمجھاتی ہے۔

''بیبیوں صلوات پڑھو۔ شیطان پر لعنت بھیجو۔ نرگس خانم تم ہی ذرا ہٹ جاؤ۔'' نرگس روتی ہوئی کمرے سے باہر چلی جاتی ہے۔ منیرہ آہ بھرتی ہے۔

''قسمت اچھی ہوتی تو یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔ خدا بہتر جانتا ہے میری جان کس عذاب میں ہے۔ اب تم ہی کہو اس بدزبان عورت کے ساتھ میرا نباہ ہو سکتا ہے؟'' بی بی خانم ناک صاف کرتی ہے۔

''ہاں بہن یہ طعنے تو سو کوڑوں کی مار سے بھی زیادہ تکلیف دیتے ہیں۔'' منیرہ حقے سے کش بھر کر دھواں چھوڑتی ہے۔

''آج صبح میں حوض پر وضو کر رہی تھی کہ اندر سے نرگس کی آواز آئی کہ آ دیکھ لو مشہدی ہاتھ سے جا رہا ہے۔ بی بی خانم میں جو لپک کر کمرے میں پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ مشہدی پیچ و تاب کھا رہا ہے اور تیز تیز سانس لے رہا ہے۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی کہ اس کا سانس اکھڑ گیا اور دانت بھنچ گئے۔ اس کا رنگ فق تھا اور چہرے پر سیاہی پھیل رہی تھی اور ناک بھی کچھ ٹیڑھی ہوگئی تھی۔ میں گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں صرف اتنا کر سکی کہ آئینہ لا کر اس کے منہ کے سامنے رکھا۔ وہاں کیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا برسوں سے سانس نہیں لیا۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ دوڑی دوڑی گئی اور کربلا کی خاک پاک کی جوڈلی تم ہی نے سفر عتاب سے واپسی پر مجھے تحفے کے طور پر دی تھی، لے آئی اور پانی کی پیالی میں گھول کر مشہدی کے منہ پر چھینٹے دیے۔ مگر بہن اس کے دانتوں کو قفل لگ چکا تھا۔ منہ میں پانی جو ڈالا تو سارا جوں کا توں باہر نکل آیا۔ میں نے آقا شیخ علی کو بلوایا۔ پورے بیس تومان اس کے ہاتھ پر رکھے اور کہا کہ جتنی جلدی ہو سکے مشہدی کو سپرد خاک کر دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نعش دیر تک بے کفن پڑی رہے اور مرحوم کی روح کو اذیت پہنچے۔ اب تک اسے دفن کر چکے ہوں گے۔''

''بہن کیسا نیک بخت اور نیک وکار آدمی تھا، جبھی تو اس کی میت زیادہ دیر تک بے گور و کفن نہ رہی۔''

نرگس کمرے میں داخل ہوتی ہے۔

''شیخ علی آئے ہیں۔ پانچ تومان مانگ رہے ہیں۔'' منیرہ بی بی خانم کو متوجہ کرتی ہے۔

''لو دیکھ لو بہن۔ یہ ہیں آج کل کے لوگ۔ ان کا بس چلے تو مردے کی بوٹیاں تک نوچ لیں۔ یہ وہی شیخ علی ہے، جو مشہدی کا جگری دوست ہونے کا دعوا کیا کرتا تھا۔ آج صبح جب میں نے اسے بلوایا تو کہلوا بھیجا کہ مجھے مقدمے کے سلسلے میں کچہری تک جانا ہے۔ وہاں سے فارغ ہو کر آتا ہوں۔ میں نے ایسا بے مروت شخص آج تک نہیں دیکھا۔ صبح بیس تومان اینٹھ لے گیا ہے۔ اب پانچ اور مانگ رہا ہے (نرگس سے) اری تو کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہے۔ اندر لے آنا اسے۔''

نرگس باہر چلی جاتی ہے۔ شیخ علی داخل ہوتا ہے۔ سر پر کنواروں جیسا بڑا عمامہ ہے۔

''السلام علیکم! تمہارا سایہ ہم پر سلامت رہے۔ بیٹے کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔ (آہ بھرتا ہے) ہائے اللہ بخشے کتنا پیار تھا مشہدی کو مجھ سے۔ ایک لمحے کے لیے بھی جدا نہ ہوتا تھا۔ (رونے لگتا ہے) ہائے میرے دوست تو مجھے تنہا چھوڑ کر کہاں چل دیا۔ اے میرے محسن ایک تیرے نہ ہونے سے مجھ پہ مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ہائے میرا کلیجہ چھلنی ہوا جاتا ہے۔ ارے کوئی مجھ کو سنبھالو۔ (خود ہی سنبھل کر آنسو پونچھتا ہے) خیر خدا کو یہی منظور تھا اس کی مرضی کے سامنے انسان کا کیا زور۔'' منیرہ ٹوکتی ہے۔

''تم مطلب کی بات کرو۔ سب کام کر آئے؟''

''بس ہوا ہی سمجھو۔''

''اسے ابا کے پہلو ہی میں دفنایا ہے نا؟''

''ہاں پر ابھی مٹی نہیں ڈالی گئی۔''

''کیوں؟''

''تم نے بیس تومان دیے تھے۔ ان کا حساب حاضر ہے۔ گورکن کی مزدوری رہ گئی ہے۔ کمبخت کو لاکھ سمجھایا پر وہ برابر مزدوری کی رٹ لگا رہا ہے۔ میں اس لیے آیا تھا کہ پانچ تومان اور دے دو تو اس نابنجار کا منہ بند کروں۔''

''اب میں اور کہاں سے دوں؟ میرے پاس رکھا ہی کیا ہے؟ جو کچھ تھا وہ علاج پر صرف ہو گیا۔ لے دے کے اب یہ گھر کا سامان ہی رہ گیا ہے، سو وہ بھی یتیم کا مال ہے۔''

''میں پانچ تومان کے لیے تمہیں تکلیف نہ دیتا۔ پر کیا کروں؟ میں بھی مجبور ہو گیا ہوں۔ صبح

کہا تھا۔ نائب عدالت نے چالیس کے
بجائے پچاس تومان اینٹھ لیے۔ کہتا تھا سید ھے ہاتھ پچاس
تومان دے دو نہیں تو مقدمہ خراب کیے دیتا ہوں۔ میں
نے بڑی مشکل سے چالیس پر راضی کیا۔"
یہ کہہ کر ایک میز پر بیٹھ جاتا ہے اور حساب لکھتا
ہے۔ منیژہ سب کی آنکھیں بچا کر جیب سے کچھ
نوٹ نکال کر گنتی ہے۔
"میں نے پائی پائی کر کے کچھ رقم جوڑی
تھی۔ خیال تھا کہ کربلا کا سفر کروں گی۔ تم لوگ
اسے بھی ہتیا رہے ہو۔ اب میں عتبات کیسے
جاؤں گی اور مشہدی کے ساتویں کے اخراجات
کون دے گا؟"
شیخ علی کہتا ہے۔
"حوصلے سے کام لو بہن۔ جب تک میرے دم
میں دم ہے، تمہیں ان باتوں کی فکر کرنے کی ضرورت
نہیں۔ میں احسان فراموش نہیں۔ مشہدی کے مجھ پر
اتنے احسانات ہیں کہ اس کے بعد تمہاری خدمت
میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"
وہ تومان لے کر چلا جاتا ہے۔ منیژہ پھر رونے
لگتی ہے۔
"کاش مجھے موت آ جاتی! ارے ہاں یہ بھی کوئی
زندگی ہے۔ ذرا سوچو اب تک میں پورے پچاس
تومان اپنے پلے سے خرچ کر چکی ہوں۔ پر مجال ہے
نرگس کو ذرا بھی خیال آیا ہو۔"
دروازہ کھلتا ہے۔ نرگس اور اس کی ماں داخل
ہوتی ہیں۔ ماں پوچھتی ہے۔
"یہ مٹی کے تیل کی بدبو کہاں سے آ رہی ہے
بیبیو۔ اس اندھیرے میں دم نہیں گھٹتا تمہارا؟"
نرگس بڑھ کر چراغ کی بتی ٹھیک کر کے جلاتی
ہے۔ بی بی خانم سرک کے نرگس کی ماں کو جگہ دیتی
ہے۔ نرگس دیوار سے لگ کر رونے لگتی ہے۔ اس کی
ماں تسلی دیتی ہے۔
"نہ بیٹی یوں نہیں کیا کرتے! اگر خدا کو منظور ہوتا
کہ دنیا میں کوئی بیوہ نہ ہو تو ام النبی ہرگز بیوہ نہ
ہوتیں۔"
نرگس روتے روتے کمرے سے باہر چلی جاتی
ہے۔ نرگس کی ماں منیژہ سے مخاطب ہوتی ہے۔
"یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے تم لوگوں نے!
کیا اب بھی جی نہیں بھرا تمہارا جو نرگس بے چاری
کو بھی رلا رلا کر ہلکان کر رہی ہو! مشہدی کو تو تم
کھا گئیں اب کیا نرگس کو بھی ختم کرنا چاہتی ہو؟
میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی تمہارے پاس نہ
رہنے دوں گی۔ تم نرگس کا حصہ دے دو میں اسے
لے کر چلی جاؤں۔ وکیل کو بلوا لو۔ آج ہی فیصلہ
ہو جائے تو بہتر ہے۔ مجھ سے لڑکی کی یہ گت بنتے
نہیں دیکھی جاتی۔"
منیژہ جواب دیتی ہے۔
"یہ بھی کیا شریفوں کا وطیرہ ہے؟ میں کہتی ہوں
جھے بکھیڑے نہیں ہوں گے۔"
نرگس اندر آتی ہے اور چائے کا پیالہ ماں کے
سامنے رکھ دیتی ہے۔ منیژہ بی بی خانم کو متوجہ کرتی
ہے۔
"کیا نرگس کم تھی جو ماں کو بھی بلا لائی؟ آخر شرم
و حیا بھی کوئی چیز ہے۔ مشہدی نے خود مجھے وصیت کی
تھی کہ چابیوں کا گچھا سنبھال کر رکھنا۔ ایسا نہ ہو کسی
غیر کے ہاتھ لگ جائے۔ خیر میں رضا مند ہوں۔
وکیل کو بلوا لیں۔ میں وکیل کو چابیاں دے دوں گی۔
ابھی پانچ تومان شیخ علی لے گیا ہے۔ رہی سہی کسر یہ
نکال لیں۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ مشہدی
کے بعد تو یہ گھر مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ اگر اس جنتی کا
لحاظ نہ ہوتا تو میں کب کی گھر بار نرگس کے حوالے کر
چکی ہوتی۔"
نرگس چمک اٹھتی ہے۔
"ارے ہاں اتنا ہی خیال تھا مشہدی کا تو اس
کے مرنے کی دعائیں کیوں مانگا کرتی تھیں! وہ بے
چارا تو آخری دم تک تمہارا ہی رونا روتا رہا۔ میں خوب
سمجھتی ہوں، تم نے چابیاں اس لیے چھپا لی ہیں کہ یتیم
کے مال پر قبضہ کر سکو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے تم نے کفن

دفن میں اتنی عجلت کیوں دکھائی ہے۔''

''بکتی جاؤ میں تمہارے منہ نہ لگوں گی۔''

نرگس کی ماں ٹوکتی ہے۔

''اجی بس بہت ہو چکا۔ اب ذرا زبان سنبھال کر بات کرنا۔'' نرگس بڑھ کر کہتی ہے۔

''میں اب تک خاموش تھی تو اس لیے کہ مجھے مشہدی کا لحاظ تھا۔ اب پھر تم نے کچھ بکا تو زبان گدی سے کھینچ لوں گی۔''

بی بی خانم سمجھاتی ہے۔

''صلوات پڑھو بہنو۔''

منیرہ سنی ان سنی کر کے نرگس کو جواب دیتی ہے۔

''اجی آئیں بڑی لحاظ والی۔ جیتے جی تو مشہدی کو سکھ کا سانس نہ لینے دیا۔ اب لگیں محبت جتانے۔ بے وفا کہیں کی۔''

نرگس ترکی بہ ترکی جواب دیتی ہے۔

''جی ہاں آپ تو بڑی وفادار ہیں۔ ذرا یہ تو کہو کہ یہ جو قیمتی کپڑے تم نے پہن رکھے ہیں، کہاں سے آئے؟ صبح تک تو تم ننگی بوچی تھیں۔''

''ہاں تم تو جیسے زیوروں ہی میں لدی پھندی آئی تھیں۔'' بی بی خانم پھر سمجھاتی ہے۔

''بیبیو۔ ذرا دم لو۔ یہ وقت طعنوں کا نہیں۔ حمد و دعا کا ہے۔ قرآن خوانی کرو کہ مرحوم کی روح کو ثواب بھی پہنچے۔''

اتنے میں نرگس کی ماں یکا یک چلا اٹھتی ہے۔

''مرنے جوگیو۔ مردے کو دیکھو وہ چلا آتا ہے۔'' بی بی خانم بھی چیختی ہے۔

''ہائے بہن۔ سامنے شیشے میں سے دیکھو۔ مشہدی ہاں مشہدی آ گیا۔'' نرگس اور منیرہ رونا پیٹنا شروع کر دیتی ہیں۔ دروازہ کھلتا ہے مشہدی اندر آ جاتا ہے۔ سفید خاک آلود کفن میں ہے۔ رنگ اڑا ہوا ہے۔ بال الجھے ہوئے ہیں۔ دروازہ بند کر کے دیوار کے سہارے کھڑا ہو جاتا ہے۔

منیرہ اپنے گریبان سے ایک تھیلی نکال کر اس کی طرف پھینکتی ہے اور چوڑیاں اتارتے ہوئے چلاتی ہے۔

''نہیں نہیں۔ میرے قریب مت آنا یہ لو اور چلے جاؤ۔ یہ رہا چابیوں کا گچھا۔ سو تومان جو میں نے تمہارے صندوق سے نکالے تھے تھیلی میں پڑے ہیں۔ مجھ پر رحم کرو۔ یہ گھڑی بھی لے لو۔''

نرگس اپنی چادر کے کونے سے کچھ کھولتی ہے۔

''یہ تمہارے نقلی دانت ہیں، جو تم نے پانچ تومان میں خریدے تھے اور یہ رہے پانچ تومان جو میں نے شیخ علی سے چھینے تھے۔ انہیں لے کر مجھے چھوڑ دو۔ میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ منیرہ نے سب کمروں کو تالے لگا رکھے ہیں۔'' مشہدی مسکراتا ہے۔

''ڈرو نہیں میں مرا نہیں۔ سکتہ ناقص تھا۔ قبر میں مجھے ہوش آ گیا۔'' منیرہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہتی ہے۔

''نہیں نہیں تم مر چکے ہو۔ خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ وہ رہی تمہاری چہیتی نرگس۔'' نرگس خوف کے مارے ماں کے پیچھے جا کھڑی ہوتی ہے اور رونے لگتی ہے۔ مشہدی کہتا ہے۔

''نہیں میں زندہ ہوں۔ ابھی مٹی نہیں ڈالی گئی تھی کہ میں اٹھ بیٹھا۔ گورکن غش کھا کر گر پڑا۔ میں بڑی مشکل سے باہر نکلا اور الیاس کے ہاں پہنچا۔ وہ مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر یہاں لایا ہے۔ یقین نہ آئے تو صحن میں دیکھ لو وہ ابھی یہیں کھڑا ہے۔''

منیرہ بظاہر سکھ کا سانس لیتی ہے۔

''نرگس بہن، میں نہ کہتی تھی شیخ علی بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ انہوں نے تین گھنٹوں میں مردے کو زندہ کر دیا۔ ارے کوئی میری چلم بھریو۔''

☆☆

شکر اللہ کا

خواجہ احمد عباس

خواجہ احمد عباس کے یہاں عشق کا تصور دوسرے افسانہ نگاروں سے قدرے مختلف یا یوں کہیے کہ زیادہ حقیقت پسندانہ ہے۔ ان کے اس نوع کے بیشتر افسانوں میں عشق کی بنیاد مساوی معیار زندگی پر قائم ہوتی ہے۔ اگر عاشق و محبوب کی زندگی معاشی اعتبار سے ایک جیسی نہیں ہے، ایک امیر دوسرا غریب ہے تو محبت استوار نہیں رہتی۔ گویا زندگی کا ایک جیسا معیار اور معاشی یکسانیت محبت کی پہلی شرط ہے۔

"شکر اللہ کا" اسی پس منظر میں لکھی ایک کہانی ہے، ایک جولا ہے کی آپ بیتی جسے ایک تحصیل دار کی بیٹی سے محبت ہوگئی تھی لیکن مفلسی اور بے روزگاری کی وجہ اپنی محبوبہ کو بھگانے کی ہمت نہیں جٹا پایا۔ پھر دونوں کا انجام کیا ہوا آپ کو کہانی پڑھ کر ہی معلوم ہوگا۔

خواجہ احمد عباس کا کڑوا سچ

نہیں صاحب کوئی شکوہ شکایت نہیں۔ رشتے داروں، دوستوں، دشمنوں، تعلقات والوں، افسروں، مالکوں..... کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ نہ سرکار سے کوئی گلا ہے نہ اللہ میاں سے کوئی شکوہ۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے قسمت کے لکھے کو کون کیسے مٹا سکتا ہے، سو میں اپنی قسمت پر شاکر ہوں اور صبح شام خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ کہ کھانے کو پلاؤ قورمانہیں تو چٹنی روٹی تو بھیج دیتا ہے۔ سر کے اوپر آسمان کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں تو کیا ہوا، سونے کے لیے فٹ پاتھ کے پتھر تو ہیں۔ میری کٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھ کر رحم نہ کھائے صاحب خدا کا شکر ہے۔ دوسری ٹانگ تو صحیح ہے۔

سچ پوچھیے تو صبر ہی غریبوں کی سب سے بڑی دولت ہے۔ صبر ہماری عورتوں کا زیور ہے۔ اور ہمارے بچوں کا کھلونا۔ آپ محلوں، بنگلوں میں رہنے والے صبر کے فائدے کیا جانیں۔ سوکھی روٹی کو صبر کی چٹنی سے لگا کر کھاؤ تو مرغ مسلم کا مزا آتا ہے پھر سڑک کے کنارے صبر کی نمی گدی بچھا کر اوپر سے صبر کی ریشمی چادر اوڑھ کر سو جاؤ۔ ایسی نیند آتی ہے کہ کسی راجہ نواب کو نہ آتی ہوگی اور جب مشین میں آ کر میری بائیں ٹانگ کٹ گئی اور مل مالکوں نے ہرجانہ دینے سے انکار کر دیا اور میں کباڑی کے یہاں سے دو روپے میں یہ ٹوٹی ہوئی بیساکھیاں خرید کر اچھلتا کودتا لنگڑاتا ہوا ایک ڈاکٹر کے یہاں پہونچا جو کہ نقلی ٹانگ بنانے میں مشہور تھا اس نے ربڑ کی ٹانگ لگانے کے لیے ہزار روپیہ اور لکڑی کی

ٹانگ کے لیے پانچ سو مانگے اور میری جیب میں صرف سات روپے نکلے۔ تو آپ جانتے ہیں میں نے کیا کیا؟ اور نہ ربڑ کی ٹانگ لگوائی نہ لکڑی کی ..... صبر کی ٹانگ لگوائی۔ اس دن سے آج تک انہیں ٹوٹی ہوئی بیساکھیوں اور صبر کی ٹانگ سے گزارہ کر رہا ہوں۔ صبر ہو تو بیساکھیوں کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے صاحب اللہ نے ہاتھ دیے ہیں۔ کولھے دیے ہیں وہ سامنے دیکھیے نالوے رولد و تو دونوں ٹانگیں بیکار ہیں۔ پھر بھی ہاتھوں اور کولھوں کے مزے سے گھسٹ گھسٹ کر چل لیتا ہے اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے ٹانگوں کے ساتھ باہوں پر فالج نہ گرا دیا۔

خدا کی مہربانی تھی۔ کہ بچپن ہی سے باپ سے صبر کا سبق ملا۔ ہم ذات کے جولاہے ہیں۔ صاحب یوں تو ہم مسلمانوں میں ذات پات نہیں ہوتی۔ خدا کے بندے سب برابر ہیں۔ مگر اسیری غریبی اونچ نیچ! شرافت رزالت بھی تو اللہ کی بنائی ہوئی ہے اس لیے میرے باپ کا کہنا تھا کہ انسان کو اپنا درجہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔ اور وہ عمل بھی ہمیشہ اسی اصول پر کرتا تھا۔ بوڑھا ہونے پر بھی وہ شریفوں کے لونڈوں تک کو جھک کر سلام کرتا۔ ہر پٹھان کو ''خاں صاحب'' ہر سید کو ہیر صاحب ''ہر بنیے کو..... لالہ جی'' ہر برہمن کو پنڈت جی'' اور ہر چھوٹے سے چھوٹے افسر کو..... یہاں تک کہ پٹواری، نمبردار تک کو ..... ''سرکار'' کہتا تھا۔ مگر وہ سب اسے ''بندو جولاہا'' کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ ان امیر شریفوں کے بچوں کو اجلے کپڑے پہنے، کتابیں ہاتھ میں لیے اسکول جاتے ہوئے دیکھ کر ہم بھائیوں کا بھی جی چاہتا کہ ہمارے بھی ایسے کپڑے ہوں اور پڑھ لکھ کر ہم بھی افسر بنیں۔ مگر میرا باپ ہمیں سمجھاتا۔ ''بیٹا! اپنی اوقات کبھی نہ بھولنی چاہیے۔ خدا نے جو درجہ دیا ہے۔ اسی پر صبر شکر سے صبر کرنا چاہیے نہیں تو کوا چلا ہنس کی چال، والی کہاوت ہو جائے گی۔ میرے باپ کو کہاوتیں بہت یاد تھیں۔ اور جیسا موقع ہوتا وہ فوراً کوئی نہ کوئی کہاوت بنا دیتا۔

ایک برس کی بات ہے۔ جب ہم شہر کے ایک آڑھتی بنیے کے لیے کمبل بنا کرتے تھے وہ ہمیں اون اور کمبل ڈیڑھ روپیہ کتائی اور بنائی کا دیتا اور پھر اسی کمبل کو دس روپے، گیارہ روپے میں بازار بیچتا، ہاں ایک برس عید کے موقع پر بابا کو آڑھتی کے یہاں سے رقم نہ ملی۔ بات یہ تھی کہ اس سال ولائیت اور جاپان سے مشین سے بنے ہوئے جھاگ جیسے ملائم کمبل سستے داموں آ گئے تھے اور ہمارے مظفر نگر کے کمبلوں کی مانگ بہت کم ہو گئی تھی۔ سینکڑوں کمبل بن بکے پڑے ہوئے تھے اور خود ہمارے والے آڑھتی نے، ولائتی کمبلوں کی ایجنسی لے لی تھی۔ ہاں تو جب بابا کو پچاس ساٹھ کمبلوں کی بنائی نہ ملی تو وہ بے چارہ ہمارے لیے کپڑا کہاں سے بنواتا؟ وہی پچھلے

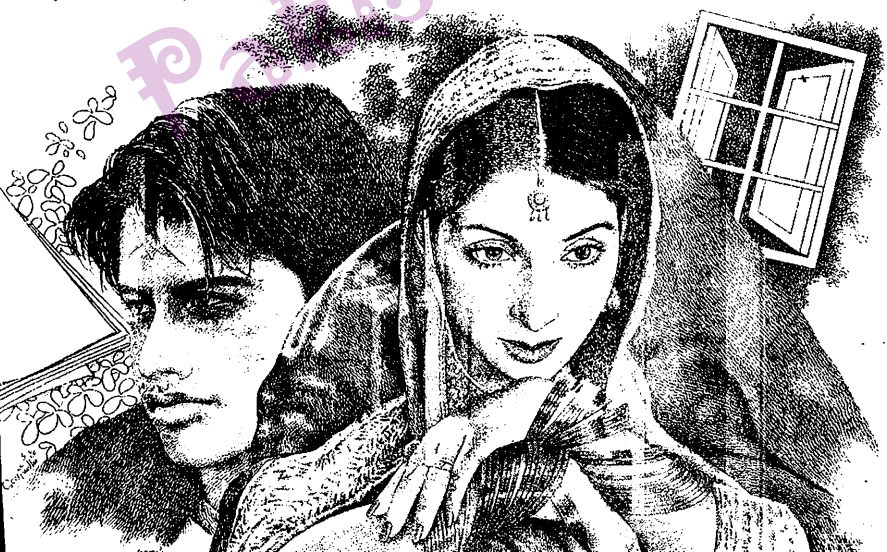

سال کی عید کے کپڑے ماں نے گھر میں صابن سے دھو کر دے دیے جب ہم نے اپنے پڑوس میں وکیل صاحب کے بچوں کو ریشمی اچکنوں اور نئی ترکی ٹوپیاں پہنے دیکھا تو ہمیں بڑا رونا آیا۔ پر بابا نے کہا۔ ''ارے روتے کیوں ہو؟ وہ امیر اپنے مال میں مست ہیں تو ہم غریب اپنی کھال میں مست۔'' یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ وہ دن اور آج کا دن، جب میں بھی کسی امیر رئیس کو بڑھیا کپڑے پہنے اکڑفوں کرتے دیکھتا ہوں، تو فوراً اپنی کھال میں مست ہو جاتا ہوں۔

ہاں صاحب، تو جب میں بڑا ہوا تو کئی برس تو اپنے باپ کے ساتھ کمبل بننے کا کام کرتا رہا۔ مگر جب یہ دھندا مندا پڑ گیا، تو میرے باپ نے نمبردار سے سفارش کروا کر مجھے تحصیلدار صاحب کے یہاں نوکر رکھ دیا۔ تحصیلدار صاحب شہر کے باہر تحصیل کے پاس ایک بنگلے میں رہتے تھے۔ اللہ بخشے، خان قدرت اللہ خاں نام تھا ان کا۔ بڑے رعب داب والے تھے۔ یہ بڑی بڑی مونچھیں اور آواز ایسی کہ کسی کو زور سے ڈانٹ دیں تو ڈر کے مارے پیشاب نکل جائے۔ شربھران سے کانپتا تھا۔ ان کے یہاں بس میں ایک ہی نوکر تھا۔ تحصیل کے دو چپراسی بھی کچہری کے وقت کے بعد اوپر کا کام کرتے تھے۔

مگر گھر کا سب کام کاج مجھے ہی دیکھنا پڑتا تھا۔ کھانا پکانے کو ایک بڑھیا دو وقت آ جاتی تھی۔ مگر جھاڑو دینا۔ روز کمرے کی میز کرسیوں کو جھاڑنا پونچھنا تحصیلدار صاحب کو ہر پندرہ بیس منٹ بعد حقہ بھر کر دینا۔ برتن دھونا۔ بستر بچھانا۔ بازار کا سودا سلف لانا یہ سب میرا کام تھا اور ہاں۔ ان سب کاموں کے علاوہ ایک کام اور بھی تھے۔ وہ تھا تحصیلدار صاحب کی بیٹی بانو کی کتابیں اٹھا کر اسے اسکول چھوڑ کر آنا۔ لڑکیوں کا اسکول کوئی دور نہ تھا۔ بنگلے سے مشکل سے آدھا میل ہوگا۔ اور کھیتوں سے ہو کر جاؤ تو اس سے بھی کم۔ مگر تحصیلدار صاحب کے شان کے خلاف تھا کہ ان کی بیٹی کتابیں اٹھا کر لے جائے۔ اس لیے بانو کو اسکول پہنچانا اور وہاں سے واپس لانا..... میرا فرض تھا اور سچ پوچھیے تو سارے کاموں سے یہی کام مجھے سب سے اچھا لگتا تھا۔

ان دنوں میں کوئی ۱۷۔۱۸ برس کا ہوں گا۔ صاحب! خدا کے فضل سے ناک نقشہ بھی برا نہیں تھا۔ صحت بھی ماشاءاللہ اچھی تھی۔

پھر تحصیلدار نے دو چار پرانی قمیض اور شلواریں بھی دیدی تھیں۔ جنہیں میری ماں نے گونتھ گانتھ کر ٹھیک کر دیا تھا۔ وہ پہن کر اور سر کے بالوں میں کڑوا تیل ڈال۔ میں بھی اچھا خاصہ جنٹلمین لگتا تھا۔ بانو اسکول تو برقعہ اوڑھ کر جاتی تھی۔ مگر مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ تحصیلدار صاحب پردے کے معاملے میں ویسے بڑے کٹر تھے۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ نوکروں سے کیا پردہ؟ یا گھوڑے سے کیا پردہ؟

ہاں تو صاحب، بانو مجھ سے پردہ نہیں کرتی۔ کوئی پندرہ یا سولہ برس کی ہوگی ساتویں کا امتحان دینے والی تھی۔ اس کا حال کیا بتاؤں آپ سے ایسی باتیں کرتے شرم آتی ہے۔ پر یہ سمجھ لیجیے کہ اللہ میاں نے خاص اپنے ہاتھ سے بانو کو بنایا تھا۔

رنگت ایسی جیسے میدا اور شہد اور کالے ریشمی برقعہ میں منہ نکال کر جب وہ میری طرف دیکھ کر کبھی مسکرا دیتی، تو ایسا لگتا تھا۔ جیسے بدلی میں چاند نکل آیا ہو۔

گھونگھر والے بال۔ بڑی بڑی کٹورا جیسی آنکھیں۔ میں آدمی تھا۔ سرکار، وہ بھی جوانی کا عالم، پر فرشتے بھی اسے دیکھ لیتے تو ایک بار اپنی پارسائی کو بھول جائے۔ پھر بھی وہ مالک کی بیٹی تھی میں نوکر تھا۔ کبھی ایسا ویسا خیال آتا تو میں سوچتا۔ ''ابے او بندو جولاہے کے بیٹے۔ کیوں پاگل ہوا ہے؟ اپنی اوقات مت بھول، نہیں تو اتنے جوتے پڑیں گے کہ سر گنجا ہو جائے گا۔ اور یہ سوچتے ہی میرا نشہ ایسا غائب ہو جاتا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ پر سرکار، جھوٹ کیوں بولوں، اگلے دن جب اس کی کتابیں اٹھائے کھیتوں سے ہوتا ہوا بانو کے ساتھ اسکول جاتا اور ادھر ادھر کوئی نہ پا کر وہ برقعہ سر سے اتار دیتی اور اس کے بالوں کی بھینی خوشبو، ہوا میں پھیل جاتی تو شیطان مجھے بہکانے لگتا۔ اور کہتا۔ ''ابے تو نوکر نہیں ہے۔ وہ مالک کی بیٹی نہیں ہے۔ تو بھی جوان ہے وہ بھی جوان ہے۔

ایسے تو بانو تحصیلدار کی اکلوتی بیٹی تھی اور بڑی چہیتی اور اس کے لیے دنیا کا ہر عیش و آرام موجود تھا۔ پر تحصیلدار صاحب کی دوسری بیوی خانم جو تھی۔ یہ تو بڑی ظالم تھی۔ سوتیلی بیٹی کو ایک گھڑی خوش دیکھنا اس کے لیے مشکل تھا۔ پر تھی بڑی چالاک۔ جب تحصیلدار صاحب گھر میں رہتے ان کو دکھانے کے لیے بانو سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی۔ پر جیسے ہی وہ کچہری جانے کے لیے نکلے اور اس نے چولا بدلا۔ بات بات پر غریب بانجو پر ڈانٹ پڑتی۔ پٹتی بھی بے چاری ایک دن سویرے خانم نے اپنے گود کے بچے کے گوں اور موت میں سنے ہوئے غالیچے پوتڑے دھونے کے لیے بانو کو کہا۔ وہ بچاری اسکول کا کام کر رہی تھی اس میں ذرا دیر ہوگئی۔ خانم گودام میں سے کھانا پکانے والی کو آٹا تول کر دے کر جب باہر نکلی تو دیکھا غالیچے ویسے ہی پڑے ہیں۔ بس آگ ہی تو لگ گئی۔ بانوں کے ہاتھ سے اسکول کی کاپی چھین کر پرزے پرزے کر دی۔ اور لڑکی کو چوٹی پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں لے گئی۔ اور وہیں چھپر کھٹ کا پایا اٹھا کر، اس کے ہاتھوں کو نیچے دبا کر خود چھپر کھٹ پر چڑھ بیٹھی۔ اور کہتی رہی تو جب تک معافی نہیں مانگے گی۔ ناک نہیں رگڑے گی، میں تجھے نہیں چھوڑوں گی۔ پر بانو بھی ہٹ کی بڑی پکی تھی۔ دانت بھینچے رہی! نہ روئی نہ کسی کی معافی مانگی۔

جب خانم کا بچہ رویا تو وہ خود ہی اٹھی۔ میں برآمدے کی چک میں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اور بس نہیں چلتا تھا کہ جا کر خانم کو جان سے مار دوں۔ جب اس کمبخت کو کمرے کے باہر جاتے دیکھا تو جان میں جان آئی۔ پر اب بانو کے ہاتھوں میں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ خود پائے اٹھائے سکے۔ یہ دیکھ کر خانم سے ڈرتا ورتا کمرے میں آ گیا۔ اور جلدی سے پلنگ کا پایہ اٹھایا اس وقت بانو کی آنکھوں کا حال کیا بیان کروں سرکار! ایسی لگتی تھیں جیسے کوئی گھائل ہرنی جیسے کسی نے کسائی کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچا لیا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے اب ان آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ پھر تو میں کیا دیکھتا ہوں۔ کہ وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر سسکیاں بھر رہی ہے۔ آپ ہی بتائیے ایسے موقعہ پر کوئی کرے بھی تو کیا کرے؟ میرا تو سانس اوپر کا اوپر، نیچے کا نیچے رہ گیا۔''

چھوٹی بی کیا کر رہی ہو؟ خانم دیکھ لے گی تو میری کھال ادھیڑ دے گی میں نے آہستہ سے کہا اور پھر جیسے ہی دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی نے ساڑھے نو کا گھنٹہ بجایا۔ میں نے کہا۔ اسکول جانے کا وقت ہوگیا'' اور اسکول کا نام سن کر بانوں کی سسکیاں تھم گئیں۔ اور میرے گیلے مونڈھے سے سر اٹھا کر اس نے کہا۔'' چل ممدو میری کتابیں اٹھا۔ آج تو میرے ہاتھ میں قلم پکڑنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔''

اس دن بانو اسکول جانے کے لیے گھر سے باہر نکلی تو میں نے دیکھا کہ برقعے کے اندر اس نے ایک پوٹلی سی چھپا کر بغل میں داب رکھی ہے۔ اسکول کے راستے میں بانو نے ہمیشہ کی طرح نقاب الٹ دی۔ راستہ پگڈنڈی پگڈنڈی کھیتوں میں سے جاتا تھا۔ ادھر ادھر دیکھ کر وہ بولی..... ممدو یوں تو میں مر جاؤں گی۔''

میں نے کہا۔'' ہاں چھوٹی بی بی۔ یہ ظالم بڑی ظالم ہے۔''

''پھر؟'' یہ کہہ کر اس نے میری طرف یوں نظر بھر کر دیکھا۔ کہ چہرا گھبراہٹ سے لال ہوگیا۔

''تحصیلدار صاحب سے کیوں نہیں شکایت کرتیں؟ تمہارے باپ ہیں آخر۔''

''ابا سے شکایت کی تو یہ ڈائن مجھے جان ہی سے مار دے گی اور پھر ابا میری بات کیوں ماننے لگے؟ تم نے دیکھا نہیں۔ ان کے سامنے چکنی چپڑی باتیں کرتی ہے۔''

''پھر؟'' اس بارے میں میں نے یہ سوال کیا۔

وہ بولی..... میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔'' چل ممدو کہیں بھاگ چلیں میرے پاس تھوڑا سا زیور گہنا ہے۔ تیس، چالیس روپے بھی میں نے بچا کر رکھ چھوڑے ہیں۔''

امیر چھوکریاں اپنے نوکروں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں۔ ایسے قصے میں نے سنے ضرور تھے۔ مگر سمجھتا تھا کہ یہ باتیں قصے کہانیاں میں ہوا کرتی ہیں۔ اب بانو کی زبان سے سن کر میرا یہ حال ہوا، سرکار، کہ کاٹو تو لہو نہیں

بدن میں۔ سر سے پیر تک تھرتھر کانپنے لگا۔ کوئی جواب ہی نہ بن پڑا۔ ایسا لگا جیسے دل کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوں ایک دل کہتا تھا۔ ابے ممدو۔ تیری قسمت جاگ گئی ہے۔ ایسا موقعہ پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ ذرا لونڈیا کا جوبن تو دیکھ۔ اور جولاہوں کی کالی کلوٹی لڑکیوں کا مقابلہ تو کر جن سے تیری ماں قسمت پھوڑنے والی ہے اور پھر وہ خود کہہ رہی ہے کہ زیور گہنے بھی ہیں۔ اب عیش کرے گا عیش!''

پر سرکار مادوسرے دل نے کہا۔'' اپنی اوقات مت بھول۔ تو ممدو ہے۔ بندو جولاہے کا لونڈا۔ تحصیلدار صاحب کا نوکر ایسی ویسی کوئی بات کرے گا، تو اتنے جوتے پڑیں گے کہ سر پر بال نہ رہے گا۔''

وہ تو خیر ہوئی، سرکار کہ اتنے میں سامنے سے اسکول کا کوئی ماسٹر آتا ہوا نظر آ گیا۔ اور بانو نے جھٹ سے نقاب گرا دی۔ پھر آہستہ سے مجھ سے بولی۔ چھٹی چار بجے ہوگی۔ پر تو ٹانگا تین ہی بجے لے کر آ جائیو۔ ساڑھے تین بجے کلکتہ میل جاتی ہے بس آج میں گھر واپس نہ جاؤں گی۔''

ماسٹر پاس سے گزر گیا۔ تو میں نے چپکے سے کہا۔'' بی بی، ایسی باتیں مت کرو۔ تحصیلدار صاحب کو پتا چلے گا، تو میری کھال کھینچ دیں گے۔''

وہ بولی۔'' مار دے تو مرد ہو کر ڈرتا ہے؟'' اور برقعے میں سے سسکی کی آواز آئی۔'' ممدو اگر تو تانگا تین بجے نہ لے کر آیا تو میرا خون تیری گردن پر ہوگا۔''

بس یہ کہا۔ اور وہ تو جھپ سے اسکول کے اندر چلی گئی۔ اور میں وہیں دروازے کے سامنے کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ ایسا لگا جیسے مجھ پر بجلی گری ہو۔ آپ ہی بتایئے سرکار کرتا تو کیا کرتا؟ ایک طرف تو تحصیلدار کے ہنٹر کا ڈر۔ دوسری طرف بانو کی جان کا سوال۔ نہ جانے کتنی دیر تو میں وہیں سکول کے دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر وہاں سے واپس ہوا۔ تو میں سیدھی پگڈنڈی سے بھٹک کر کتنی ہی دیر تک کھیتوں میں بھٹکتا رہا۔ جب میں واپس پہنچا تو بارہ بج رہے تھے۔ اور خانم غصے میں آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ ابھی میں نے دروازے میں قدم رکھنا شروع کیا تھا کہ گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔'' کہاں تھا تو اب تک حرامزادے؟ گھر کا سارا کام یونہی پڑا ہے اور تو یونہی واہی تباہی پھر رہا ہے۔ کیوں رے۔ جواب کیوں نہیں دیتا۔ آخر تو تھا کہاں؟''

اور جب میری زبان سے ایک لفظ نہ نکلا تو آنکھوں سے آگ برساتی ہوئی میری طرف بڑھی۔

''ارے بولتا کیوں نہیں؟ گونگا ہو گیا ہے کیا؟ یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر جھنجوڑا۔ پر جیسے ہی اس نے میرا ہاتھ چھوا، اس کی چیخ نکل گئی۔'' ارے تجھے تو تیز بخار ہوا ہے۔ ملیریا، کہیں پلیگ تو نہیں ہے؟ گھر میں آج ہی ایک مرا ہوا چوہا نکلا ہے۔'' اور یہ کہہ کر اس نے میری طرف ایسا دیکھا جیسے میں ہی مرا ہوا چوہا تھا۔ اور فوراً جا کر کاربولک سے ہاتھ دھونے لگی۔ تو..... سرکار، خدا جو کچھ بھی کرتا ہے بندے کی بھلائی کے لیے ہی کرتا ہے۔ مجھے پلیگ تو نہیں ہوا۔ پر ملیریا بخار جو اس دن چڑھا تو اس نے ایک مہینہ تک نہ چھوڑا۔ میں ادھ موا تو ہو گیا، مگر تحصیلدار کے ہنٹروں سے میری چمڑی بچ گئی۔ خانم نے تو اسی وقت چپراسی کے ساتھ گھر بھجوا دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ بس، اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے ایسے نوکر نہیں چاہئیں جو روز بیمار ہوتے ہوں۔ گھر پہنچتے پہنچتے مجھے تو سرسام کا دورہ پڑ گیا۔ اور وہ سردی چڑھی کہ ماں نے گھر باہر کی رضائیاں اور گدڑے میرے اوپر ڈال دیے۔ پھر بھی کپکپی نہ گئی۔ پر اس بخار کی حالت میں بھی سرکار، بانو کا خیال میرے دل سے نہ نکلا۔ اور بے ہوشی میں بھی بار بار یہی چلاتا رہا۔'' چھوٹی بی بی تم گھبرانا مت۔ میں پورے تین بجے تانگا لے آؤں گا۔'' یہاں تک کہ میرے باپ نے جھنجوڑ کر اٹھا دیا۔'' ابے، کیا تانگہ بڑبڑا رہا ہے؟ کہیں گرمی تو دماغ کو تو نہیں چڑھ گئی؟'' مہینہ بھر کے بعد چلنے پھرنے کے لائق ہوا تو سنا کہ تحصیلدار قدرت خاں کی بدلی سہارن پور ہو گئی۔

ان کی جگہ کوئی اور تحصیلدار آیا ہے۔ پھر یہ بھی سننے میں آیا کہ خان صاحب کی ترقی ہو گئی۔ اب وہ ڈپٹی کلکٹر بنا دیے گئے ہیں۔ ڈپٹی کلکٹر تو بڑا حکم ہوتا ہے۔ سرکار سے تنخواہ بھی کافی ملتی ہے۔ جبھی تو خان

صاحب نے سہارن پور جاتے ہی موٹر لے لی اور ڈرائیور رکھ لیا؟ اب آپ پوچھیں گے کہ تمہیں کیسے پتا چلا کہ انہوں نے موٹر لے لی۔ اور ڈرائیور رکھ لیا؟ تو بات یہ ہے سرکار۔ اچھا ہونے کے دو چار مہینہ بعد میں لالہ گردھاری مل آڑھتی کی غلہ کی دوکان پر اناج کی بوریاں ڈھونے پر نوکر ہو گیا۔ ایک دن میں نے کیا دیکھا کہ سہارانپور سے کوئی زمیندار اٹھا کر نواب علی ملنے آئے تو کہنے لگے۔ ''لالہ سنا تم نے تمہارے یہاں جو تحصیلدار قدرت خان تھے نا۔''

یہ نام سن کر میرے تو کان کھڑے ہو گئے۔ اور بوریوں کے پیچھے سے دھیان دے کر سننے لگا۔ لالہ بولے۔ ''ہاں ہاں، وہ تو اب تمہارے یہاں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے۔ اب تو سنا ہے بڑے ٹھاٹھ ہیں۔ موٹر بھی رکھ لی ہے۔''

ٹھاکر نواب علی۔ ''ارے لالہ، یہ موٹر ہی کی برکت ہے۔ موٹر کی اور نئی تعلیم کی۔'' یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی لالہ بھی بولے۔ ''ٹھاکر صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟''

ٹھاکر صاحب نے کہا۔ لالہ یہ کہہ رہا ہوں کہ خان صاحب قدرت اللہ خاں کی لونڈیا ان کے ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔ میں نے اپنے دل کو لاکھ سمجھایا کہ اب تجھے تو خوش ہونا چاہیے۔ کہ خان صاحب کے ہنٹر اس سالے ڈرائیور کی پیٹھ پر پڑیں گے تو تو صاف بچ گیا۔ مگر جھوٹ کیوں بولوں سرکار، سچی بات یہ ہے۔ کہ دن بھر مجھ سے ٹھیک کام نہ ہو سکا۔ اور اس رات جب ماں نے روز کی طرح پھر بندھی جولاہی سے میرے بیاہ کی بات چھیڑی تو میں نے بھی کہہ دیا۔ ''اچھا ماں جیسی تیری مرضی۔'' صبر عجب چیز ہے۔ سرکار انسان کو اپنی قسمت پر صبر شکر کرنا چاہیے تو پھر یہی فٹ پاتھ کے پتھر بھی مخمل کے گدا..... بن جاتے ہیں۔

رات کے اندھیرے میں بندی شیدی جولاہی بھی بانو جیسی حسین دکھائی دیتی ہے سال بھی نہیں ہوا تھا۔ کہ شیدی نے ایک بچہ جن دیا۔ اگلے برس ایک بچی۔ پھر تو سرکار نمبر لگ گیا۔ چھ برس میں پورے پانچ بچے۔ تین لڑکیاں دو لونڈے۔ پر خدا کی مرضی میں کس کو چارا ہے؟ اولاد بھی اس کی دین ہے۔ جب چاہے واپس لے لے ایک بچہ تو پیدا ہوتے ہی مر گیا۔ ایک لونڈیا دو برس کی ہو کر نمونیہ سے ہلاک ہو گئی۔ اب لونڈا اور دو لونڈیاں رہ گئیں۔ پر اپنے سے اتنی اولاد کو پالنا بھی مشکل تھا۔ گھر کا سارا بوجھ، اب مجھ پر ہی تھا۔ بابا کی کمر تو کھاٹ پر لگ گئی تھی۔ اور ماں کو آنکھوں سے سجھائی دینا بہت کم ہو گیا تھا۔ بچاری دن میں ٹامک ٹوئیاں مارتی تھی۔ میرا بڑا بھائی ایک سال پہلے بمبئی جو گیا، تو پھر لوٹا نہیں تھا۔ نہ کوئی خط ہی بھیجا نہ روپیہ۔ پہلے سنا تھا۔ کسی کپڑے کے کارخانے میں کام کرتا ہے۔ پھر سنا کسی فلم کمپنی میں چوکیدار ہے۔ بڑی بڑی خوب صورت ایکٹریسوں کی موٹروں کے دروازے کھولتا ہے۔ میرا بھی کئی بار جی چاہتا کہ بھائی کے پاس چلا جاؤں۔ ذرا بمبئی کلکتہ کی سیر کروں۔ مگر گھر والوں کو کس پر چھوڑوں؟ اور پھر ریل کا کرایہ کہاں سے لاؤں۔ اسی سوچ بچار میں کئی برس گزر گئے۔ اور ہم مظفر نگر ہی میں محنت مزدوری پر صبر کرتے رہے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اپنا بھی کلکتہ جانے کا ایک موقعہ نکل آیا۔ ہوا یہ کہ اپنے محلے میں ایک ننھے نان بائی تھا۔ اس کا لونڈا رحمت ایک برس سے دلی میں کام ڈھونڈھنے گیا ہوا تھا۔ وہ جو واپس آیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ بالکل جنٹلمین بنا ہوا ہے۔ چاپانی سلک کی قمیض گلے میں سونے کے بٹن۔ بال انگریزی فیشن کے بنے ہوئے۔ میرے بچپن کا یار تھا۔ میں نے کہا۔ کیوں بے رحمت کہاں سے گنا خزانہ مل گیا؟''

بولا۔ ''ہم تو پانی سے سونا بناتے ہیں۔'' میں سمجھا سالے کو کیمیا بنانے کا نسخہ ہاتھ آ گیا ہے پر اس نے بتایا کہ اس نے ریل میں سوڈا لیمن بیچنے کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔ اسی لیے دو ڈھائی سو روپیہ مہینہ کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ کہنے لگا ''تیس روپیہ مہینہ تو میں اپنے نوکروں کو دیتا ہوں جو ہر اسٹیشن پر سوڈا لیمن کی آواز لگاتا ہے۔ اور سارے کلکتہ بمبئی کی سیر مفت کرتے ہیں۔ وہ الگ۔ یہ سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے کہا ''بھیا رحمت ایک بار کلکتہ مجھے بھی

دکھادے۔‘‘

سو سرکار، سوڈالیمن بیچتے بیچتے میں بھی کلکتہ پہنچ ہی گیا۔ میں نے تو پہلے دلی بھی نہیں دیکھا تھا۔ کلکتہ دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اتنی چوڑی صاف سڑکیں۔ یہ موٹریں، بس، ٹرامیں، میں نے پہلے کہاں دیکھی تھیں۔ میں نے سوچا رحمت کے سوڈالیمن پر لعنت بھیجو اور یہیں رہ پڑھو۔ وہ دن اور آج کا دن پندرہ برس ہو گئے آج تک کلکتہ سے باہر قدم نہیں دھرا۔

پہلے تو کئی مہینہ رکشا چلاتا رہا۔ دن میں کبھی کبھی دو ڈھائی روپیہ بھی مل جاتے تھے، میں نے سوچا یہ کام تو بہت اچھا ہے۔ مہینے میں ساٹھ ستر روپیہ مل جاتے ہیں۔ مزدوروں کے محلے میں ایک کوٹھری لے لی تھی۔ دس روپیہ اس کا کرایہ دیتا تھا۔ کبھی کبھی دس پندرہ بیوی کو بھی بھیج دیتا تھا۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ دوسرے سال کے بعد میں نے کچھ نہیں بھیجا۔ یہ بھی پتا نہیں کہ اس پر کیا گزری۔ جوان آدمی تھا سرکار اور پھر کلکتہ میں روپیہ دو روپیہ میں سونا گاچی میں نئی بیوی مل جاتی ہے۔ تو پھر ہزار میل دور بھینگی بدصورت بیوی کو روپیہ بھیجنا تو بڑا مشکل ہوتا ہے! اور پھر دارو پینے کی بھی عادت پڑ گئی تھی۔ سرکار آپ کہیں گے کہ یہ آدمی بڑا آوارہ بدمعاش ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ دن بھر گدھے کی طرح رکشا کھینچنے کے بعد شام کو غم غلط کرنے کے لیے تھوڑی سی دارو ضرور چاہیے۔ اور پھر دارو کے بعد جانے کیسے پھر آپ ہی آپ سونا گاچی کی طرف چل پڑتے ہیں۔

ہاں تو سال بھر رکشا چلائی کوئی سوسوا سو روپے آڑے وقت کے لیے جمع بھی کر لیے پر یہ پتا نہ تھا کہ آڑا وقت اتنی جلدی آ پہنچے گا۔ برسات کے دنوں بھیگ کر بخار چڑھا۔ بخار سے نمونیہ ہو گیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ رکشا کھینچتے کھینچتے پھیپھڑے کمزور ہو گئے ہیں۔ یہ کام چھوڑ دو۔ پورے ڈیڑھ مہینے کھاٹ پر پڑا رہا۔ جب بخار نے پیچھا چھوڑا تو بدن میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ رکشا چلا سکوں۔ جمع جتھا جو کچھ تھا وہ سب ختم ہو چکا تھا۔ پھر بھی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ نمونیہ سے مر نہیں۔ سوچا زندہ تو ہوں۔ لعنت بھیجو رکشا پر۔ چلو اور کوئی کام کریں گے۔

کلکتہ میں جہاں خدا تیس لاکھ کو روزی دیتا ہے کہ مجھے ہی نہ دے گا؟ اللہ پر بھروسا کیے بیٹھا رہا۔

میری برابر والی کوٹھری میں اپنی ہی طرح کئی مزدور رہتے تھے۔ ایک تو ہرنام تھا۔ بلند شہر کا، باپ نے ساری جائداد شراب پی پی کر اڑا دی تھی۔ بیٹے کو پڑھایا، لکھایا نہیں سو وہ اب کارخانے میں مزدوری کرتا پھرتا تھا۔ ایک بنارس کا چمار تھا، منگو ایک پیلی بھیت کا مسلمان تھا۔ رحمت خاں اور مزا یہ کہ تینوں میں گہری دوستی تھی۔ اور تینوں ایک ہی ساتھ رہتے تھے۔ میں نے ایک بار اکیلے میں رحمت خاں سے کہا بھی کہ تم ان کافروں کی ساتھ رہتے ہو۔ ایمان دھرم کا بھی کچھ خیال نہیں؟ وہ گالی دے کر بولا۔ ارے ایمان دھرم کی ایسی تیسی ہمارا دھرم تو مزدوری ہی مزدوری ہے۔‘‘

ان تینوں نے مجھ سے کہا۔ چل مجھے اپنے کارخانے میں نوکری دلائے دیتے ہیں۔ دو روپے روز ملیں گے۔‘‘ میں نے سوچا چلو اچھا ہے۔ رکشا کھینچ کھینچ کر پھیپھڑے کھوکھلے کرنے سے تو کارخانے کی مزدوری ہی اچھی ہے۔ اگلے دن وہ مجھے اپنے ساتھ کارخانے میں لے گئے۔ جہاں پٹ سن کی بنائی ہوتی تھی۔ اور مزدوروں کے ٹھیکیدار کو جسے سب سردار سردار کہتے تھے۔ میری طرف سے پانچ روپے رشوت بھی دے دیے۔ پر مجھے نوکری بھی نہ ملی۔ ویونگ ماسٹر بولا۔ کام آج کل مندا ہے، اس لیے ہم تو پہلے سے بہت سے مزدوروں کو چھٹی دینے کی سوچ رہے ہیں۔ نیا آدمی کہاں سے رکھ سکتے ہیں؟ اور میری جانب اشارہ کر کے بولا۔ پھر اسے ہمارے جیسے کام کا کوئی تجربہ بھی تو نہیں ہے۔ کتنے ہی دن تو اسے سیکھنے میں لگ جائیں گے۔‘‘

میں واپس آ گیا۔ اور پھر رکشا والے مالک کے پاس جانے کی سوچنے لگا۔ پر خدا کا کرنا کیا ہوا۔ اسی دن اس کارخانے میں ہڑتال ہو گئی۔ ہوا یہ کہ مالکوں نے کہا۔ بازار میں مندی ہونے کی وجہ سے ہمیں یا تو بہت سے مزدوروں کو چھٹی دینی پڑے گی یا ان کی تنخواہ کم کرنی پڑے گی۔ اس لیے ہم نے دو روپے سے گھٹا کر ڈیڑھ روپے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مزدوروں

نے جب یہ سنا تو ان میں کھلبلی مچ گئی۔ ہڑتال کی تیاری ہونے لگی۔ میں نے رحمت خان اور منگو دونوں کو ہڑتال کی باتیں کرتے سنا تو بولا تم لوگ پاگل ہو گئے ہو؟ آٹھ آنے کے لالچ میں ڈیڑھ روپے کی آمدنی میں لات مار رہے ہو؟ ارے بھائی جو ملتا ہے۔ اسی پر صبر کرو۔ خدا کی مرضی ہو گی تو مزدوری بڑھ جائے گی مگر ان دونوں پر تو ہڑتال کا بھوت سوار تھا۔ رحمت خاں بولا۔ ''اس وقت ہم نے چپ چاپ بگار کٹوالی۔ تو یہ مالک کل ہمارے سینے پر سوار ہو جائیں گے۔ سینے پر!'' منگو ایک موٹی سی گالی دے کر بولا۔ اگر بازار میں مندی ہو رہی ہے تو یہ سالا مالک پانچ موٹروں میں سے دو ایک بیچ کیوں نہیں ڈالتا۔ سالے نے تین تین تو عورتیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جن میں سے ایک ولایتی میم بھی ہے۔''

''ہاں تو جب یونین والوں نے ہڑتال کا اعلان کیا تو ان دونوں نے تو کام پر جانا بند کر دیا۔ مگر ہرنام سویرے اٹھ کر چپ چاپ کام پہ چلا گیا۔ بستی میں خبر فوراً پھیل گئی کہ ہرنام کام پر گیا ہے۔ اور بھی پچاس ساٹھ مزدور ایسے تھے جو ہڑتال میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ مگر رحمت اور منگو کو ہرنام کے جانے پر بڑا افسوس ہوا۔ رحمت تو کہنے لگا۔ ''نہیں نہیں ایسے ہی گھومنے گیا ہو گا۔ مگر شام کو جب ہرنام لوٹا تو اس کے کپڑوں پر لگے کالک کے دھبوں سے صاف ظاہر تھا۔ کہ وہ کام کر کے آ رہا ہے۔ منگو تو لگا ماں بہن کی گالیاں دینے۔ مگر رحمت نے دھیرے سے پوچھا۔'' کیوں ہرنام یہ سچ ہے؟'' یہ سن کر ہرنام چلا کر بولا۔ ''ہاں ہاں گیا تھا۔ کام پر! کر لے جس کا جو جی چاہے۔''

رحمت اب بھی دھیرے ہی سے بولا۔ اچھا یہ بات ہے؟ پھر وہ اٹھ کر کوٹھری میں گیا اور وہاں سے لوٹا تو اس کے ہاتھوں میں ہرنام کا بستر اٹین کا ٹرنک اور دوسرا سامان تھا۔ بڑی خاموشی سے اس نے وہ سب چیزیں برآمدے کے باہر میدان میں پھینک دیں اور ایک لفظ نہ بولا۔ چپ چاپ جا کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اور حقہ گڑگڑانے لگا۔ ہرنام کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ باہیں چڑھا کر رحمت کی طرف لپکا مگر منگو بیچ میں آ گیا۔ کالا کلوٹا منگو تھا تو دبلا پتلا سا۔ مگر اس کے ہاتھوں میں بڑی طاقت تھی اور بڑا پھرتیلا بھی تھا۔ ہرنام کو روک کر اسے ایک لنگری جودی تو چاروں خانے چت زمین پر آ رہا۔ اتنے میں بستی بھر کے مزدور وہاں جمع ہو گئے۔ ہرنام سے سبھی جلے ہوئے تھے۔ اسے گرتا دیکھ کر سبھی کھلکھلا کر ہنس پڑے اب جو وہ اپنا گھٹنا سہلاتا ہوا اٹھا، تو دیکھا کہ چاروں طرف سے وہ گھرا ہوا ہے۔ اگر وہ رحمت اور منگو پر ایک بار بھی وار کرتا ہے۔ تو سارے کے سارے اس پر جھپٹ پڑیں گے۔ اس لیے اس بے چارے نے اپنی چیزیں اکٹھی کر کے میری کوٹھری کے سامنے برآمدے میں رکھ دیں۔ پھر میرے پاس آ کر بولا۔ کیوں ممدو تیرے یہاں آ جاؤں؟ کوٹھری کا سارا کرایہ آج سے میں دیدیا کروں گا۔

سرکار، اندھے کو کیا چاہیے۔ دو آنکھیں۔ میں ٹھہرا بیکار۔ مجھے تو پہلے ہی فکر تھی کہ ہر مہینے کرایہ کیسے دوں گا۔ سو میں نے کہا۔ تو بے کھٹکے یہاں آ جا، ہرنام۔ میں نہیں ڈرتا کسی سے۔'' وہ جو کہتے ہیں کر بھلا تو ہو گا بھلا، سو وہی ہوا۔ میں نے ہرنام کو رہنے کے لیے کوٹھری میں جگہ دے دی۔ اور اس نے اگلے ہی دن مجھے کارخانے میں نوکر رکھ دیا۔

ہڑتال کی وجہ سے مالک ہر کسی کو نوکر رکھنے کے لیے تیار تھے۔ چاہے اسے کام آتا ہو یا نہیں۔ بس دو ہاتھ دو ٹانگیں ہونی چاہئیں۔ سو میں بھی ڈیڑھ روپے روز پر نوکر رکھ لیا گیا۔ اوپر سے روپیہ روز ''اسٹرائک الاؤنس'' ملتا تھا اور ملنا بھی چاہیے تھا۔ ہم پچاس ساٹھ آدمی جان پر کھیل کر کارخانہ چلا رہے تھے۔ روز ہمیں گالیاں اور دھمکیاں سننی پڑتی تھیں۔ بستی کے دوسرے مزدوروں نے ہمارا حقہ پانی بند کر دیا تھا۔ دو ایک بار اینٹ پتھر بھی ہم پر پھینکے گئے۔'' پر میں نے کہا۔ ''جو بھی ہو ہڑتال کر کے بھوکا مرنے سے بہتر ہو گا۔''

ہاں، تو میں کارخانے میں ہونے کو تو ہو گیا۔ مگر مجھے کام آتا ہی نہ تھا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ ہرنام

نے ''ویونگ ماسٹر'' سے جھوٹ کہہ دیا تھا۔ کہ میں نے اسے کام سکھا دیا ہے۔ اب یہ ایک مشین سنبھال سکتا ہے۔ کارخانے والوں کو ان دنوں اس بات کی بڑی فکر تھی۔ کہ زیادہ سے زیادہ مشینوں کو کسی نہ کسی طرح چالو رکھیں تاکہ اخباروں میں یہ اعلان کرسکیں کہ ہڑتال فیل ہوگئی۔ اور کارخانے میں کام ویسے کا ویسا ہی ہو رہا ہے۔ ہرنام نے مجھ سے کہہ رکھا تھا۔ کہ کچھ بھی ہو تو یہی ظاہر کیجیو کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ ویسے میری مشین اس کے پاس ہی تھی۔ میں برابر اس کو دیکھتا رہتا اور جو وہ کرتا وہی میں کرنے لگتا۔ اس نے بٹن دبایا میں نے بھی دبا دیا۔ اس نے تیل کی کمپنی لے کر پرزے میں تیل دیا۔ میں نے بھی یہی کیا، اس نے مشین تیز کی میں نے بھی کی تین دن تو میں نے ایسے ہی گزار دیے۔ پگار تو ہفتہ کے ہفتہ ملنے والی تھی۔ مگر اسٹرائک الاؤنس، کا روپیہ روز کے روز مل جاتا تھا۔ میں نے سوچا اپنی بلا سے اسٹرائک عمر بھر چلے۔

اتنے میں مجھے مشین کے کام کا تھوڑا بہت اندازہ بھی ہو گیا تھا۔ کوئی خاص مشکل کام نہیں تھا۔ کام تو سارا مشین کرتی تھی۔ ہمیں تو صرف بٹن دبا کر مشین چالو کرنا اور اس کی دیکھ بھال کرنی ہوتی تھی۔ چوتھے روز ہرنام کی مشین کا پرزہ بگڑ گیا اور اسے کہیں دور ہی مشین پر لگا دیا گیا۔ ''کیوں مدد سنبھال لے گا نا؟ میں نے کہا۔ ''تو فکر نہ کر اس میں کون سے ہاتھی گھوڑے لگے ہیں۔ پھر بھی وہ جاتے جاتے لوٹ کر آیا اور کہنے لگا۔ ''ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر کیجیو۔''

ہاں تو وہ دوسری مشین پر چلا گیا۔ اور اب اس کی مشین اور کتنی مشینوں کی طرح بیکار کھڑی تھی۔ مگر میری مشین کھٹا کھٹ کام کر رہی تھی۔ کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ، مشین چل رہی تھی۔ اور میں خدا کی قدرت پر عش عش کر رہا تھا۔ کہ واہ واہ! ان ولائیت والوں کو کیا عقل دی ہے۔ انسانوں کا کام مشینوں سے لیتے ہیں۔ جب ہم کمبل بنتے تھے تو میرا باپ اون کو دھو دھن کر اس میں سے میل نکالتا تھا۔ پھر میری ماں چرخے پر اون کاتتی تھی۔ پھر ہم سب بھائی تانا تیار کرتے تھے۔ پھر کر گھے سے میرا باپ کمبل بنتا تھا۔ اور اس طرح ہم سب کی کئی دن کی محنت کے بعد نوگز کمبل تیار ہوتا تھا۔ تانا بانا ہو رہا تھا۔ لپٹا جا رہا تھا اور کتنی تیزی کے ساتھ! میرا باپ اور ماں اور سب بھائی اور پڑوسی، بلکہ مظفر نگر کے سارے جولاہے مل کر ایک مہینے میں اتنا کپڑا نہیں بن سکتے تھے۔ جتنا یہ مشین ایک گھنٹے میں بن رہی تھی۔ واہ واسبحان تیری قدرت اب اس کپڑے کی بوریاں بنیں گی۔ ان بوریوں میں دھان اور گیہوں اور دالیں اور مرچ نمک بھر کر دوسرے ملکوں کو بھیجا جائے گا۔

کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ، مشین چلی جا رہی تھی۔ میں نے بجلی کی فرکی دبا کر گھما کر مشین کی رفتار اور تیز کر دی۔ اس تیز رفتاری میں مجھے مزا آ رہا تھا۔ کپڑا اب اور تیزی سے بنا جا رہا تھا اور اسی تیزی سے میرا دماغ کام کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا۔ یہ سن کس دیس کی سیر کرے گا؟ کتنا اچھا ہوتا کہ اس کپڑے میں لپٹ کر میں بھی کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ، مشین کے گیت میں مجھے ایک بے سری سی آواز سنائی دی سامنے دیکھا تو ایک جگہ سے تانے کا تار ٹوٹ گیا تھا۔ دھاگے کی ٹلی ادھر سے ادھر بیکار گھوم رہی تھی۔ مگر بنائی نہیں ہو رہی تھی۔ ہمارے کرگھے پر جب بھی اون کا دھاگا ٹوٹ جایا کرتا تھا۔ تو میرا باپ دوسرے کے ساتھ ملا کر ایک ایک مروڑی دے دیتا تھا بس وہ پھر جڑ جاتے اور تانے بانے کا سلسلہ پھر جاری ہو جاتا ایک دم میرے دماغ میں بھی یہی آیا۔ کہ مدد، تو بھی یہی کر اور یہ ذرا بھی نہ سوچا کہ یہ بجلی سے چلنے والی مشین ہے۔ بندو جولاہے کا کرگھا نہیں ہے۔

بنا مشین بند کیے میں نے ہاتھ بڑھا کر ٹوٹے ہوئے سرے پکڑنے چاہے۔ مگر میری باہیں چھوٹی تھیں۔ اور مشین لمبی تھی۔ ایڑیاں اٹھا کر مجھے کافی آگے کو جھکنا پڑا کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ مشین چلی جا رہی تھی۔ جیسے ہی دھاگا کا ٹوٹا ہوا سرا میرے ہاتھ میں آیا۔ میرے پاؤں زمین سے اٹھ گئے اور میں منہ کے بل مشین کے تنے ہوئے کپڑے پر آ رہا۔ کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ مشین چل رہی تھی اور اس کے ساتھ مجھے اندر گھسیٹ رہی تھی۔ کپڑا لوہے کے رولر پر لپٹا جا رہا تھا۔ اور میں مشین کے

فولادی جبڑے کی طرف کھنچا جارہا تھا۔ اس وقت تو سرکار مجھے اپنی موت سامنے کھڑی نظر آ گئی مرتا کیا نہ کرتا ہاتھ پاؤں مارے، مگر کپڑے کے جھول میں اتنا الجھ گیا تھا کہ کسی طرح نکلنے کی صورت نہ نکلی۔ اور ایک بار جو میں نے ٹانگوں کو روز سے جھٹکا دیا تو بایاں پاؤں اس کمبخت مشین کے نہ جانے کس پرزے پر پھنس گیا۔ اب میں لاکھ چھڑانا چاہتا ہوں۔ مگر پاؤں نہیں نکلتا۔ بلکہ میں گھسٹتا چلا جارہا ہوں۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور کتنے ہی مزدور میری طرف دوڑے۔ ویونگ ماسٹر کی آواز سنائی دی۔ ''بجلی بند کرو! بجلی بند کرو!'' مگر ابھی کوئی بٹن نہ دبا پایا تھا کہ کھٹاکھٹ سے آواز آئی اور مجھے ایسا محسوس ہوا۔ کہ کسی بھیانک ہاتھ نے میری ٹانگ کے دو ٹکڑے کر دیے ہیں اور پھر میری آنکھوں میں دنیا اندھیر ہوگئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک مفت ہسپتال میں پڑا تھا۔ اور میری داہنی ٹانگ کٹ چکی تھی۔ یہ دیکھ کر پہلے تو مجھے دکھ ہوا۔ مگر پھر میں نے سوچا۔ خدا کا شکر ہے ٹانگ ہی گئی جان تو بچ گئی اور اگر دونوں ٹانگیں چلی جاتیں، تو کیا ہوسکتا تھا۔ آج میں بھی اسے نجے رولدو کی طرح باہوں اور کولھوں کے سہارے گھسٹ گھسٹ کر چلتا۔

ہاں تو، سرکار پندرہ دن کے بعد جب میں اس ہسپتال سے نکلا تو میں کنگلا ہو چکا تھا۔ میری جیب میں صرف سات روپے تھے۔ چھ روپے تو ہرنام نے چار دن کی مزدوری کے لے کر دے دیے تھے۔ اور ایک روپیہ میرے پاس پہلے کا بچا ہوا تھا۔ ہرنام نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے ویونگ ماسٹر سے بات چیت کی تھی کہ کارخانے کی طرف سے میری کچھ مدد کی جائے۔ مگر اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا تھا کہ اناڑی مزدور اگر اپنی بھول سے اپنی ٹانگ اور ہماری مشین توڑ ڈالے، تو ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مل مالکوں کی طرف سے ہرجانہ ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ خیر میں نے دل کو سمجھایا کہ ممدو خدا تیرے صبر کا امتحان لے رہا ہے۔ گھبرا مت۔ جب میں بستی آیا اور گاڑی سے اتر کر دیوار کا سہارا لیتا ہوا اپنی کوٹھری تک پہنچا تو رحمت، منگو اور بہت سے مزدور مجھے دیکھنے آئے۔ تھوڑی دیر تو سب چپ چاپ کھڑے میری ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھتے رہے؟ اور ان کو اس طرح سے گھورتے دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے غصہ کا پارا ایک دم تیز ہو گیا اور میں چلایا۔

''یہاں کھڑے۔ کھڑے کیا گھورتے ہو۔ کیا پہلے کبھی ایک ٹانگ کا آدمی نہیں دیکھا؟ نکلو یہاں سے!'' اس پر وہ سب ایک ایک کر کے چلے گئے۔ پر رحمت وہیں کھڑا رہا۔ پھر دھیرے سے بولا۔ ''ممدو یہ خدا نے تجھے ہڑتال توڑنے کی سزا دی ہے.....!'' بس یہ کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ پھر یہ سن کر مجھے ذرا سا بھی غصہ نہ آیا صرف میں نے سوچا۔ کتنا بدقسمت ہے۔ یہ رحمت! اسے صبر کی قدر ہی نہیں معلوم اور پھر کون جانتا ہے۔ شاید خدا ہڑتال توڑنے والوں ہی سے خوش ہوا اور اس لیے اتنے سخت حادثہ کے باوجود میری جان بچ گئی۔ وہ نہ سب ہڑتال توڑنے والوں کی ٹانگیں ٹوٹنی چاہیے تھیں۔''

ہاں، تو سرکار، صبر کے امتحان میں پورا اترا۔ جب ربڑیا لکڑی کی ٹانگ نہ ملی تو میں نے صبر کی ٹانگ لگوائی اور کباڑی کے یہاں سے یہ دو بیساکھیاں لے لیں اور اس دن سے ان کے سہارے ہی کود پھاند کر چل لیتا ہوں۔ جب محنت مزدوری ممکن نہ ہوئی تو بھیک مانگنا شروع کر دیا۔ روزی دینے والا تو خدا ہے، انسان تو اس کا ذریعہ ہے۔ پھر کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے میں کہاں کی شرم؟ اصل میں تو ہم خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے، سرکار بھیک میں ڈیڑھ دو روپیہ روز سے زیادہ کما لیتا ہوں۔ پھر کارخانے میں جان کھپانے سے حاصل؟ اور ہاں جب ہرنام بیوی بیاہ کرنے آیا اور اس نے مجھے میری ہی کوٹھری سے نکال دیا۔ تب سے میں نے یہاں سڑک کی پٹری پر اپنا گھر بنا لیا ہے چھتیں اور فرش، بنگلے اور کوٹھیاں، اور پلنگ، کرسیاں ..... یہ سب بیکار کے چونچلے ہیں۔ صبر کی چھت اور صبر کا فرش ہو تو سڑک کا کنارہ بھی محل بن جاتا ہے۔

کتنے ہی مہینے میں نے صبر سے بھیک مانگ کر بتا دیے ہیں۔ مجھے اس فقیری کی زندگی میں مزا آنے لگا۔ نہ محنت، نہ مزدوری، نہ مالک مکان کو کرایہ دینا، نہ چولھے چکی کا بکھیڑا، فقیر کی زندگی ہی اصل میں آزاد زندگی ہے۔ میں اور تمام بندھنوں ضرورتوں اور جھگڑوں سے تو آزاد ہو گیا۔ پر کٹی ہوئی ٹانگ ہونے پر بھی ایک شیطانی ضرورت اب بھی جاڑے کی راتوں کو تنگ کرتی ہے۔ جب میرے پاس پانچ دس روپے جمع ہو جاتے تھے۔ میں رات کے وقت سونا گاچی پہنچ جاتا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں، سرکار، اس بازار میں امیر غریب، نواب، فقیر سب برابر ہیں جس کی جیب میں دام ہوں، وہ جو مال چاہے خرید سکتا ہے۔ چاہے وہ لنگڑا لولا فقیر ہی کیوں نہ ہو۔

جاڑے کی ایک رات کا ذکر ہے۔ میں بیساکھیوں کا سہارا لیتا ہوا سونا گاچی میں ایک کوٹھے پر چڑھ گیا۔ یہ جگہ میرے لیے نئی نہیں تھی۔ اکثر میں وہیں آیا کرتا تھا۔ دو روپیہ میں سودا ہو جاتا تھا۔ اگر اس رات کو بوڑھی نائکہ مجھے دیکھتے ہی ہنس کر بولی۔ ''کیوں رے لنگڑے پھر آ گیا تو؟ پر آج دو روپے سے کام نہیں چلے گا..... گدڑی میں پانچ روپے ہیں تو ٹھیک ہے۔ نہیں تو راستہ پکڑو۔'' ان دنوں مجھے بھیک میں اچھی رقم مل رہی تھی۔ چالیس کے نوٹ تو میں گدڑی کے اندر سٹے ہوئے تھے۔ اور سات آٹھ روپے اور پیسے اس وقت بھی میرے پاس تھے۔ میں نے کہا۔

''میں لنگڑا ہوں تو کیا؟ پیسہ میرا بھی دو ٹانگ سے چلتا ہے۔ مال دکھاؤ پانچ روپے بھی مل جائیں گے۔''

پر وہ بڑی گھاگ تھی۔ لونڈیا نہیں دکھائی، مجھ سے پانچ روپے لے کر مجھے اندر کمرے میں دھکیل دیا۔ اندر جا کر میں نے بیساکھیاں تو پھینک دیں اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ لونڈیاں کوئی سچ مچ نئی معلوم ہوتی تھی۔ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

میں نے کہا۔ ''میری جان صورت دکھاؤ! میں لنگڑا ہوں پر تمہیں خوش کر دوں گا۔'' مگر اس نے جو گھونگھٹ اٹھایا، تو یقین مانیے، سرکار، میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔

وہ چلائی..... ''ممدو۔''

اور میں نے کہا۔ چھوٹی بی بی! تم کہاں؟''

وہ بولی۔ ''ہاں ممدو، یہ میری قسمت کا پھیر ہے۔ تمہاری ٹانگ کیا ہوئی؟''

میں نے کہا اور یہ میری قسمت کا پھیر ہے۔''

وہ رو رہی تھی۔ میں نے دلاسا دینے کی کوشش کی، تو بانو مجھ سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ ان تین برسوں میں اس کا وہ رنگ و روپ نہ رہا تھا۔ بیس اکیس برس کی عمر کی تیس پچیس کی لگتی تھی۔

آنکھوں کے گرد گڑھے پڑ گئے تھے۔ پاؤڈر سرخی کے ہوتے ہوئے بھی رنگت پیلی تھی۔ آدھی اتنی ہو گئی تھی۔ کہ باہوں کی ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئی تھیں۔ منہ پر کئی جگہ عجیب سی پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں۔ جب آنسو کچھ دیر کو تھمے۔ تو اس نے مجھے اپنا حال بتایا! جس ڈرائیور کے ساتھ وہ بھاگی تھی۔ وہ بڑا بدمعاش نکلا! کلکتہ لا کر دو تین مہینہ بانو کا زیور بیچ بیچ کر خوب عیش کیا۔ پھر جب گزارے کی کوئی صورت نہ رہی تو اس نے کام پر مجبور کیا۔ اور ایک رات کو اسے ایک سیٹھ کے ہاتھ بیچ کر غائب ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''چھوٹی بی بی تم نے پولیس میں کیوں نہ رپٹ لکھوائی؟ تم تو پڑھی لکھی ہو۔ تحصیلدار صاحب کو لکھا ہوتا، وہ آ کر تمہیں لے جاتے اور اس سور کی چمڑی ادھیڑ دیتے۔''

وہ بولی..... ''پولیس میں رپٹ لکھواتی تو اس کے سوا اور کیا ہوتا کہ مجھے زبردستی واپس بھیج دیا جاتا۔ جو کچھ مجھ پر گزر چکا تھا۔ اس کے بعد میں کیا منہ لے کر ابا کے سامنے جاتی؟

مطلب یہ کہ بے چاری بانو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ ہوتی ہوئی آخیر گھسیٹا رنڈی خانے میں پہنچی تھی۔ جہاں قسمت اسی رات مجھے لے آئی تھی۔

میں نے کہا۔ ''اب تم کوئی فکر نہ کرو جب تک ممدو کے دم میں دم ہے۔ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دے گا۔ اب میں تمہیں ایک منٹ بھی اس پاپ کے نرک میں نہ رہنے دوں گا۔''

وہ آنکھیں نیچی کر کے بولی۔ ''پر ممدو میں بیمار ہوں۔ بہت بری بیماری ہے۔''

اب مجھے ان پھنسیوں کی وجہ سمجھ میں آئی۔ جو بانو کے چاند جیسے مکھڑے کو داغدار بنائے ہوئے تھی۔ مگر میں نے کہا۔ ''کوئی پروا نہیں ہے۔ میں ہی کون سا چھبیلا جوان ہوں؟ لنگڑا فقیر ہی تو ہوں۔ میں تمہارا علاج کراؤں گا تم اچھی ہو جاؤ گی۔ میں نے سنا ہے، اب ہر بیماری کا علاج ہو جاتا ہے۔ چلو میرے ساتھ اسی وقت۔''

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔ میں نے کہا۔ ''آ جاؤ۔'' بوڑھی نائکہ بولی۔ ''ابے لنگڑے! پانچ روپے دیے ہیں کوئی رات بھر کا ٹھیکا نہیں لیا۔ دوسرا گاہک انتظار کر رہا ہے۔'' پیچھے ایک بھیانک، کالا سا تگڑا آدمی نشے میں جھوم رہا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے بانو کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اور دوسرے سے بیساکھیاں اٹھاتے ہوئے کہا۔

''یہ لڑکی میرے ساتھ جا رہی ہے۔ اب یہ یہاں نہ رہے گی۔''

اس کے بعد نہ جانے کیا کچھ ہوا، ٹھیک یاد نہیں، شاید نائکہ نے اس آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ بانو کو دبوچنے کے لیے بڑھا۔ بانو کی چیخ ضرور یاد ہے..... ایسی چیخ جو پتھر دل کو موم کر دے نہ جانے کب اور کیسے۔

میری بیساکھی ہوا میں اٹھی۔ اور اس شرابی کی کھوپڑی پر گری۔ اگلے پل میں وہ زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور ٹانگہ چلا رہی تھی..... خون! کوئی آؤ، دوڑو، اس خونی کو پکڑو.....!'' اور بانوں ڈری آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''ممدو، یہ تو نے کیا کیا؟'' اور میں کہہ رہا تھا۔

چھوٹی بی بی، تم فکر نہ کرو۔ اس دن میں تانگہ وقت پر نہ لایا تھا، یہ اس کی سزا ہے۔''

اور سو، وہ دن اور آج کا دن..... دس برس قید کاٹی، پرسوں ہی چھوٹا ہوں اب پھر وہی سڑک کا کنارہ ہے۔ وہی صبر کا فرش اور صبر کی چھت۔ سنتا ہوں، ان دس سالوں میں ایک بہت بڑی لڑائی ہو چکی ہے۔ ہوئی ہو گی۔ سنتا ہوں لاکھوں ہندو مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ مارے گئے اور اس کلکتے کی سڑکوں پر خون کے دریا بہے، بہے ہوں گے۔ یہ بھی سنتا ہوں کہ دیش آزاد ہو گیا۔ ہوا ہو گا۔ مجھے تو پتا نہیں۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ بھیک پہلے سے کم ملتی ہے۔ اور بہت سے رحمدل بابو پاس سے گزرتے ہیں۔ اور پیسے دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ تو جیب خالی پاتے ہیں۔

پھر بھی خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ کم سے کم ایک ٹانگ تو ہے۔ رولدو کی طرح بالکل اپاہج نہیں ہوں۔ شکر ادا کرتا ہوں کہ بانو اب تک زندہ ہے اور میرے پاس ہے۔ وہ بڑھیا آپ دیکھتے ہیں نا؟ سامنے بیٹھی اپنی سفید بالوں سے جوئیں نکال کر مار رہی ہے۔ وہی بانو ہے۔ بانو، جس کی رنگت کبھی ایسی تھی جیسے میدا اور شہد، اور جو کبھی کالے ریشمی برقعے میں سے منہ نکال کر میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تھی۔ تو ایسا لگتا تھا جیسے بدلی میں سے چاند نکل آیا ہو جس نے بڑی بڑی کٹورا جیسی آنکھیں، اور جس کے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو مست کرنے کو کافی تھی۔ اب اس کے چہرے پر جھریاں پڑ چکی تھیں اور سارا بدن پیپ رستے ہوئے پھوڑے پھنسیوں سے پٹا پڑا ہے اور بہت دن ہوئے اس کا دماغ جواب دے چکا ہے۔ اب اسے نہ بچپن کی سکھ یاد ہیں اور نہ جوانی کے دکھ۔ نہ تحصیلدار صاحب، نہ خانم، نہ ممدو۔ دن بھر وہ بیٹھی بیٹھی جوئیں مارتی رہتی ہے اور آپ ہی آپ نہ جانے کیا بڑبڑاتی ہے۔

مگر شکر اللہ کا، بانو زندہ ہے اور میرے پاس ہے۔ اور میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔

☆☆

اپنی گرفتاری

عابد علی

ایک پولیس والا ہر شخص سے کسی کے بارے میں دریافت کررہا تھا مگر سب ہی لاعلمی کا اظہار کررہے تھے۔ آخرکار وہ ایک گھر میں زبردستی گھس گیا اور پھر پولیس آگئی مگر......؟؟

غوروفکر مند کرنے والوں کے لیے ایک ہوشمند کہانی

اس پاگل سڑک پر، پاگل انسانوں کے ہجوم کے درمیان مین تنہا ہوں۔ ان کی نظریں میری نیلی وردی اور روپہلے بیج پر مرکوز ہیں۔ مجھے چلتے دیکھ کر بعض لوگ خواہ مخواہ ایک جانب ہورہے ہیں۔ اس دھوپ میں سوکھتے ہوئے، پانی عمارتوں والے راستے پرواقع نیوز اسٹینڈ کا مالک مجھے خاصی دلچسپی سے دیکھ رہا ہے۔ وہی نہیں، دیکھوتو مجھے وہ عورتیں بھی رہی ہیں جن کے لباس افلاس کا افسانہ کہہ رہے ہیں۔ دیکھنے کو تو مجھے وہ بچے بھی دیکھ رہے ہیں جو اس گلی میں دور دور تک جا بجا کھڑے ہوئے ہیں۔ مجھے دوسروں کے گھورنے کی کچھ ایسی پروا نہیں، البتہ بچوں کا گھورنا مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔

سڑک پر گزرنے والی موٹروں پر بیٹھے لوگ بھی گاہے گاہے مجھ پر نظریں ڈالتے گزرتے ہیں۔ کسی پولیس مین کو دیکھ کر بہرحال انہیں احساس تحفظ تو ہوتا ہی ہوگا۔ ان کے چہروں پر خوشی کے آثار میں نے بار بار محسوس کیے ہیں۔ بعض اوقات تو میں بھی جواباً انہیں دیکھ کر مسکرا کر دیتا ہوں۔

ایک سیاہ رنگ کے بوسیدہ لباس میں ملبوس بچہ میرے قریب سے گزرا۔ میں نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”بچے تم نے ٹونی رونڈل کو دیکھا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے اچانک گھبرا کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں خوف زدہ ہوگئیں۔

”جناب، میں نے کسی ٹونی رونڈل کو نہیں دیکھا ہے؟“

”سچ؟“

وہ زمین کو گھورنے لگا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے قید سے رہائی مل گئی ہو۔

یہ لوگ مجھ پر اعتماد نہیں کرتے میں انہیں خوب جانتا ہوں۔ ویسے بھی میں آج یہاں پہلی بار آیا ہوں، وہ مجھے نہیں جانتے۔ جان پہچان میں وقت لگتا ہے۔

سامنے ایک دروازے پر ایک تیس سالہ شخص اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کے قریب جا پہنچا۔

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ ٹونی رونڈل کہاں مل سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کون؟ ٹونی؟“ اس نے کیا کیا ہے؟“

”وہ پکا بدمعاش ہے۔ قاتل اور اچکا!“ میں نے کہا۔

اس آدمی نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔

Waqar Azeem Pakistanipoint

''آفیسر، میں اس نام کے آدمی کو قطعی نہیں جانتا۔ وہ کم از کم یہاں تو نہیں رہتا۔''

میں نے پوچھا۔

''تم یہاں کتنے عرصے ہو؟''

وہ بولا۔

''بچپن سے یہیں رہ رہا ہوں۔''

میں اسے چھوڑ کر چل دیا۔

کوئی پچاس گز چلنے کے بعد ایک فروٹ اسٹینڈ پر ایک چھوٹے سے قد کا آدمی کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر دھوپ کی تمازت سے پسینہ ابھرا ہوا تھا۔ شاید وہ وہاں دیر سے کھڑا تھا۔

میں اس کے سامنے رک گیا۔

''سنو۔ کیا تمہیں ٹونی رونڈل کا پتا معلوم ہے؟''

''یہ کون ہے؟''

''یہ ایک چودہ سال کا لڑکا ہے۔ لمبا، دبلا، سیاہ بالوں والا، رنگ برنگ کپڑے کا شائق ہے، قانون کو اس کی تلاش ہے۔''

وہ آدمی اپنا سر ہلانے لگا۔

''جی نہیں، اس نام کا کوئی لڑکا ادھر نہیں۔''

پھر ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بابا برٹ سے پوچھیے، وہ جانتا ہوگا۔ وہ یہاں کے ہر فرد کو جانتا ہے۔''

''شکریہ۔'' میں چل دیا۔

''کیا آپ نام برٹ ہے؟'' میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

”ہاں، کیا بات ہے؟“
وہ کافی بوڑھا آدمی تھا۔ اس کا منہ پوپلا تھا اور سر گنجا۔
”میں ٹونی رونڈل کی تلاش میں ہوں۔“
وہ بولا۔
”تم لوگ ہمیشہ کسی نہ کسی کی تلاش ہی میں رہتے ہو۔“
”آپ جواب دیں۔“ میں نے جھنجلا کر اس کی طرف دیکھا۔
اس نے کہا۔
”اس گلی میں کوئی ٹونی نہیں رہتا۔“
”وہ ایک لمبا سا دبلا سا چودہ سالہ لڑکا ہے۔“
”جی نہیں، ایسا کوئی لڑکا ادھر نہیں۔“
میں چل پڑا۔
”ذرا سننا۔“ اس نے رک کر کہا۔ ”اگلے بلاک میں، میرا خیال ہے۔ ایسا ایک لڑکا کبھی ہوا کرتا تھا۔ وہ کچھ اچکا قسم کا لڑکا تھا اور ہمیشہ پولیس اس کے چکر میں رہتی تھی۔ لیکن...... لیکن میرا خیال ہے کہ پچھلے بیس سال سے میں نے اسے نہیں دیکھا۔ اس کا باپ شرابی تھا اور پھر وہ عرصہ ہوا ایک بوڑھی عورت کے ساتھ فرار ہو چکا ہے۔ اب وہ بھی یہاں نہیں رہتا۔“
”خوب، کچھ پتا ہے کہ اس کے باقی خاندان کا کیا ہوا؟“
”میں کچھ نہیں جانتا۔“
میں چل پڑا۔ سخت دھوپ میں میرا سر پکنے لگا۔
میں نے لمبی لمبی سانسیں لیں۔ سامنے ایک کئی منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ یہ ایک بے حد پرانی سی بلڈنگ تھی۔ خاصی بلند...... اس بلڈنگ میں گھسنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا میں اندر چل پڑا۔ پھر ٹھہر کر گلی کے شور کو سننے لگا۔ اس راہداری میں دیواروں پر متعدد ڈور بیل لگی ہوئی تھیں۔ ناموں کی تختیاں بھی آویزاں تھیں۔ میں لکڑی کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ وہ ہر قدم پر آوازیں دے رہی تھیں۔ پوری ہو امیں عجیب قسم کی بساند پھیلی ہوئی۔ ادھر نچلے درجے کے لوگ رہتے ہیں۔ گندے، چیتھڑوں میں ملبوس۔ یہ لوگ اسی طرح زندہ رہتے ہیں۔ اسی طرح مر جاتے ہیں۔
میں نے پہلی منزل پر پہلے دروازے پر دستک دی، کوئی آواز نہیں، پوری منزل سے ایک کتے کے بھونکنے کی آواز ابھری۔ میں دوسرے دروازے کو تھپتھپانے لگا۔ کچھ زیادہ زور سے۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔
اب میرے سامنے ایک عورت کھڑی تھی۔ درمیانہ عمر کی...... گھٹیا سے لباس میں۔ اندر کا کمرہ گندا سا تھا۔ دیواریں چٹخی ہوئی تھیں۔
”مجھے ٹونی رونڈل کی تلاش ہے۔“ میں نے کہا۔
”وہ ایک نوجوان سا لڑکا ہے۔“
وہ مسکرائی۔
”یہ مکان تو میگلو کا ہے۔“
”کیا میں اندر آ جاؤں؟“ میں اندر گھس پڑا۔
عورت الجھ گئی۔ لیکن میری وردی بھی اہم ہے۔
وہ کچھ نہیں بولی۔
میں چل پڑا اندر کی جانب۔
”مگر اس گھر میں صرف میگلو ہے۔ یہاں کوئی ٹونی نہیں رہتا۔“
میں نے آگے بڑھ کر نجی کمرہ کھولا۔ اندر بستر پر ایک ننھی سی بچی لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ وہاں ایک اور دروازہ موجود تھا۔
”ٹونی......“ میں نے زور سے پکارا۔
”یہاں کوئی ٹونی نہیں۔“ عورت میرے عقب سے بولی۔
”آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔“ دروازے کے پیچھے سے کسی مرد کی آواز ابھری پھر دروازہ کھل گیا۔ سامنے گاؤن میں ملبوس ایک شخص نظر آیا۔
”کیا بات ہے آفیسر۔“ اس نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔

''میں کسی کو تلاش کر رہا ہوں۔''

میں اسے الگ ہٹا کر اندر جھانکتا ہوں، وہاں سوائے بستر کے اور چند اشیا کے اور کچھ بھی نہیں۔

میں نے آگے بڑھ کر بستر الٹ دیا۔ قریبی الماری کو کھول دیتا ہوں، کوئی نہیں۔ پورا کمرہ خالی ہے۔

میں واپس آ کر آدمی کے گاؤن پر ہاتھ ڈال دیتا ہوں۔ اسے گلے سے پکڑ کر اسے پوچھتا ہوں۔

''آخر وہ کہاں ہے؟'' میں اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہوں۔ ''بتاؤ.....'' میں چیخ کر کہتا ہوں۔ ''مجھے معلوم ہے وہ یہاں رہتا ہے۔ مجھے خوب معلوم ہے۔''

دروازے کے پیچھے سے عورت کی زوردار چیخیں بلند ہونے لگیں۔

پوری بلڈنگ میں دروازوں کے کھلنے کے تڑاکے گونجنے لگے۔ اس شور میں کسی کتے کے بھونکنے کی آواز بھی شامل تھی۔

پھر میں خود بھی چیخنے لگا۔ مگر یہ کیا کوئی اور بھی چیخ رہا ہے اور تب..... میں نے سن لیا میں نے آدمی چھوڑ دیا..... شور بڑھتا جا رہا تھا اور یہ شور بلاشبہ پولیس وین کے سائرن کا تھا۔

سائرن کی آوازیں قریب تر آتی جا رہی تھیں اور پھر وہ پوری آواز سے سنائی دیتے دیتے اچانک رک گئیں۔

میں ہال کی سمت بڑھتا ہوں تاکہ ان سے ملاقات کر سکوں۔ وہ ابھی نیچے ہیں۔ میں سیڑھیاں اتر نیچے کی جانب چلتا ہوں۔

نیچے کے آفیسرز مجھے دیکھ کر چونک پڑے۔ ان کی آنکھیں سکڑ سی جانے لگیں۔ ان میں سے چند ایک نے پستول نکال لیے۔ پھر دو آدمیوں نے آگے بڑھ کر مجھے پکڑ لیا۔ جلد ہی ایک اور پولیس مین آگے بڑھا اور مجھے ہتھکڑیاں لگانے لگا۔ خاموش مجمع یہ تماشا بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ حیرت کی بات بھی ہے۔ ایک پولیس والا دوسرے پولیس والے کو پکڑ رہا ہے۔

مسٹر میگلو اپنا لباس درست کرتا ہوا نیچے اترا اور آفیسر انچارج سے بات کرنے لگا۔ اس کی بیوی مجھے حیرت سے تکے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت بھی تھی اور میرے لیے جذبہ ترحم بھی۔

چند منٹ بعد ایک ہری کار پولیس وین کے نزدیک آ کر رک گئی۔ اس میں سے ڈاکٹر موریس اترا۔ اس کے چہرے پر الجھن اویدا تھی۔ وہ ہمیشہ الجھا ہوا نظر آتا تھا۔

پھر ڈاکٹر موریس بھی انچارج کے پاس آ کھڑا ہوا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔

میرے ادھر ادھر کے پولیس والے مجھے لے کر آگے بڑھنے لگے۔ میں نے ڈاکٹر کے قریب پہنچتے ہوئے سنا۔

''آفیسر، اس کا نام ٹونی ہے، ٹونی رونڈل۔''

مجھے ڈاکٹر موریس کی آواز چلتے ہوئے بھی سنائی دے رہی تھی.....

''یہ اس سے پہلے بھی پاگل خانے سے بھاگ چکا ہے، اس نے چودہ سال کی عمر میں ایک قتل کیا تھا۔ پھر اس کا دماغ.....''

پولیس والے نے وین کا دروازہ کھول کر مجھے اندر دھکیل دیا۔ ڈاکٹر میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ مجھے اس کی آواز پھر سنائی دینے لگی۔

''یہ یہیں پیدا ہوا تھا۔ اس نے پہلے بھی پولیس کی وردی چرائی تھی..... اور پھر.....'' ان لوگوں نے وین کا دروازہ بند کر دیا۔

اندر کافی سکون ہے یہاں مجھے کوئی نہیں گھور سکتا اور پھر یہاں ٹھنڈک بھی ہے یہاں سر پر کوئی سورج نہیں.....!

☆☆

آسیب

منظر امام

ایک معصوم فطرت دوشیزہ کا احوال، اسے کئی ممالک سے ہوتے ہوتے پاکستان پہنچنا تھا۔ جہاں وہ اپنی کمپنی کی جانب سے نمائندے کی حیثیت سے کام کرنے والی تھی۔ جس وقت وہ جاپان پہنچی تو اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس نے اسے ناکام بنادیا۔ یہاں اسے ایک ایسا شخص مل گیا جس پر وہ اعتماد کرنے لگی تھی۔ پھر کچھ عرصے کی رفاقت کے بعد اس سے محبت بھی کرنے لگی۔ وہ شخص بھی اس کا ہم سفر تھا، وہ بھی سیاحت کے لیے نکلا تھا پھر وہ ہانگ کانگ پہنچی، یہاں بھی اس کے سامنے پریشانیوں اور الجھنیں موجود تھیں۔ وہ بنکاک پہنچی تو اسے اغوا کرلیا گیا۔ مقامی پولیس کے علاوہ ایف بی آئی بھی اس معاملے کی تحقیقات کررہی تھی۔ پھر اس کے اغوا کے تاوان کے طور پر ایک خطیر رقم کا مطالبہ کیا گیا جو اس کے انکل کو ادا کرنا تھا۔ معاملہ عقل و فہم سے بالاتر ہوتا جارہا تھا، واقعات تیزی سے کروٹ بدل رہے تھے۔ بہت سے چہرے مشتبہ ہوگئے تھے،

تیزی سے تبدیل ہونے والے واقعات پر مبنی ایک طویل ناول

Waqar Azeem Pakistanipoint

بارش اتنی تیز تھی جیسے آنکھوں کے سامنے پانی کی چادر تان دی گئی ہو۔

شیری کو اندازہ نہیں تھا کہ ٹوکیو میں اتنی غضب کی سردی پڑتی ہوگی۔ بے پناہ سردی، تیز بارش اور اندھیری رات۔ ہوٹل سے باہر آتے ہی اس کے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی۔ وہ نیو جاپان ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ہوٹل کے اندر حدت کے نظام کی وجہ سے باہر کے موسم کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ ہوٹل کے داخلی دروازے پر پہنچی اور پستہ قد جاپانی ڈور مین نے مسکراتے ہوئے اس کے لیے دروازہ کھولا اور وہ ہوٹل کی سیڑھیاں اترتی ہوئی فٹ پاتھ پر آ کر کھڑی ہوئی تو اسے احساس ہوا جیسے وہ جنت سے نکل کر جہنم میں آ گئی ہو۔ ایک ایسی جہنم میں جو سرد تھی۔ اس نے احتیاطاً ایک اوور کوٹ تو پہن رکھا تھا لیکن تند ہوا کے جھونکے اس کوٹ کو اڑائے جا رہے تھے۔

اس نے کسی سواری کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں اور ٹیکسیوں کے اڈے کی طرف سے ایک ٹیکسی اندھیرے میں ہیڈ لائٹس روشن کیے، پانی کے چھینٹے اڑاتی ہوئی اس کے پاس آ گئی۔

”نِکا سٹیو۔“ شیری نے جلدی سے دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا اور اسی پھرتی سے دروازہ بند کر دیا۔ اسے ٹوکیو آئے ہوئے پانچ دن ہوئے تھے۔ لیکن اسے اس بات کی خوشی تھی کہ وہ خالص جاپانی لہجے میں جگہوں کے نام بتانے لگی تھی اور ٹوکیو کے ٹیکسی ڈرائیوروں کو اس کی بات سمجھنے میں دشواری بھی نہیں ہوتی تھی۔

ڈرائیور نے اچانک ٹیکسی اسٹارٹ کی اور شیری ایک زوردار جھونکا لے کر رہ گئی۔ اس کے خیال کے مطابق ٹوکیو میں ٹیکسیاں اسٹارٹ ہی پچاس میل کی رفتار سے ہوتی تھیں اس کے بعد یہ رفتار بڑھتی ہی جاتی تھی۔ اسے ہر بار ایسا ہی احساس ہوتا جیسے وہ رومن عہد کی رتھوں کی دوڑ میں حصہ لے رہی ہو اور اس دوڑ کی منزل موت ہو۔

ڈرائیور کو اس بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ اس کی ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی شیری کا کیا حال ہو رہا ہے۔ وہ اتنی تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا جیسے وہ کسی ویرانے میں ہو اور دن کا وقت ہو۔ اسی لیے اس کی ٹیکسی پہلے تو ایک کار سے ۲ نداۓ کے فاصلے سے بچی۔ اس کے بعد ایک دوسری گاڑی سے تقریباً رگڑ کھاتی ہوئی نکل گئی۔

پھر اس نے محسوس کیا کہ ٹیکسی کا رخ نیکا سیٹو بلڈنگ کی طرف نہیں تھا بلکہ وہ کسی اور طرف جا چکی تھی۔ راستہ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ پھر یہ ٹیکسی ڈرائیور نہ جانے، اسے کس طرف لیے جا رہا تھا۔ اس نے بوکھلا کر چیخنا شروع کر دیا۔ ”ڈرائیور نیکا سیٹو، نیکا سیٹو۔“

ڈرائیور نے بھی نیکا سیٹو کہتے ہوئے اپنی گردن ہلائی اور ٹیکسی کی رفتار اور تیز کر دی۔ ٹیکسی اس وقت ایک تنگ سی سڑک سے گزر رہی تھی۔ جس کے دونوں طرف دکانیں تھیں۔ لیکن اس وقت زیادہ تر دکانیں بند دکھائی دے رہی تھیں۔ سڑک کے درمیان ایک بانس پر کوئی بینر لہرا رہا تھا۔ تیز رفتار ٹیکسی اس بانس کو اڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ شیری اس وقت تک زیادہ پریشان نہیں تھی اور نہ ہی اسے زیادہ خوف محسوس ہو رہا تھا۔ بس کچھ بے چینی اور الجھن کا احساس تھا۔

پھر اس نے ایک آدمی کو دیکھا۔ وہ لمبا چوڑا آدمی سڑک کے درمیان کھڑا ہوا اپنا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کر رہا ہو۔ پھر اسے صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ ٹیکسی رکی اور وہ آدمی دروازہ کھول کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ دروازے کے بند ہوتے ہی ٹیکسی نے پھر راکٹ کی سی رفتار پکڑ لی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ حالات کی نوعیت کو سمجھ سکتی۔ اس آدمی کے مضبوط بازوؤں نے اسے اس بری طرح جکڑ لیا کہ وہ بے بس پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگی۔ اس نے خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی لیکن کوئی سخت نوکیلی سی چیز اس کی پشت سے چبھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس آدمی کی سرد اور ٹھٹھرتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”آرام سے میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ بس خاموشی سے بیٹھی رہو۔“

WaqarAzeem pakistanipoint

اس نے اچانک اس آدمی کے جبڑے پر اپنا سر مار دیا۔ اس ضرب نے لمحے بھر کے لیے اس آدمی کو بوکھلا دیا تھا۔ وہ ایک دم سے پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے شیری کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑا اور زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ گالیاں بھی دیتا جا رہا تھا۔ شیری نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ اس وقت بھی بارش بہت تیز تھی اور ہوا چنگھاڑتی پھر رہی تھی شیری کو معلوم تھا کہ اس کی چیخ سننے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ اس کے باوجود چیخے جا رہی تھی۔ کیونکہ ان حالات میں ایک عورت یہی کر سکتی ہے۔

اس سرد اور بے رحم چہرے والے نے اس کے بال چھوڑ دیے اور اس کے دونوں بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے کر جھنجوڑنے لگا۔

''میں کہتا ہوں کہ اپنا یہ شور بند کرو۔'' وہ بھنکارا۔

''میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ لیکن اگر تم.....'' اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ شیری نے اچانک اس کے پیر پر اپنی سینڈل سے ایک بھرپور ٹھوکر رسید کر دی۔ اس ٹھوکر نے اسے بلبلانے پر مجبور کر دیا۔ وہ تھوڑا سا آگے جھکا اور شیری نے اسی لمحے اس کی گرفت سے اپنے بازوؤں کو چھڑا کر اپنے برابر والا دروازہ کھول لیا۔ بارش اور ہوا کا شدید تھپیڑا اسے کپکپا گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے چلتی ہوئی گاڑی سے چھلانگ لگا دی تھی۔ اسے صرف اتنا ہی احساس تھا کہ وہ چھپاک سے پانی میں جا گری ہے اور بارش کی چادر اس پر ٹوٹ پڑی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ٹیکسی کے پہیوں کے چرچرانے کی آواز سنی۔ وہ ٹیکسی شاید اس کے بہت ہی قریب رکی تھی۔

پھر اس نے رکی ہوئی ٹیکسی سے کسی کو اترتے ہوئے دیکھا، اس کے پاس وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح کھڑی ہوئی اور دوڑنا شروع کر دیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اس طرح دوڑتی ہوئی کہاں جا رہی ہے۔ لیکن وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ وہ اگر اسی طرح دوڑتی رہی تو شاید اس کے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ وہ اپنی پوری زندگی میں کبھی اتنی تیزی سے نہیں دوڑی تھی۔ زمین اس کے پیروں سے سمٹتی جا رہی تھی لیکن ہر بار اسے اپنے تعاقب میں آنے والے قدموں کی آواز سنائی دیتی اور اس کی رفتار پہلے سے زیادہ تیز ہو جاتی۔ وہ اس وقت جس گلی سے گزر رہی تھی وہ بہت تنگ تھی۔ دور بنے ہوئے مکانوں اور دکانوں میں بالکل خاموشی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس گلی میں کوئی بھی نہیں رہتا ہو۔ یا کوئی بلا یہاں کے مکینوں کو اٹھا کر لے گئی ہو اور سناٹا بکھیر گئی ہو۔

اس کے تعاقب میں آنے والے قدموں کی آواز اور قریب آ گئی۔ ایک گلی سے ایک رکشہ نکل کر اس طرح اس کے سامنے آ گیا کہ وہ اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔ رکشہ چلانے والا جلدی جلدی پیڈل مارتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس قسم کے رکشے ٹوکیو میں عام طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں صرف ایک آدمی کی گنجائش ہوتی ہے۔ پھر اس نے ایک گیشیا کو دیکھا جو اپنے راستے چلی جا رہی تھی۔ وہ گیشیا تو شاید حقیقت ہو لیکن وہ رکشہ اسے کسی خواب کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ جو اچانک غائب ہو گیا تھا۔

بارش اس کے چہرے پر برس رہی تھی اور ہوا اسے کوڑے مار رہی تھی۔ پھر اس نے اندھیرے میں روشنی چمکتی ہوئی دیکھی۔ یہ روشنی کچھ فاصلے پر تھی۔ اس نے اس روشنی کی طرف دوڑ لگا دی۔ لیکن اب اس کی رفتار سست پڑ چکی تھی اسے اپنے پاؤں اتنے وزنی محسوس ہو رہے تھے کہ انہیں اٹھانا اس کے لیے دوبھر ہو گیا تھا۔

اسے نہیں معلوم کہ وہ کس طرح اسے روشنی تک پہنچ سکی تھی۔ جو اس سڑک کے کونے پر روشن تھی۔ بس اس نے دروازہ کھولا اور اندر آ گئی۔ اندر آ کر اس نے محسوس کیا کہ وہ اوسوبا قسم کے ایک چھوٹے سے ریستوران میں پہنچ چکی ہے۔ جہاں گنتی کی پانچ چھ میزیں لگی تھیں اور مخصوص کھانوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اندر کا ماحول بھی گرم تھا۔ یہاں آتے ہی اسے سکون کا احساس ہونے لگا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت ایک میز پر گاؤن پہنے بیٹھی ہوئی دن بھر کے حساب کتاب میں مصروف تھی۔ جب کہ سترہ اٹھارہ برس کا ایک

نوجوان لڑکا اسے دیکھ کر اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا تھا۔

وہ دروازے کے پاس کھڑی ہوئی اپنی بے ترتیب سی سانسوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جو غبار پھیلا تھا وہ اب چھٹتا جا رہا تھا وہ ادھیڑ عمر عورت کرسی سے کھڑی ہو کر دھیرے دھیرے اس کے پاس آ گئی۔ شیری نے دیکھا کہ اس نے اپنے بالوں کو اس انداز سے جوڑے کی شکل میں باندھ رکھا تھا جو صرف جاپانی عورت ہی کے ساتھ مخصوص ہوا کرتا ہے۔ شیری اسے قریب دیکھ کر اپنے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی۔

''کیا تم انگریزی جانتی ہو؟''

اس عورت نے انکار میں اپنی گردن ہلا دی۔ سترہ اٹھارہ برس کا وہ لڑکا اندھیرے سے نکل کر اس کے پاس آ گیا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میری ماں انگریزی نہیں جانتی۔'' اس نے شیری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں جانتا ہوں۔ آپ بتائیں۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے دھیرے دھیرے اسے خود پر گزرنے والے واقعات بتا دیے۔ اس نے خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ یہاں سے فون کر کے کرائس کو بلا لے۔ کیونکہ وہ اسی کے پاس جانے کے لیے ہوٹل سے نکلی تھی۔ لیکن وہ یہ سن کر وہ لڑکا کچھ شرمندہ ہو گیا تھا کیونکہ اس ریستوران میں فون نہیں تھا۔ اس نے پولیس اسٹیشن چلنے کی پیش کش کی۔ لیکن الجھن یہ تھی کہ اس طوفانی اور اندھیری رات میں وہ اپنی ماں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔

ریستوران سے باہر قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شیری کو اندازہ نہیں تھا کہ باہر کون ہو گا۔ لیکن ان آوازوں نے اس کی گھبراہٹ میں اضافہ کر دیا تھا۔

''کیا تم کسی ہوٹل میں مقیم ہو؟'' لڑکے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس نے کچھ بے تکلفی اور اپنائیت کا اظہار کیا تھا۔

''ہاں میں نیو جاپان ہوٹل میں ٹھہری ہوں۔'' شیری نے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں وہاں تک لے جا سکتا ہوں۔'' لڑکے نے کہا۔ ''ہم دونوں پچھلے دروازے سے باہر نکلیں گے۔ اس طرح ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔''

شیری نے آمادگی کا اظہار کیا اور وہ دونوں ایک چھوٹے سے باورچی خانے سے گزر کر عقبی گلی میں آ گئے۔ جہاں بنے ہوئے مکانات بہت چھوٹے چھوٹے دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے کھلونے ہوں۔ لڑکے کی رفتار اچھی خاصی تیز تھی اور شیری بھی اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

یہ سب کچھ اسے کسی خواب کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کسی خواب ہی میں اس لڑکے کے ساتھ ایک ریلوے اسٹیشن پہنچی جہاں اس لڑکے نے پچاس ین کے دو ٹکٹ خریدے تھے۔ شیری نے رقم دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس لڑکے نے انکار کر دیا تھا۔ وہ سردی سے ٹھٹھرتی، کانپتی ہوئی اس کے ساتھ لگی رہی تھی۔ پھر ٹرین آئی اور وہ دونوں ایک ڈبے میں سوار ہو گئے تھے۔ ٹرین کی رفتار بہت تیز تھی۔ پھر وہ دونوں ایک زیریں اسٹیشن پر اتر گئے تھے۔ جہاں سردی اور بھی شدید تھی۔ پھر اسے اپنے اوپر گزرنے والا واقعہ یاد آنے لگا تھا۔ اور اس یاد نے اسے اور بھی دہشت زدہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ یادیں اصل واقعہ سے زیادہ خوف ناک ہوا کرتی ہیں۔ انسان کسی واقعہ کو تو ہنسی خوشی برداشت کر سکتا ہے۔ لیکن بعد میں جب وہ واقعہ اپنی جزیات سمیت یاد آنے لگتا تو خوف کا احساس تبدیل ہو جایا کرتا ہے۔ اس نے سنا کہ وہ لڑکا اس سے بہت سی باتیں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید وہ لڑکا اس طرح اپنی مشق جاری رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے سیاست، فلم اور کتابوں پر باتیں کی تھیں اور شیری اس کی باتوں کے جواب میں نہ جانے کیا کہتی تھی۔ اسے کچھ یاد رہا تھا۔

وہ لوگ شی بویا اسٹیشن پر آ گئے۔ یہاں سے

ایک دوسری ٹرین پکڑی گئی۔ اور اس ٹرین نے بالآخر ان دونوں نیو جاپان ہوٹل کے قریب اندر اتار دیا۔ یہاں سے وہ دونوں پیدل ہی ٹہلتے ہوئے اس ہوٹل تک پہنچ گئے۔ دروازے پر پہنچ کر شیری نے اس لڑکے کو اس کی خرچ کی ہوئی رقم دینی چاہی لیکن اس نے دوسری بار بھی انکار کر دیا۔

''کیا تم پولیس کو اطلاع دو گی؟'' لڑکے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

شیری ہچکچا رہی تھی۔ پولیس کو بتانے سے کیا ہوتا، پولیس اس سے نہ جانے کیسے کیسے سوالات کرتی۔ جب کہ وہ ایسے جھنجٹ میں پڑنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ کل اس کا جاپان میں آخری دن تھا۔ اسے رات کی فلائٹ سے یہ ملک چھوڑ دینا تھا۔ پھر یہ سوچ کر اس نے حامی بھر لی کہ یہ واقعہ کسی اور کے ساتھ بھی پیش آ سکتا ہے۔ لہٰذا بہتر یہی تھا کہ پولیس کو بتا دیا جائے۔ تاکہ پولیس ایسے مجرموں کی طرف سے ہوشیار ہو جائے۔ اس کا جواب سن کر اس لڑکے کو جیسے اطمینان ہو گیا تھا۔ وہ اسے شب بہ خیر کہہ کر واپس ہو گیا۔

وہ شیشے کے دروازے سے گزر کر لابی میں آئی اور لفٹ کے ذریعے ساتویں منزل پر پہنچ گئی۔ اس کے کمرے کا نمبر ۷۲۷ تھا۔ اس نے چابی کے ذریعے دروازہ کھولا اور اندر جانے سے پہلے کچھ دیر رک کر آہٹ لینے لگی۔ اور جب کسی قسم کی آواز سنائی نہیں دی تو وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ یہ حرکت اس نے پہلی بار کی تھی۔ کمرے میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ ڈیوٹی بھی اپنے بستر پر گہری نیند سو رہا تھا۔ گیارہ بارہ برس کا یہ لڑکا ہندوستان کی ایک مشنری سے تعلق رکھتا تھا۔ اور وہ اس لڑکے کو اس کے سرپرستوں تک پہنچانے کے لیے اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔ وہ امریکا کے ایک اسکول میں پڑھا کرتا تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے جلدی سے ریسیور اٹھا لیا۔ یہ فون ہوٹل کے کاؤنٹر سے کیا گیا تھا۔ فون کرنے والی لڑکی اس سے یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وہ کب تک ہوٹل چھوڑنے کا ارادہ کر رہی ہے۔ شیری نے اسے بتا دیا کہ وہ پرسوں صبح کی پرواز سے ہانگ کانگ جانے کے لیے تیار ہے۔ پھر اس نے ٹوکاسیٹو ہوٹل سے کرائس کو بلانے کے لیے کہا اور ریسیور رکھ کر اپنے جوتے اتارنے لگی۔ جو ابھی تک بہت بری طرح بھیگے ہوئے تھے۔ جوتے اتارنے کے بعد اس نے اپنا لباس تبدیل کر لیا۔ اس وقت فون کی گھنٹی پھر بج اٹھی۔ اس بار کرائس تھا۔

''کیا بات ہے شیری؟'' کرائس نے اس کی آواز پہچاننے کے بعد کہا۔ ''تم آئیں کیوں نہیں۔''

شیری کو اس شخص پر غصہ آنے لگا۔ اس کی آواز میں کسی قسم کی گھبراہٹ یا تشویش کا شائبہ نہیں تھا۔ حالانکہ اسے اندازہ کر لینا چاہیے تھا کہ جب وہ نہیں پہنچی تو کوئی بات ضرور ہو گی۔

''ایک گڑبڑ ہو گئی تھی کرائس۔'' اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اسی وقت میرے پاس آ سکتے ہو؟''

''اس وقت۔'' کرائس نے حیرت سے پوچھا۔

''کیوں کیا بات ہے خیریت تو ہے نا۔ تم ٹھیک تو ہو۔''

''ہاں میں ٹھیک ہی ہوں۔ تم اسی وقت آ جاؤ میں سیڑھیوں کے نیچے لاؤنج میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

ریسیور رکھ کر وہ ڈیوٹی کی طرف دیکھنے لگی۔ امریکہ میں یہ بچہ اس کا پڑوسی تھا اور شیری کو اس سے اتنی ہی محبت تھی جتنی محبت کسی ماں کو اپنے بیٹے سے ہو سکتی تھی۔ یہ بے چارہ بے سہارا تھا۔ اس کا سوائے مشنری والوں کے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس لیے شیری کو اس کا اور بھی خیال رہتا تھا۔

باتھ روم میں آ کر اس نے اپنے بال سنوارنے شروع کر دیے۔ فون کی گھنٹی پھر بج اٹھی۔ اس نے جلدی سے باہر آ کر ریسیور اٹھا لیا۔ اس بار بھی کاؤنٹر کے کسی آدمی نے اس سے دریافت کیا تھا کہ وہ ٹوکیو میں کب تک مقیم ہے۔ اس کا بھی جواب دے کر شیری نے ریسیور رکھ دیا۔ پھر اچانک ایک خیال نے اس کو دہشت

زدہ کردیا۔ پھر اچانک ایک خیال نے اس کو دہشت زدہ کردیا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس ہوٹل میں سب کے سب جاپانی ہیں۔ ان میں کوئی بھی امریکی نہیں ہے۔ لیکن اس آدمی کا لہجہ امریکی تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی اجنبی، پراسرار اجنبی، اس کے ٹوکیو میں قیام کی مدت جاننا چاہتا تھا۔ لیکن کیوں۔

☆☆☆

وہ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے لیے کافی طلب کرلی تھی۔ اس سرد موسم میں کافی سے بہتر کوئی چیز نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ لاؤنج بھی جاپانی انداز میں بہت پرتعیش انداز میں سجایا گیا تھا۔ خوب صورت دبیز قالین پر بڑی بڑی کرسیاں رکھی تھیں اور چھوٹی چھوٹی جاپانی عورتیں، گڑیاؤں کی طرح کیمونو میں ملبوس چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی ادھر ادھر گھومتی پھر رہی تھیں۔ اس نے اپنے بیٹھنے کے لیے ایک ایسی کرسی منتخب کی تھی جس کا رخ شیشے کے دروازے کی طرف تھا۔ جہاں سے باہر دیکھا جاسکتا تھا۔ طوفان اور بارش کی شدت نے اب دم توڑ دیا تھا۔ پھر جب اس نے کافی کی پیالی ختم کر کے رکھی تو اسی وقت کرائس لاؤنج میں داخل ہوگیا۔

کرائس ایک طویل قامت، صحت منداور خوب صورت آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں بھی بہت مہربان اور گرم جوش تھیں۔

ان دونوں کی ملاقات آٹھ دن پہلے ہنالولو میں ہوئی تھی۔ شیری اور ڈیوٹی وہاں تفریح کے لیے گئے ہوئے تھے۔ پھر ایک دکان میں کچھ خریدتے ہوئے شیری نے پہلی بار کرائس کو دیکھا تھا۔ جو ایک نئے شادی شدہ جوڑے سے ان کے ہنی مون کے بارے میں باتیں کررہا تھا۔ پھر اسی شام سرف رائیڈر ہوٹل سے نکلتے ہوئے شیری نے کرائس کو ایک بار پھر دیکھا تھا۔ وہ شادی شدہ جوڑا ابھی اس کے ساتھ تھا۔ اور اس بار ان کے درمیان رسمی علیک سلیک بھی ہوئی۔ بالآخر وہ پانچوں ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔

ہنالولو کی خوب صورت جگہوں پر تفریح کرتے ہوئے کرائس اور شیری ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو اپنے بارے میں بتا دیا۔ شیری امریکہ کی ایک بہت بڑی تعمیراتی فرم سے منسلک تھی۔ اس فرم نے پاکستان میں ایک بند کی تعمیر کا ٹھیکا لیا تھا اور شیری کو بھی وہیں جانا تھا۔ جب کہ کرائس ایک ایئرلائن سے متعلق تھا اور وہ زیادہ تر نیویارک اور لاس اینجلس کے درمیان پرواز کرتا تھا۔ لیکن اس بار وہ چھٹیاں گزارنے کے لیے مشرق کی طرف جارہا تھا۔

کرائس کا ارادہ ایک دن ہنالولو میں مزید قیام کا تھا۔ لیکن عین وقت پر اس نے اپنے پروگرام میں تبدیلی کی اور وہ بھی ان کے ساتھ ہی ٹوکیو کے لیے طیارے میں سوار ہوگیا۔ یہ لوگ ساتھ ہی بیٹھے تھے اور اس دوران شیری کو یہ سفر بہت خوش گوار محسوس ہوا تھا۔ کیونکہ کرائس بہت مزے مزے کی باتیں کیا کرتا۔ ٹوکیو پہنچ کر شیری نے نیو جاپان ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ جب کہ کرائس نے نیکاسیٹو میں اپنا کمرہ مخصوص کروا رکھا تھا۔ لیکن ان دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔

کرائس مضبوط قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس کی سوالیہ لیکن مہربان نگاہیں شیری پر لگی ہوئی تھیں۔ شیری نے اسے اب تک کے سارے حالات بتا دیے۔

''شیری۔'' کرائس بے چین ہوگیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر شیری کا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس گرفت نے شیری کو تسلی دی تھی۔ کرائس بہت سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی یہ کیفیت شیری کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ اسے کچھ عجیب سا محسوس ہورہا تھا۔

''کیا تم نے اس آدمی کو دیکھا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا تم اسے پہچان سکتی ہو؟''

''نہیں۔'' شیری نے اپنی گردن ہلا دی۔ ''مجھے بس اس کی آنکھیں یاد ہیں۔ گہری سیاہ آنکھیں۔''

''کیا تمہارے پاس کچھ رقم بھی تھی؟''

''کوئی خاص نہیں یہ لوٹ مار کا واقعہ نہیں معلوم ہوتا کرائس۔'' شیری نے کہا۔ ''یہ مجرمانہ حملے کا چکر ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں معلوم ہوتی۔''

''نہیں میں ایسا نہیں سوچ رہا ہوں۔ کسی لڑکی پر مجرمانہ حملہ کرنے کے لیے اتنا لمبا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی؟ ایسا لگتا ہے کہ یہ سوچی سمجھی سازش تھی۔''

''تو پھر کیا ہوسکتا ہے کرائس۔ اس کے علاوہ اور کیا بات ہوسکتی ہے۔ پھر ہوٹل میں آنے کے بعد بھی ایک آدمی نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں کب یہاں سے جا رہی ہوں۔ یہ سب کیا ہے۔ میں نے سوچا کہ میں پولیس کو اطلاع دے دوں۔ لیکن اس سے پہلے میں نے تمہیں بتا دینا مناسب سمجھا۔ اب تم کیا کہتے ہو؟''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پولیس کیا کرے گی۔'' کرائس کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں اس ٹیکسی کا نمبر بھی یاد نہیں ہے۔ پھر تم نے کسی کا حلیہ بھی یاد نہیں رکھا۔''

''کیا تمہیں میری بات پر یقین نہیں آیا؟'' شیری نے اداس ہوکر پوچھا۔ اس وقت اسے اپنے باپ کی ایک بات یاد آگئی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ تم یہ مت سمجھنا کہ لوگ تمہاری ہر بات پر یقین کر رہے ہیں۔ بلکہ تم یہ سمجھا کرو کہ لوگ وہی یقین کرنا چاہتے ہیں جو ان کے ذہن میں ہوتا ہے۔ ''کیا تمہیں مجھ پر یقین نہیں آیا؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''دیکھو گڑیا۔'' کرائس نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبا دیا۔ ''تم میری بات رہنے دو مجھے تو سو فی صد یقین ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میرے ایسا تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔''

''معاف کرنا صاحبان۔'' کسی کی آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ ان کی میز کے پاس ادھیڑ عمر کا ایک جاپانی کھڑا تھا۔ اس نے بے داغ سوٹ پہن رکھا تھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''میں مداخلت کی معافی چاہتا ہوں۔'' اس جاپانی نے کہا۔ ''میرا کام ہی ایسا ہے کہ میں بغیر مداخلت کے رہ نہیں سکتا بہرحال میں اپنا تعارف کروادوں۔ میرا نام انسپکٹر تناکا ہے۔ اور میرا تعلق کرمنل انوسٹی گیشن سیکشن سے ہے۔ کیا میں آپ لوگوں کے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں ضرور۔'' شیری اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

وہ ان دونوں سے ہاتھ ملا کر تیسری کرسی پر بیٹھ گیا اور چاروں طرف دیکھنے کے بعد وہ شیری سے مخاطب ہوا۔ ''ایک لڑکا کوجی ماچی پر میرے پاس آیا تھا۔ اور اس نے مجھے آپ کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ آپ کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟''

شیری پہلے نہیں سمجھ سکی تھی کہ وہ کس لڑکے کے بارے میں کہہ رہا ہے۔ پھر اسے ریستوران کے اس لڑکے کا خیال آ گیا جو اسے ہوٹل تک پہنچانے آیا تھا۔ اس نے انسپکٹر تناکا کے سامنے بھی اب تک گزرنے والے واقعات دہرا دیے۔ وہ بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سنتا رہا تھا۔

''چلیں کم از کم یہ تو بتا دیں کہ آپ کی گاڑی کن کن علاقوں سے گزری تھی؟'' تناکا نے دریافت کیا۔

''مجھے تو صرف وہ ریستوران یاد ہے انسپکٹر۔'' شیری نے جواب دیا۔ ''البتہ ہم ایک ایسی گلی سے گزرے تھے جس کے دروازے پر ایک بانس گڑا ہوا تھا۔ اور اس بانس کے اوپر تین عدد سوکھی ہوئی مچھلیاں لٹک رہی تھیں۔ شاید اس سے آپ کو جگہ کا اندازہ ہو جائے۔''

''یہ کوئی خاص پہچان نہیں ہوئی۔'' تناکا مسکرا دیا۔ ''آج کل آپ کو پورے جاپان میں ہر گھر کے سامنے بانس کے اوپر سوکھی ہوئی مچھلیاں دکھائی دیں گی۔ یہ ہمارے ایک تہوار کی نشانی ہے اور اس تہوار میں ہم گھر کے لڑکوں کے حوالے سے سوکھی ہوئی مچھلیاں لٹکا دیتے ہیں۔ خود میرے گھر کے سامنے بھی

چار مچھلیاں لٹکی ہوئی ہیں۔ بہرحال یہاں آتے ہی آپ کو پولیس میں رپورٹ کرنی چاہیے تھی۔''

اس موقع پر شیری نے کرائس کی طرف دیکھا اور کرائس جلدی سے بولا۔ ''ہم یہ سوچ رہے تھے کہ رپورٹ کس بنیاد پر کی جائے۔ کیونکہ شیری کے پاس کوئی ثبوت بھی تو نہیں ہے۔''

''کچھ بھی ہو رپورٹ ضروری ہے۔ ہم ٹوکیو اور نیویارک میں فرق رکھنا چاہتے ہیں۔ بہرحال آپ یہ بتائیں کہ ٹوکیو میں ایسا کون امریکی ہے جو آپ کا دشمن ہوسکتا ہے۔''

''میں یہاں سوائے مسٹر کرائس کے اور کسی کو نہیں جانتی۔'' شیری نے کہا۔ ''ہم دونوں ایک ہی مقام سے سفر کررہے ہیں اور ہمیں بہت سی جگہوں پر ایک ساتھ ہی جانا ہے۔''

''کیا آپ پہلے بھی جاپان آچکی ہیں مس شیری؟'' تناکا نے پوچھا۔

''نہیں ویسے میں دو سال تک سائیگان میں رہی ہوں۔ دراصل میرا تعلق ایک تعمیراتی فرم سے ہے۔ ہماری فرم نے ویتنام میں کچھ عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ اس سلسلے میں دو سال تک مجھے وہیں رہنا پڑا تھا۔ لیکن یہ اتفاق ہے کہ میں جاپان نہیں آسکی تھی۔''

''اور اب آپ یہاں سے کہاں جائیں گی؟''

''ہانگ کانگ، بینکاک، کولمبو، دہلی اور اس کے بعد کراچی جہاں مجھے دو سال تک کام کرنا ہے۔''

''اور آپ مسٹر کرائس؟'' تناکا نے کرائس کی طرف دیکھا۔

''فارموسا، ہانگ کانگ، بینکاک اور اس کے بعد واپس جہاں لاس اینجلس میں میرا ایک چھوٹا سا فلیٹ ہے۔''

''کس کو معلوم ہے آپ یہ ہوٹل چھوڑ رہی ہیں۔''

''کسی کو نہیں۔''

''کیا آپ واقعی کچھ نہیں جانتیں مس شیری؟'' تناکا نے پوچھا۔

شیری کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اب یہ شخص بھی اس پر یقین نہیں کررہا تھا۔ کرائس نے شاید اس کی یہ کیفیت بھانپ لی تھی اسی لیے جلدی سے بول پڑا۔

''شیری برامت مانو۔ انسپکٹر تناکا صرف وجوہات معلوم کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔''

لیکن شیری نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ انسپکٹر سے مخاطب ہوئی۔ ''انسپکٹر کیا تمہارے خیال میں میرا تعلق مجرموں کے کسی گروہ سے ہے۔ کیا کسی گروہ کا کوئی راز میرے ہاتھ لگ گیا ہے۔ اور وہ اسی لیے مجھے مارنے کی کوشش کررہے تھے۔ میں کہتی ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم میرا ریکارڈ چیک کرسکتے ہو۔ میں ایک مشہور تعمیراتی فرم میں سیکریٹری ہوں اور میرا ریکارڈ شروع سے بے داغ رہا ہے۔''

''اوہو آپ تو برامان گئیں۔'' تناکا نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں تو پریشان ہورہا ہوں۔ کیونکہ اس شہر میں آپ جیسی بہت سی امریکی خواتین موجود ہیں۔ اس لیے اب ہمیں بھی مشکوک لوگوں پر کڑی نگاہ رکھنی ہوگی۔ ویسے ٹیکسی سے کودنے کے بعد کیا آپ کو چوٹ نہیں لگی تھی؟''

''نہیں۔'' شیری نے جواب دیا۔

انسپکٹر تناکا نے یہ سننے کے بعد کچھ کہا تو نہیں لیکن شیری خود کو جھوٹا سا محسوس کرنے لگی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ چلتی گاڑی سے گرنے کے بعد ذرہ برابر بھی چوٹ نہیں آئے۔ کسی قسم کی کوئی خراش ہی نہ لگے۔ لیکن وہ اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی تھی۔ اس کے ساتھ یونہی ہوا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ انسپکٹر کے ساتھ ساتھ اب کرائس بھی اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ برداشت نہیں کرسکی اور بھڑک اٹھی۔

''ٹھیک ہے۔ آپ لوگ میرا یقین مت کریں۔ کیا آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں پاگل ہوگئی ہوں اور میرے ذہن میں یہ چھپا ہوا ہے کہ میں ٹیکسی لے کر ٹوکیو کی سڑکوں پر ماری ماری پھروں اور کوئی شخص مجھ پر مجرمانہ حملہ کرے اور میرا یہ تصور اس حد

تک پختہ ہوگیا ہے کہ میں اسے سچ سمجھنے لگی ہوں۔''

تنا کا جلدی سے کھڑا ہوگیا۔''میں معافی چاہتا ہوں شیری کہ میری باتوں سے آپ نے یہ نتیجہ اخذ کیا۔اچھا اب میں چلتا ہوں۔''

وہ چلنے کے لیے مڑا پھر اس نے شیری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''میں آپ کو ایک جاپانی نظم سناؤں۔وہ نظم کچھ یوں ہے کہ تنکی عبادت گاہ کے گھنٹے سے چپکی ہوئی اس وقت تک سوتی رہتی ہے جب تک کوئی اس گھنٹے کو نہ بجائے۔بہرحال ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس گھنٹے کو بجانے کے لیے کس کے ہاتھ آگے بڑھتے ہیں۔''

شیری اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔تنا کا کے جانے کے بعد شیری بھی اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔کرائس اسے اس کے کمرے تک پہنچانے کے لیے آیا تھا۔

''دروازہ اندر سے بند کرلینا۔''اس نے ہدایت کی۔''اور کسی بھی حال میں مت کھولنا۔''

شیری کو اس کی نصیحت سے زیادہ کسی اور چیز کی ضرورت تھی۔وہ اس کی ہمدردی اور اس کا خلوص چاہتی تھی۔اس کا خیال تھا کہ کرائس جاتے وقت پہلے کی طرح اس کے ہاتھ کو دبا کر اپنی گرمجوشی اور ہمدردی کا اظہار کرے گا۔لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔وہ اسے شب بخیر کہہ کر چلا گیا تھا۔

شیری نے اندر آ کر دروازہ بند کیا اور کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔اس کے سامنے عظیم شہر ٹوکیو اپنی تمام تر خوبیوں اور خوب صورتی کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔اس نے یہ اندازہ کرلیا تھا کہ زندگی بہت خوب صورت اور کٹھن ہوا کرتی ہے اور بہت کم ایسے ہوا کرتے ہیں جو اس بدصورتی میں بھی حسن تلاش کر لیتے ہیں۔جاپانیوں نے بھی یہی کہا تھا۔جنگ کے بعد ان کی زندگی دشواریوں اور بدصورتیوں کا آمیزہ ہوگئی تھی۔لیکن انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے قدرت کے حسن کو تلاش کرلیا تھا اور اب اس سے لطف اٹھا رہے تھے۔

لیکن شاید ایسا کرنا اس کے لیے آسان نہ ہو۔نہ جانے پاکستان میں اس کی زندگی کس انداز کی ہو۔نیا ملک،نیا ماحول،وہ اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔بہت دنوں بعد اسے اپنے انکل ڈین اور آنٹی آئرین یاد آ رہے تھے۔اس کے انکل نے بھی اپنی محنت سے زندگی کو خوب صورت کرلیا تھا۔اور اب وہ شکاگو میں الیکٹرونکس کے کاروبار میں ایک بڑے آدمی سمجھے جاتے تھے انکل ڈین کے ساتھ شیری کو اپنے والدین بھی یاد آ گئے۔ان دونوں کے درمیان علیحدگی ہو چکی تھی اور اس کے ڈیڈی ستائیس برس تک ہوانا کی مشنری میں خدمات انجام دینے کے بعد دل کے دورے میں انتقال کر گئے تھے۔

انکل ڈین اس کے ڈیڈی کی آخری رسومات میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔لیکن انہوں نے اسی زمانے میں اپنے کاروبار کا آغاز کر دیا تھا اور وہ کاروبار ابھی گھٹنوں کے بل چل رہا تھا۔اسی لیے وہ شیری کی کفالت نہیں کر سکتے تھے اور شیری کو اپنی زندگی کا بوجھ خود ہی اٹھانا تھا۔اسی لیے اس نے تعمیراتی فرم میں ملازمت کرلی اور اسی سلسلے میں اسے سائیگان بھی جانا پڑ گیا۔اس دوران انکل ڈین کا کاروبار چل نکلا اور انہوں نے شیری کو بلانے کے لیے ایک خط بھیج دیا۔لیکن اب شیری اپنے راستے پر خود ہی چل پڑی تھی۔اسے اپنے کسی رشتے دار کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔

پھر وقت گزر گیا۔اس کی ملاقات ڈیوٹی سے ہوئی۔پھر کرائس سے ہوئی اور یہ لوگ مختلف جگہوں سے ہوتے ہوئے ٹوکیو پہنچ گئے تھے۔یہاں انہوں نے ڈھیری تفریح کی تھی۔خوب صورت باغات اور قدیم عمارتیں دیکھی تھیں۔بنجو قلعے کی طرف گئے تھے۔گولڈن پویلین دیکھا تھا۔پھر عبادت گاہ کے پاس پہنچ کر گائڈ نے ان سے کہا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ باندھ لیں۔اس نے یہ جملہ کئی بار دہرایا تھا۔اس جملے کی بازگشت اس وقت بھی شیری کے ذہن میں تھی۔پھر یہ جملہ فون کی گھنٹی میں تبدیل ہوگیا۔وہ چونک

اٹھی۔ اس کے خیالات کا سلسلہ منتشر ہوگیا۔ وہ بستر سے اتری اور میز پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھایا۔

اس کی آہٹ نے ڈیوٹی کو بھی جگا دیا تھا۔ ''کیا صبح ہوگئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں ابھی رات ہے۔'' شیری نے جواب دیا۔ ''چلو کروٹ بدل کر سو جاؤ۔''

''مس شیری جونز۔'' دوسری طرف سے کسی لڑکی کی نرم اور خوب صورت آواز سنائی دی۔

''ہاں میں شیری بول رہی ہوں۔ کون ہو تم؟''

''تم مجھے نہیں جانتیں اور میں تمہیں نہیں جانتی۔ مس شیری۔''

ڈیوٹی نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن شیری نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ لڑکی کہہ رہی تھی۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں مجھ سے ضرور ملنا چاہیے۔ میں جانتی ہوں کہ تم مصیبتوں میں پھنسی ہوئی ہو اور میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔ میں ان مصیبتوں سے نکلنے میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔ میری بات سمجھ گئیں۔''

''نہیں، میں نہیں سمجھی، میں کسی مصیبت میں نہیں ہوں اور تم کون ہو؟''

''تم کل رات میرے پاس آ جانا۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''لیکن تمہیں اکیلے آنا ہوگا۔ اگر کوئی تمہارے ساتھ ہوا تو میں تم سے نہیں مل سکوں گی۔ تم موناڈ کو سے واقف ہو؟''

''موناڈ کو۔'' شیری نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں یہ اس شہر میں پاپتکو کھیل کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ گنزا اسٹریٹ کے عقب میں۔ یہ اسی اسٹریٹ پر ہے۔ ہر شخص جانتا ہے۔ تم کسی سے پوچھ لینا۔ وہ تمہیں بتا دے گا۔ تمہیں ٹھیک کل گیارہ بجے پہنچنا ہے۔ رات گیارہ بجے میں وہاں تمہارا انتظار کروں گی۔ موناڈ کو آ کر تم آئی ساکو کے بارے میں معلوم کر لینا۔ یاد رکھنا میرا نام آئی ساکو ہے۔''

''ذرا ایک منٹ۔'' شیری جلدی سے بولی۔ ''میری بات تو سنو۔ یہ سب کیا ہے۔ تم کون ہو؟ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟''

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا تھا۔

☆☆☆

وہ بہت دیر تک ریسیور کو ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔ اس کا ذہن بالکل خالی ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

''میرا خیال ہے کہ ہم لوگ کسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔'' ڈیوٹی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

اس نے جلدی سے ریسیور واپس رکھا اور اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''بری بات۔ جھوٹے بچے ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔''

''کیوں نہیں کرتے۔'' ڈیوٹی بستر سے اتر کر اس کے پاس آ گیا۔

''میں اب اتنا چھوٹا بھی نہیں ہوں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ مجھے سب کچھ بتا دیا جائے۔''

شیری اپنی بے ساختہ مسکراہٹ نہیں روک سکی تھی۔ ''ٹھیک ہے اسے ننھے سراغرساں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''مسئلہ صرف یہ ہے کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے نیکاسیٹو کے بجائے کہیں اور لے جانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں اس کے چنگل سے نکل آئی اور اب کسی عورت کا فون آیا تھا۔ اس نے مجھے بلایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میں کسی مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔ بس اتنی سی بات ہے۔ چلو اب تم اچھے بچوں کی طرح جا کر سو جاؤ۔''

''کیا تم اس عورت سے ملنے کے لیے جاؤ گی؟'' ڈیوٹی نے پوچھا۔

''کیوں تمہیں اس سے کیا۔''

''میں بھی ساتھ چلوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ دیکھا جائے گا۔ چلو اب اپنے بستر پر جاؤ شاباش۔''

ڈیوٹی کے لیٹنے کے بعد وہ بھی لیٹ گئی۔ لیکن اس کا ذہن تو الجھا ہوا تھا۔ اور جب ذہن الجھا ہو تو پھر نیند نہیں آتی۔ صرف خیالات آیا کرتے ہیں۔ الٹے سیدھے پریشان اور خوف زدہ کر دینے والے خیالات۔ کئی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ان میں ایک آواز اس امریکن کی تھی جس نے فون کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ ہوٹل کب چھوڑ رہی تھی اور دوسرے آواز اس عورت کی تھی جس نے اسے ایک خاص مقام پر بلایا تھا۔

بالآخر آوازوں اور خیالات کے درمیان اسے نیند آ ہی گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو سورج ٹوکیو پر نمودار ہو چکا تھا۔ غسل خانے سے ڈیوٹی کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اس سے پہلے ہی بیدار ہو کر غسل خانے میں چلا گیا تھا۔ وہ بستر سے اٹھ کر آئینے کے سامنے آ گئی۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔

ناشتے کے لیے نیچے جانے سے پہلے اس نے ڈیوٹی سے کہا۔

''ڈیوٹی آج تمہیں میرے اور کرائس کے ساتھ چلنا ہوگا۔''

یہ سن کر ڈیوٹی کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے آج جوڈو کلب جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ پھر بھی اس نے اپنے موڈ پر قابو پا لیا تھا۔ ''کیا تمہیں میری ضرورت پڑے گی؟''

''ہاں ہاں اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے تو پھر میں بھی ساتھ چلوں گا۔''

کوریڈور ہی پر ان کی ملاقات اس ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ایک بوڑھی عورت سے ہوگئی۔ یہ عورت انہیں اکثر دکھائی دی تھی اور ان کے درمیان علیک سلیک بھی ہو چکی تھی۔

اس موقع پر اس نے اپنا تعارف کروایا۔ اس کا نام سوسن تھا۔ میسا چوسٹس کی رہنے والی تھی اور ایک دولت مند بیوہ تھی۔ ان دونوں نے بھی اسے اپنے بارے میں بتا دیا تھا۔

ریستوران میں آ کر ان دونوں نے اپنے لیے ایک ایسی میز منتخب کی جو شیشے کی دیوار کے قریب تھی اور وہاں سے باہر پتھروں کا بنا ہوا مصنوعی آبشار دیکھا جا سکتا تھا۔ ہوٹل کے مستعد بیرے نے اس کے سامنے ایک مینو لا کر رکھ دیا۔ جس پر انگریزی اور جاپانی میں کھانوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ لیکن آرڈر دینے سے پہلے اس نے بیرے سے پاچنکو کے بارے میں سوال کر لیا۔

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ پاچنکو کھیل کیا ہوتا ہے؟''

''کیوں نہیں مادام۔'' بیرے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے جاپان میں یہ کھیل ہر جگہ کھیلا جاتا ہے۔ یہ دراصل بال پھینک کر نشانہ لگانے والا ایک کھیل ہے اور اس میں جیتنے والے کو چھوٹی چھوٹی چیزیں تحفے میں دی جاتی ہیں۔ مثلاً کوئی صابن یا کیک وغیرہ۔ اس میں نقد رقم نہیں دی جاتی۔ کیونکہ یہ کسی قسم کا جوا نہیں ہے۔''

شیری نے اسے ناشتے کا آرڈر دے دیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے اپنے اردگرد نگاہیں دوڑائیں۔ اس کے قریب والی میز پر چار امریکی عورتیں ایک دوسرے کو اپنی اپنی سیاحت کے واقعات سنانے میں لگی ہوئی تھیں۔

ان لوگوں کا ناشتا ختم ہی ہوا تھا کہ کرائس بھی آ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی کھلنڈری سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جو اس کی شخصیت کا جزو بن کر رہ گئی تھی۔ اس نے بڑے خوش گوار انداز میں ان دونوں سے علیک سلیک کی اور تیسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے بیرے کو اپنے لیے کافی لانے کا آرڈر دے دیا تھا۔

یہ شخص شیری کی توقعات کے برعکس ثابت ہوا تھا۔ شیری کا خیال تھا کہ وہ اس سے گزرنے والی رات کے بارے میں بھی پوچھے گا۔ بڑی بے تابی سے اس کی خیریت دریافت کرے گا۔ لیکن اس کے برعکس وہ بہت لاپروا دکھائی دے رہا تھا۔ بالآخر شیری نے خود ہی بتانا شروع کر دیا۔

''رات کو کسی جاپانی عورت کا فون آیا تھا۔ وہ آج رات مجھ سے موناڈ کو نامی جگہ پر ملنا چاہتی ہے۔ یہ جگہ گنزا اسٹریٹ کے عقب میں ہے۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ میں کسی مصیبت میں پھنسی ہوئی ہوں اور وہ میری مدد کرسکتی ہے۔''

''کس قسم کی مصیبت۔'' کرائس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

شیری کو یہ سوال سن کر تھوڑا صدمہ ہوا تھا۔ کرائس اتنا انجان کیوں بن رہا تھا۔ جب کہ اسے سارے واقعات کا علم تھا۔

''فکر مت کرو۔ اگر میں کسی مصیبت میں ہوئی بھی تو تم سے نہیں کہوں گی۔'' وہ غصے سے بولی۔

''اوہ۔'' کرائس نے اس کا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا۔ ''برا مان گئیں۔ ہم لوگوں کی ملاقات کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور ابھی سے تم ناراض ہونے لگی ہو۔''

یہ بہت عجیب بات تھی۔ کرائس نے یہ بات گرچہ مذاق سے اور اسے بہلانے کی خاطر کہی تھی۔ پھر بھی شیری کو بہت اچھی محسوس ہوئی۔ واقعی ان دونوں کے درمیان ملاقات بھی کتنی پرانی تھی۔ صرف آٹھ دن پہلے وہ ایک دوسرے سے ملے تھے اور ان آٹھ دنوں میں کوئی کسی کو کیا سمجھ سکتا ہے۔

''جانتی ہو جب میں تمہارے اور ڈیوٹی کے ساتھ ہوتا تو مجھے سب کچھ اچھا معلوم ہونے لگتا ہے۔ سڑکیں، دکانیں سب اچھی اور بھلی معلوم ہوتی ہیں۔''

شیری خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ کرائس کا لہجہ اچانک ہی خواب ناک ہوگیا تھا۔ پھر وہ جیسے اپنے آپ میں آتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ دیکھتے ہیں وہ لڑکی کیا کہتی ہے۔ ویسے تم گھبرانا نہیں۔ خطرے کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ جب ہر طرف لوگ موجود ہوں تو اس وقت کوئی کسی پر حملہ کرنے کی جرات نہیں کرسکتا۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' ڈیوٹی جلدی سے بول پڑا۔

''بلکہ میرے خیال میں مجمعے میں اگر کوئی کسی کو مارنا چاہے تو زیادہ آسانی ہوتی ہے۔ کیونکہ اتنے آدمیوں کی بھیڑ میں یہ معلوم ہی نہیں ہوسکتا کہ کس نے گولی چلائی تھی۔''

''واہ میرے ننھے سراغ رساں۔'' کرائس اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔ ''تم اب سب کے سامنے یہ سب مت کہتے رہنا۔ سمجھے۔''

ڈیوٹی زور زور سے ہنسنے لگا۔ شیری بھی مسکرا دی۔ بہت دیر بعد اس کے ذہن پر چھائی ہوئی دھند صاف ہوئی تھی۔

☆☆☆

ہوٹل سے باہر آ کر کرائس نے ٹیکسی روکی اور شیری اور ڈیوٹی کے لیے دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ اس وقت شیری کو رے یاد آ گیا۔ رے سے اس کی ملاقات سایگان میں ہوئی تھی اور وہ دونوں تفریح کے لیے جایا کرتے تھے اور رے بھی اسی طرح اس کے لیے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر کھڑا ہوجاتا تھا۔ لیکن اس عمل سے کیا ظاہر ہوتا تھا۔ ایک مرد کی توجہ، محبت گرم جوشی یا صرف عادت ہوسکتا ہے کہ بعض مردوں کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ پتا نہیں یہ کرائس کیا سوچتا تھا اس کے جذبات کیا تھے۔ کیا یہ اس کی عادت تھی یا توجہ بہرحال وہ ابھی کوئی فیصلہ نہیں کرسکتی تھی۔

وہ لوگ بہت دیر تک گنزا میں شاپنگ کرتے رہے یہاں انہیں ایک پیاری سی جاپانی لڑکی ملی جس کا نام ایمی او کا موڈ تھا۔ وہ لڑکی ان کی گائڈ بن کر انہیں بہت سی جگہوں پر لے گئی۔ اس دن وہ میجی کی یادگار دیکھنے گئے۔ جہاں مہاتما بدھ کا ایک عظیم الشان مجسمہ آلتی پالتی مارے اپنا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس احاطہ میں وہ داخل نہیں ہوسکے تھے۔ کیونکہ صرف تہواروں کے موقعوں پر اس احاطے میں داخل ہونے کی اجازت تھی۔ اس صورت حال نے ڈیوٹی کو بہت بد دل کر دیا تھا۔ اس احاطے کے باہر بہت سے سیاح

بھی کھڑے تھے۔ ان میں ایک جاپانی جوڑا بھی تھا جن کے ساتھ دس گیارہ برس کی ایک پیاری سی بچی تھی۔ ان لوگوں نے شیری، کرائس اور ڈیوٹی سے ایک تصویر اتروانے کی درخواست کی۔ ان لوگوں نے اس جوڑے کی بات مان لی تھی۔ تصویر اتروانے کے بعد ڈیوٹی ان لوگوں کے ساتھ ہی چل پڑا تھا۔ لیکن شیری نے آواز دے کر اسے بلالیا۔ وہ یہاں کسی کو نہیں جانتی تھی یہ لوگ اس کے لیے اجنبی تھے۔ اس کے علاوہ ایک پراسرار سا خوف بھی اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا۔ پھر وہ ڈیوٹی سے محبت بھی بہت کرتی تھی۔

''ایسا محسوس ہوا جیسے تم اپنے بیٹے کے لیے پریشان ہو رہی ہو۔'' کرائس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شیری کو یہ سن کر حیرت ہوئی تھی۔ کیا وہ اتنی ہی ٹرانسپیرنٹ تھی کہ اپنے احساسات بھی چھپا نہیں سکتی تھی۔ اس نے کرائس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ خود کرائس نے موضوع بدل دیا تھا۔ وہ اب اپنی تنہا زندگی اور تنہا فلیٹ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس نے اپنے والدین کے بارے میں بتایا جو ابھی تک انڈیانا میں تھے۔ لیکن والدین کے ہوتے ہوئے بھی اس کی زندگی تنہا تھی اور کسی نے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی، اس نے اپنے پڑوسیوں کے بارے میں بتایا جنہوں نے ایک بار اس کی دعوت کی تھی اور اس کی زندگی کا وہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے اس میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔

پھر اس نے اس لڑکی کے بارے میں بتایا جو اس کے سامنے والے فلیٹ میں رہتی تھی اور کرائس میں دلچسپی لے رہی تھی۔ لیکن کرائس اس کے لیے سنجیدہ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس لڑکی کے حالات مختلف تھے۔ اس کا مزاج مختلف تھا۔ اس کے انداز مختلف تھے۔

''اب تم مجھے اپنے فلیٹ کے بارے میں بتاؤ۔'' اس نے شیری سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں تنہائی محسوس نہیں ہوتی۔''

''میرا فلیٹ بھی بہت چھوٹا ہے۔'' شیری نے بتایا۔

''بس کسی نہ کسی طرح گزارا کر لیتی ہوں۔ جب تک تنہائی کا سوال ہے تو یہ عذاب میرے ساتھ بھی ہے۔ خاص طور پر ویت نام اور ہندوستان کے اجڑے ہوئے اور یتیم بھوکے اور بیمار بچوں کو دیکھا ہے۔ میرا احساس ختم ہو گیا ہے۔ اس دنیا میں بہت غربت اور بڑی تنہائی ہے کرائس۔ ان بچوں کی غربت اور تنہائی کو دیکھ کر میں نے اپنی تنہائی کا احساس ختم کر دیا ہے۔''

''تم واقعی بہت مہربان اور نرم دل کی ہو شیری۔'' کرائس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں بھی بے حس نہیں ہوں۔ مجھے بھی ایسے بچوں سے محبت ہے۔ ان کا دکھ محسوس ہوتا ہے۔ میں تمہیں بتاؤں۔ میرے علاقے میں ایک اخبار فروش لڑکا ہے۔ وہ بے چارہ بھی بالکل تنہا ہے اور میری اس سے اچھی خاصی دوستی ہے۔ اسے جب بھی موقع ملتا ہے۔ وہ میرے پاس آ جاتا ہے اور ہم دونوں گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تنہائی کا مداوا یہی ہے۔ ایک تنہا آدمی ہی دوسرے تنہا آدمی کے دکھ کو محسوس کر سکتا ہے کیوں۔''

اس نے شیری کی آنکھوں میں جھانکا اور شیری نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اس رات ڈیوٹی کو سمجھانے میں بہت دشواری ہو رہی تھی۔ وہ شیری کے ساتھ ہی جانا چاہتا تھا۔

''نہیں جان تم میرے ساتھ نہیں جا سکتے۔'' شیری نے اسے سمجھایا۔ ''میرے ساتھ کسی بچے کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔''

شیری کا جواب سن کر ڈیوٹی کا منہ بن گیا۔ شیری کو اس لمحے اس پر بہت پیار آنے لگا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ اسے اس طرح بے پناہ سکون حاصل ہو رہا تھا اس لڑکے کی محبت نے اس کے گداز دل کو اور بھی گداز کر دیا۔

''ٹھیک ہے۔ اب میں چلتی ہوں۔'' شیری

اسے بستر پر لٹاتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ اس نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ اس نے اپنے بال بڑے سلیقے سے بنا رکھے تھے اور اس کا لباس بھی ٹھیک ہی تھا۔

شیری کو ڈیوٹی کی بات نہ ماننے کا افسوس بھی ہو رہا تھا۔ لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کس قسم کے حالات پیش آ سکتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ اس عورت نے کسی اور مقصد سے اسے بلایا ہو۔ ممکن تھا کہ اس پر پہلے کی طرح حملہ ہونے والا ہو۔ حالانکہ اتنی بھری پری جگہ پر ایسا کوئی امکان نہیں تھا۔ پھر بھی ایک خوف تو اس کے ساتھ لاحق تھا ہی۔

''تم واپس کب آؤ گی۔'' ڈیوٹی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آدھی رات ہو جائے گی میرے باپ۔'' شیری مسکراتی ہوئی بولی۔ ''اور ہاں دروازہ اندر سے بند کر لینا اور کسی بھی قیمت پر مت کھولنا، میں واپس آ کر نیچے سے فون کروں گی اور جب میری آواز پہچان لو۔ اس کے بعد میرے دستک دینے پر دروازہ کھول دینا سمجھے۔''

ڈیوٹی نے اثبات میں گردن ہلا دی اور شیری اس کمرے سے باہر آ گئی۔ وہ دروازے کے باہر اس وقت تک کھڑی رہی تھی جب تک ڈیوٹی نے اندر سے دروازہ نہیں بند کر لیا تھا۔ پھر جب اس نے دروازہ بند ہونے کی آواز سن لی تو کوریڈور کی طرف بڑھ گئی۔ اسی وقت کرائس بھی لفٹ سے اتر کر اسی کی طرف چلا آ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی پیاری سی کھلنڈری مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ شیری نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس سے ہاتھ ملایا اس کی موجودگی ہمیشہ اسے حوصلہ دیا کرتی تھی۔

''کیا خیال ہے پرسوں ہم دونوں ہانگ کانگ میں نہ مل لیں۔'' کرائس نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ''ہم لوگ رات بھر کشتی کی سیر بھی کرتے رہیں گے۔''

''نہیں۔'' شیری نے ایک گہری سانس لی۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں تم سے نہیں مل سکوں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم فارموسا ہوتے ہوئے جاؤ گے جبکہ میرا روٹ مختلف ہے۔''

اس کے بعد ان دونوں کے درمیان پھر کوئی بات نہیں ہوئی۔ دونوں ہی خاموش تھے۔ انہوں نے باہر آ کر ایک ٹیکسی حاصل کی اور ٹیکسی والے کا موناڈ کو کا کچھ پتا بتا دیا۔ شیری اچانک خود کو تھکی ہوئی اور خوف زدہ محسوس کرنے لگی تھی۔ نہ جانے وہ لڑکی اس سے مل کر کیا کہنے والی تھی۔ خطرہ اگر واضح ہو تو اتنی گھبراہٹ نہیں ہوا کرتی۔ لیکن جب خطرہ چھپا ہوا ہو تو انسان اپنے سائے سے بھی بھڑکا ہوا ہوتا ہے۔

انہوں نے پاچنکو سے کچھ پہلے ہی ٹیکسی رکوالی تھی۔ سامنے ہی موٹے موٹے روشن حروف میں موناڈ کو لکھا ہوا تھا۔ اس کے برابر میں ایک چھوٹا سا ریستوران تھا اور ریستوران کے برابر ایک تھیٹر دکھائی دے رہا تھا۔ گویا یہ ایک تفریحی مرکز تھا۔ اسی لیے بے فکروں کی ٹولیاں ادھر ادھر گھومتی پھر رہی تھیں۔

''ابھی ہم لوگوں کے پاس بہت وقت ہے۔'' کرائس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم اتنی دیر تفریح کر لیتے ہیں۔''

گرچہ یہ جگہ لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کے باوجود شیری کو خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی مضبوطی کے ساتھ کرائس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ دونوں اس فٹ پاتھ پر ٹہلنے لگے۔ وہ ایک کافی ہاؤس کے سامنے سے گزرے۔ جس کے اندر سے آنے والی کافی کی خوشبو بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ پھر وہ پوروباشی تھیٹر کے سامنے کچھ دیر کھڑے ان جاپانی لڑکے اور لڑکیوں کو دیکھتے رہے جو رنگ برنگے لباسوں میں ملبوس ایک دوسرے کے ہاتھ میں دیے تھیٹر کے اندر جا رہے تھے پھر وہ مٹسوبیشی بینک کے سامنے کچھ دیر کھڑے رہے۔ اس کے بعد وہ پھر موناڈ کو سینٹر کے سامنے پہنچ گئے۔

''اب وقت آ گیا ہے۔'' کرائس نے اپنی کلائی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''سب سے پہلے میں اندر جا

کر کسی ایسی مشین پر کھیلنا شروع کر دوں گا جو عین دروازے کے سامنے لگی ہوئی ہو۔ تم اندر آ کر اس لڑکی کے بارے میں کسی سے معلوم کرنا میں تمہیں دیکھتا رہوں گا اور وہاں کسی بھی حال میں اس ہال کو چھوڑ کر کسی کمرے میں مت جانا۔ اگر کوئی لے جانا چاہے تو انکار کر دینا میرا مطلب ہے کہ تم مجمع کے درمیان ہی رہنا، سمجھ گئیں۔''

شیری نے اپنی گردن ہلادی۔ اب اس کے گھبراہٹ کسی حد تک ختم ہو گئی تھی۔ نہ جانے کیوں عین وقت پر اس کا حوصلہ بے دار ہو گیا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی جیسے آنے والے وقت نے اس کے اعصاب کو منتشر کرنے کی بجائے پرسکون کر دیا ہو۔ اس کے خیال میں آدمی جب مصیبت میں گھر ہی جائے تو وہ اپنے آپ کو قابو میں کر ہی لیتا ہے۔

کرائس اس سے رخصت ہو کر مونا ڈو سینٹر کی طرف بڑھ گیا۔ شیری اسے شیشے کے دروازے سے اندر جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ اس کے جانے کے بعد وہ تنہا ہو گئی تھی اور تنہائی اپنے ساتھ خوف کی آسیب بھی لایا کرتی ہے۔ پھر اچانک یوروباشی تھیٹر کا شو ختم ہوا اور لوگوں کی ایک بھیڑ اس تھیٹر سے باہر آ گئی۔ شیری اس بھیڑ کے درمیان پھنس کر رہ گئی تھی۔ لوگ اس سے ٹکراتے اور معذرت کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور وہ اس ریلے کی زد میں آ کر اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ اس نے زور زور سے کرائس کو آوازیں دیں۔ لیکن وہاں اس کی طرف توجہ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ پھر اچانک کسی نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں اس وقت مدد کی ضرورت ہے۔'' ہاتھ پکڑنے والے نے کہا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک امریکن تھا جس نے بروقت اسے سنبھال لیا تھا۔ وہ ایک جوان العمر آدمی تھا۔ جس کی آنکھیں اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔

''میں اب ٹھیک ہوں۔'' شیری نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

اس آدمی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ شیری نے اس مجمع سے نکلنے کی بجائے اس ریلے میں بہہ جانا مناسب سمجھا اس کا رخ اب مونا ڈو سینٹر کی طرف تھا۔ پھر اسے یہ ہوش نہیں رہا کہ وہ کسی طرح شیشے کے دروازے کے ذریعے اس ہال میں پہنچ گئی۔ اندر آ کر اسے احساس ہوا کہ وہ اجنبیوں کے درمیان گھری ہوئی ہے۔ یہاں موجود وہ ایک غیر ملکی لڑکی ہے اور بے شمار لوگوں کی چبھتی ہوئی نگاہیں اس پر لگی ہوئی ہیں۔ اس ہال میں بے شمار مشینیں لگی ہوئی تھیں اور بے شمار لوگ پانچکلو کھیلنے میں مصروف تھے اس نے ادھر ادھر دیکھا کرائس کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ وہ کچھ دیر تک دہشت کے عالم میں کھڑی رہی پھر دھیرے دھیرے لوگوں کے درمیان بڑھنا شروع کر دیا۔ کرائس نے کہا تھا کہ وہ اس پر دھیان دیتا رہے گا۔ وہ اسے نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دے گا۔ لیکن اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔

پھر شیری نے ایک ایسی عورت کو دیکھا جو نیلے رنگ کی وردی میں ملبوس مشینوں کے درمیان گھومتی پھر رہی تھی۔ وہ شاید انتظامیہ سے تعلق رکھتی تھی۔ شیری لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔

''میں آئی ساکو کی تلاش میں ہوں۔'' شیری نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے خدشہ تھا کہ شاید یہ عورت انگریزی نہیں جانتی ہوگی۔ لیکن وہ انگریزی جانتی تھی۔

''کیوں تم آئی ساکو کو کیوں تلاش کر رہی ہو؟''

اس عورت نے اس پر اپنی نگاہیں جماتے ہوئے پوچھا۔

''وہ مجھے جانتی ہے۔'' شیری نے جواب دیا۔ ''اس نے مجھ ملنے کا وقت دیا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس عورت نے اپنی گردن ہلادی۔

''میں ابھی بلاتی ہوں۔''

وہ شیری کو اسی جگہ کھڑے رہنے کی ہدایت دے کر ایک طرف چلی گئی۔ شیری نے اس کے جانے کے بعد ایک بار پھر کرائس کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ وہ ہال لوگوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ ہارنے والے افسوس کی صدائیں بلند کرتے اور کامیاب ہونے والے جذباتی نعرے لگاتے۔ کچھ دیر بعد وہ عورت ایک خوب صورت سی جاپانی لڑکی کو لے کر شیری کے پاس پہنچ گئی۔ اس جاپانی لڑکی نے بہت خوب صورت لباس اور کانوں میں چمکتے ہوئے بندے پہن رکھے تھے۔ وہ شیری کو دیکھ کر مسکرادی۔

''یہی آئی ساکو ہے۔'' پہلی عورت نے شیری سے مخاطب ہوکر بتایا۔ ''تم اس سے کیوں ملنا چاہتی تھیں۔''

''ہیلو۔'' شیری نے اس خوب صورت لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ ''میں شیری ہوں شیری جونز۔''

اس لڑکی نے نہ سمجھنے والے انداز میں اپنی گردن ہلادی وہ کچھ پریشان سی ہوگئی تھی۔

''یہ انگریزی نہیں جانتی۔'' پہلی عورت نے شیری کو بتایا۔

''کیا۔'' شیری یہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اس نے تو مجھے گیارہ بجے یہاں آنے کے لیے کہا تھا۔''

پہلی عورت نے شیری کی بات کا ترجمہ کر کے لڑکی کو بتایا، وہ لڑکی انکار کے انداز میں جلدی جلدی اپنی گردن ہلانے لگی۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' پہلی عورت شیری سے مخاطب ہوئی۔ ''جب یہ انگریزی جانتی ہی نہیں ہے تو پھر تمہیں کیسے فون کرسکتی ہے۔''

''کیا اس کے علاوہ بھی آئی ساکو نام کی کوئی عورت تمہارے یہاں کام کرتی ہے؟'' شیری نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس عورت نے جواب دیا۔ ''اس کے علاوہ یہاں اور کوئی آئی ساکو نہیں ہے۔''

یہ ملاقات ختم ہوگئی۔ شیری کے لیے سوائے حیرت کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ جاپانی لڑکی شیری کی طرف دیکھ کر اپنے روایتی انداز میں آگے کی طرف جھکی اور مسکراتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔ شیری اس عورت کا شکریہ ادا کر کے دروازے کی طرف بڑھ گئی جہاں کرائس بھی اس سے آملا تھا۔

دوسری صبح کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ وہی زمین ویسا ہی آسمان اور ویسی ہی زندگی کی مصروفیات۔ رات کے واقعات دھند کی طرح دھوپ پھیلنے کے بعد غائب ہوگئے تھے اور ان لوگوں کو اپنے پروگرام کے مطابق ہانگ کانگ پرواز کر جانا تھا۔ ان دونوں کو پہنچانے کے لیے کرائس بھی ایئرپورٹ تک آیا تھا۔ وہ ان دونوں کو رخصت کرتے وقت کچھ اداس معلوم ہو رہا تھا۔ جبکہ ڈیوٹی ہانگ کانگ دیکھنے کے خیال سے بہت پرجوش اور خوش ہو رہا تھا۔

ایئرپورٹ کے لاؤنج میں ان کی ملاقات بوڑھی سوزن سے بھی ہوگئی۔ جو خود بھی اسی طیارے کے ذریعے پرواز کر رہی تھی۔ وہ شیری کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ شیری نے کرائس کا تعارف بھی اس سے کروادیا۔

ایک ملک سے دوسرے ملک میں سفر کرتے ہوئے شیری کو سفری الجھنوں سے زیادہ کاغذی کارروائیوں کی الجھنیں پریشان کر دیتی تھیں۔ پاسپورٹ، انٹری، ہیلتھ سرٹیفکیٹ، ایئرلائن کے ٹکٹ، ان کی چھان بین، تصدیق اور نہ جانے کیا کیا۔ یہ سارے لوازمات اسے پریشان کر دیا کرتے تھے۔ لیکن سفر کرنے کے لیے یہ سب بھی ضروری تھا۔

کچھ دیر بعد طیارے کی روانگی کا اعلان ہونے لگا۔ جدائی قریب آگئی تھی۔ شیری نے محسوس کیا کہ اس موقع پر کرائس اس سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ کوئی ایسی بات جو اس کے دل میں چھپی ہوئی تھی۔ لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکا اور وہ سب ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ اس وقت کرائس کی آنکھوں کی اداسی اور بڑھ گئی تھی اور اس کا ہاتھ بڑے مشینی انداز میں ڈیوٹی اور

شیری کو الوداع کہہ رہا تھا۔
جہاز نے پرواز کی اور جاپان کی جادوئی سرزمین ان کی نگاہوں سے اوجھل ہونے لگی۔ خوب صورت باغات، بھرے پرے شہر، چاولوں کے کھیت اور مندروں کے عکس رفتہ رفتہ معدوم ہوتے چلے گئے۔ جاپان کے مشہور فیوجی یاما پہاڑ کی برف زدہ چوٹیاں لمحے بھر کے لیے چمکیں پھر وہ بھی بوجھل ہوگئیں۔ اب ہر سمت بادل پھیلے ہوئے تھے اور جہاز ان بادلوں کے اوپر سے پرواز کر رہا تھا۔
اس وقت اسے کرائس یاد آ گیا۔ اس کی آنکھیں یاد آ گئیں، اس نے محسوس کیا کہ جیسے ان آنکھوں کی اداسی نے پورے جہاز کو اپنے حصار میں لے لیا ہو۔ پھر عقبی سیٹ سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ بوڑھی سوزن اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

طیارہ رات تین بجے ہانگ کانگ کے کائی ٹیک ایئرپورٹ پر اتر گیا۔
اس ایئرپورٹ کی کوئی بات بھی دوسرے بین الاقوامی ایئرپورٹوں سے مختلف نہیں تھی۔ سب کچھ ایک ہی جیسا ہوا کرتا ہے۔ ویسی ہی جگمگاتی ہوئی عمارتیں۔ طیاروں کا شور، گاڑیوں کی آمد و رفت اور ایئر ہوسٹوں کی آمد و رفت کسٹم حکام کی مستعدی۔ کاغذات اور سامان کی جانچ پڑتال۔ مختلف ملکوں کے سیاحوں کی ریل پیل۔ یہ سب ہی کچھ بین الاقوامی ایئرپورٹوں پر دیکھنے میں آیا کرتا تھا۔ ہانگ کانگ کا کوئی ٹیک بھی اس سے مبرا نہیں تھا۔
ڈیوٹی اور شیری اپنا اپنا بیگ اپنے ہاتھ میں اٹھائے اس لائن میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ جو پاسپورٹ اور دیگر کاغذات کی جانچ پڑتال کے لیے لگائی تھی۔ کاؤنٹر پر یونی فارم میں ملبوس لوگ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ آنے والوں کے کاغذات کو دیکھ کر ان کے پاسپورٹوں پر ویزا کی مہر رسید کر رہے تھے۔ شیری نے دیکھا کہ بوڑھی سوزن اسی لائن میں ان سے کچھ پیچھے کھڑی تھی اس کے اور ان دونوں کے درمیان دو افریقی کھڑے ہوئے تھے۔
کاؤنٹر پر پہنچ کر شیری نے اپنا اور ڈیوٹی کا پاسپورٹ وردی میں ملبوس امیگریشن آفیسر کی طرف بڑھا دیا۔ آفیسر نے شیری کے پاسپورٹ پر ایک نظر ڈالی پھر جلدی سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔
”پلیز آپ ذرا ایک طرف کھڑی ہو جائیں۔“
شیری نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ آفیسر اب اس کے پیچھے کھڑے ہوئے افریقی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ شیری نے ڈیوٹی کا ہاتھ پکڑا اور قطار سے نکل کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا گیا ہے۔ لیکن ان لوگوں سے کچھ معلوم کرنے کا فائدہ بھی نہیں تھا۔
مسز سوزن بھی اسی قطار میں چلتی ہوئی شیری کے سامنے پہنچ گئی۔ اس نے شیری کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”کیا بات ہے؟ تم دونوں کیوں کھڑے ہو۔“
”پتہ نہیں، ہمیں کیوں روک لیا گیا ہے۔“ شیری نے جواب دیا۔ مسز سوزن نے اپنا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات آفیسر کے حوالے کر دیے۔ شیری بے شمار سوالات اور الجھنوں کے درمیان کھڑی رہی تھی۔ مسز سوزن کو بھی فارغ کر دیا گیا۔ مسز سوزن کو رخصت کرنے کے بعد امیگریشن آفیسر نے اپنی کرسی پر ایک دوسری باوردی شخص کو بٹھایا اور خود کاؤنٹر کی پچھلی طرف سے گھوم کر شیری کے پاس آ گیا۔
”آیئے مس شیری۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”میرے ساتھ آئیں۔“
ڈیوٹی نے شیری کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ دونوں آفیسر کے پیچھے پیچھے اس ہال سے نکل کر ایک طویل کوریڈور میں پہنچے۔ پھر وہ انہیں ایک کمرے کے دروازے پر لے آیا۔ اس کمرے کے دروازے پر کسی قسم کی تختی نہیں لگی تھی۔ اس آفیسر نے آگے بڑھ کر شیری کے لیے دروازہ کھول دیا۔
”آیئے۔“ اس نے اشارہ کیا۔ شیری اور ڈیوٹی

نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا پھر شیری ڈیوٹی کا ہاتھ تھامے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئی۔

یہ کوئی دفتر تھا۔ اس میں رکھا ہوا فرنیچر زیادہ قیمتی تو نہیں تھا لیکن دفتر کی ضروریات کو پورا کر رہا تھا۔ دیوار پر بھی ہانگ کانگ کا ایک بڑا سا نقشہ تھا۔ اور اسی دیوار کے آگے ایک بڑی سی میز بچھی ہوئی تھی۔ جس پر فائلیں رکھی تھیں۔ اس میز کے عقب میں جو کرسی تھی اس پر ایک چینی بیٹھا ہوا تھا، جو انہیں کمرے میں آتے دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ تکونا سا تھا اور اس کی آنکھیں بے حد چمکدار تھیں جو اس کے ذہین ہونے کا پتا دے رہی تھیں۔

''تشریف رکھیں۔'' اس نے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ شیری اور ڈیوٹی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''میں سارجنٹ جون ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔ ''میرا تعلق سینٹرل انٹیلی جینس سے ہے۔''

اس کی انگریزی بہت اچھی تھی اور اس کا لہجہ بھی صاف تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے یورپ میں تعلیم حاصل کی ہو۔ اس نے میز پر رکھا ہوا شیری کا پاسپورٹ اٹھا کر دیکھا پھر شیری سے مخاطب ہوا۔

''ہماری اطلاعات کی مطابق آپ آٹھ بج کر پینتالیس منٹ پر ٹوکیو پہنچی تھیں۔ آپ ہونالولو سے آئی تھیں اور آپ نے ہوٹل نیو جاپان میں قیام کیا تھا۔ آج صبح آپ نے ہانگ کانگ آنے کے لیے پرواز کی۔ آپ کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔ آپ ایک تعمیراتی فرم میں سیکریٹری ہیں۔ ہونا کیوبا میں پیدا ہوئیں اور آپ کی شہرت امریکی ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔''

''ہاں ٹھیک تو ہے۔ لیکن بات کیا ہے آپ مجھ سے یہ سب کیوں معلوم کر رہے ہیں۔''

''کیا آپ کرائس ہرنکسٹن سے واقف ہیں۔''

''کرائس سے..... ہاں واقف ہوں؟ کیوں کیا ہوا اسے۔''

''میری بات کا جواب دیں کرائس کہاں ہے؟''

''میرے خیال میں اس وقت وہ فارموسا میں ہوگا۔''

''ہوں۔ کیا آپ جانتی ہیں کہ وہ کس ہوٹل میں قیام کرے گا۔''

''نہیں یہ میں نہیں جانتی مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ وہ کل ہانگ کانگ آنے والا ہے۔''

''کس ایئر لائن سے آ رہا ہے۔''

''بی اے ایس سے۔'' شیری نے جواب دیا۔

''آپ اس سے کتنے دنوں سے واقف ہیں؟''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟''

''میرے سوال کا جواب دیں مس شیری۔ آپ سے اس کی واقفیت کتنی پرانی ہے؟''

''دس دنوں پہلے میری اس سے مونا کوٹو میں ملاقات ہوئی تھی۔''

''ہوں۔'' وہ ایک گہری سانس لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''اب یہ بتائیں کہ کیا آپ ٹوکیو کی کسی مس آئی ساکو سے واقف ہیں۔''

شیری سناٹے میں رہ گئی۔ اس شخص کو اس پراسرار آئی ساکو کے بارے میں کس طرح معلوم ہو سکا تھا۔

''جواب دیں مس شیری۔ کیا آپ ٹوکیو میں آئی ساکو کو جانتی ہیں؟''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ سے کس قسم کے سوالات کیے جا رہے ہیں۔ ان کا مقصد کیا ہے۔ اگر آپ مجھے نہیں بتائیں گے تو میں اپنے کونسلیٹ سے رجوع کروں گی۔''

''آپ کے کونسلیٹ سے ایک آفیسر آنے ہی والا ہے مس شیری۔'' جون نے کہا۔ ''ہماری اطلاع کے مطابق آپ نے ٹوکیو میں آئی ساکو نام کی خاتون سے ملاقات کی تھی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آپ کو بتا دیتی ہوں کہ میں آئی ساکو سے ملنے کس طرح پہنچی تھی۔'' اتنا کہہ کر شیری نے دھیرے دھیرے اسے فون آنے سے لے کر مونا کو میں آئی ساکو نامی اس جاپانی لڑکی سے ملنے کا واقعہ بتایا جو انگریزی نہیں جانتی تھی۔ ''بس اتنی سی بات ہے۔ میں اس لڑکی کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی۔''

اسی وقت ایک اور آدمی کمرے میں داخل ہو گیا یہ شاید وہی آفیسر تھا۔ جس کے بارے میں بون نے بتایا تھا۔ وہ ایک دراز قامت اور وجیہہ شخص تھا۔ گزرتی ہوئی عمر نے بھی اس کے نقوش مدھم نہیں کیے تھے۔ وہ بون سے ہاتھ ملانے کے بعد بون کی ساتھ والی کرسی پر بڑی بے تکلفی سے بیٹھ گئے۔ شیری اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''مس شیری۔'' وہ امریکی شیری سے مخاطب ہوا۔ ''میں مائیکل کین ہوں۔ میرا تعلق اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی سیکوریٹی سے ہے۔''

بون نے میز پر رکھا ہوا ایک کاغذ اٹھا کر مائیکل کی طرف دیکھا۔ ''مجھے اندازہ ہے مس شیری کہ آپ اس وقت کتنی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ آپ تو سیاح ہیں نا؟''

''ہاں۔'' شیری نے برا سا منہ بناتے ہوئے اپنی گردن ہلائی۔

''ہانگ کانگ میں کتنے دن رکنے کا ارادہ ہے؟'' مائیکل نے پوچھا۔ اس نے شیری کے غصے کو محسوس کر لیا تھا اسی لیے جلدی سے بولا۔ ''معاف کیجئے گا مس شیری۔ آپ کو یقیناً برا لگ رہا ہوگا اور آپ ناراض ہو رہی ہوں گی۔ لیکن یہ سب جاننا ضروری ہے۔ کیا آپ نے امریکا میں کسی فارماسوٹیکل فرم میں ملازمت کی تھی؟''

''میرا خیال تھا کہ آپ میری مدد کے لیے آئے ہوں گے۔'' شیری تلخ ہو کر بولی۔ ''قونصل خانہ تو شہریوں کی مدد کیا کرتا ہے۔''

''پلیز سوال کا جواب دیں مس شیری۔'' مائیکل نے کہا۔ اس کا لہجہ قطعی تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسے شیری کے جذبات یا غصے کی پروا نہ ہو۔ وہ اپنا فرض پورا کرنا چاہتا ہو اور جس کام کے لیے اسے بھیجا گیا تھا اس کا مکمل کرنے کا اس نے پورا ارادہ کر رکھا ہو۔

''نہیں۔'' شیری نے اپنی گردن ہلا دی۔ ''میں نے ایسی کسی فرم میں کبھی ملازمت نہیں کی۔''

''کیا آپ کبھی کمبوڈیا میں رہی ہیں۔''

''ہاں ایک بار میری فرم نے مجھے وہاں بھیجا تھا۔'' شیری نے جواب دیا۔

''کیا آپ کبھی گرفتار ہوئی ہیں؟''

''کبھی نہیں لیکن آج ایسا لگتا ہے جیسے مجھے گرفتار کر لیا گیا ہو۔''

مائیکل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ بون سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''بس مجھے یہی معلوم کرنا تھا۔''

''ہوں۔'' بون نے ہنکاری لی پھر شیری کی طرف دیکھا۔ ''آپ ہانگ کانگ میں کہاں ٹھہریں گی؟''

''گرانڈ ہوٹل میں۔'' شیری نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ لیکن شہر چھوڑنے سے پہلے آپ ہمیں بتا دیں گی۔''

''اگر آپ چاہیں تو مجھ سے بھی رابطہ قائم کر سکتی ہیں۔'' مائیکل نے مداخلت کی۔ ''میں آپ کو قونصل خانے میں ملوں گا۔''

''لیکن یہ سب کیا ہے۔'' شیری نے الجھتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھ سے یہ سب کیوں پوچھا گیا۔ کچھ تو بتائیں آپ لوگ۔''

''ٹھیک ہے۔'' بون نے ایک گہری سانس لی۔ ''آپ کو بتا دینا ہی بہتر ہے۔ آپ نے ٹوکیو میں آئی ساکو نامی ایک لڑکی سے ملاقات کی تھی۔ آپ کی ملاقات کے فوراً بعد اسے اس کے کمرے میں قتل کر دیا گیا ہے۔ اس کے جسم سے جو گولی برآمد کی گئی

ہے وہ امریکی ساخت کی ہے۔''

شیری کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کمرہ گھومنے لگا ہو۔ اس نے بڑی مضبوطی سے کرسی کے ہتھے کو پکڑ لیا۔ وہ اس جاپانی لڑکی کو نہیں جانتی تھی۔ لیکن اس کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے رقص کر رہا تھا۔ بھولا بھالا معصوم چہرہ جس نے ابھی دنیا کے تجربات بھی حاصل نہیں کیے تھے۔

شیری اور ڈیوٹی کے کمرے سے جانے کے بعد مائیکل کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے یہ لڑکی بہت اچھی معلوم ہوئی تھی۔ یہ اس کی بیوی میرین کی طرح تھی۔ میرین اتنی زیادہ خوب صورت تو نہیں تھی۔ لیکن وہ بھی اس لڑکی کی طرح باوقار اور خوش لباس تھی پھر دونوں کی گفتگو کا انداز بھی ایک ہی جیسا تھا۔

''کیا خیال ہے تمہارا اس لڑکی کے بارے میں؟'' بون نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے تو یہ ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے۔'' مائیکل نے جواب دیا۔

''معصوم لڑکی ہے۔''

''تم امریکیوں کی یہی بات بہت اچھی ہے کہ وہ پہلے ہر ایک کو معصوم قرار دے دیتے ہیں۔ جبکہ ہم پہلے ہر ایک کو مجرم سمجھتے ہیں اس کے بعد تحقیق کی جاتی ہے۔''

''میں اس کے بارے میں FBI سے بھی رابطہ قائم کروں گا۔'' مائیکل نے کہا۔

''کرائسس کے آنے کے بعد صورت حال اور واضح ہو جائے گی۔'' بون نے ایک سگریٹ جلالی۔ ''اگر وہ کل ہانگ کانگ آیا تو تم بھی آ جانا۔''

''میں تو یہی کہنے والا تھا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ نہ جانے تم کیا خیال کرو۔''

''میں کیا خیال کروں گا۔'' بون مسکرایا۔ ''میں تو تمہیں کام کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ویسے تم یہ بتاؤ تمہارے بچوں کا کیا حال ہے؟''

بچوں کے ذکر پر مائیکل کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''دونوں بدمعاش ٹھیک ہیں۔'' اس نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن ٹومی تھائی بنتا جا رہا ہے۔ انگریزی جانتا ہی نہیں مارگی کچھ ٹھیک ہے۔ کسی حد تک انگریزی بول لیتی ہے۔''

مائیکل کی بیوی میرین اور اس کے دونوں بچے بنکاک میں رہتے تھے۔ مائیکل مشرق بعید کے سات ملکوں میں اپنے ملک کے لیے خدمات انجام دیا کرتا تھا۔ ان ممالک میں سری لنکا، برما، تھائی لینڈ، لاؤس، کمبوڈیا، ویت نام اور ہانگ کانگ شامل تھے۔ اس نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنکاک میں بنا رکھا تھا۔ اس کی زندگی اتنی تیز رفتار ہو گئی تھی کہ خود اسے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ صبح اگر ہانگ کانگ میں ہے تو شام کو کس جگہ ہو گا۔ اس کی ذمہ داری یہی تھی کہ وہ امریکی شہریوں کی مدد کرے، جو ان سات میں سے ایک ملک میں آ کر پکڑے جائیں۔ یہ لڑکی شیری بھی مشکوک لوگوں کی فہرست میں آ گئی تھی۔ اور اس کے بارے میں تحقیقات کا آغاز ہانگ کانگ سے ہوا تھا اسی لیے اسے خاص طور پر یہاں بلایا گیا تھا۔

بوڑھی سوزن کوریڈور میں کھڑی ان کے آنے کا انتظار ہی کر رہی تھی۔

وہ شیری اور ڈیوٹی کو کمرے سے باہر آتے دیکھ کر جلدی سے ان کے پاس پہنچ گئی۔

''کیوں خیر تو ہے۔'' اس نے بے تاب ہو کر پوچھا۔ ''کیا بات ہو گئی تھی؟''

''کوئی خاص بات نہیں تھی۔ شکاگو والے ویزے کی مہر لگانی بھول گئے تھے۔'' شیری نے جواب دیا۔

''چلو ٹھیک ہے۔'' مسز سوزن نے مطمئن ہو کر اپنی گردن ہلا دی۔ ''تم کس ہوٹل میں ٹھہرو گی؟''

''گرانڈ میں۔''

''میں میرا سر میں ہوں۔ اچھا اب مجھے اجازت دو۔''

سوزن کے جانے کے بعد ڈیوٹی نے اپنی گردن اٹھائی اور بڑے معصوم لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے

کہ میری عمر کے بچوں کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے جبکہ تمہاری عمر والوں کے لیے یہ جائز ہے کیوں۔''

شیری اس وقت اتنی الجھی ہوئی تھی کہ اس نے ڈیوٹی کی بات پر کچھ نہیں کہا۔ اسے رہ رہ کر اس جاپانی لڑکی کا خیال آ رہا تھا کہ وہ کون تھی۔ اسے کیوں قتل کیا گیا تھا پھر اس کے قتل سے اس کا اور کرائس کا کیا تعلق تھا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ کسی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''کیا آپ ہی مس شیری جونز ہیں؟''

شیری نے اس آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک چینی ہی تھا۔ جس کے ہونٹوں پر بڑی دھیمی مسکراہٹ رچی ہوئی تھی۔

''میں گرانڈ ہوٹل سے آپ کو لینے کے لیے آیا ہوں۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''میرے ساتھ آیئے۔''

شیری نے ڈیوٹی کا ہاتھ پکڑا اور اس آدمی کے ساتھ ہولی۔ سیڑھیوں کے پاس ہی ایک اسٹیشن ویگن کھڑی تھی۔ شیری یہاں آ کر ٹھٹک سی گئی۔ اس کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ یہ آدمی گرانڈ ہوٹل ہی سے آیا ہوگا۔ یہ کوئی اور بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے تو ٹوکیو میں بھی جال بچھایا گیا تھا۔

''کیا بات ہے آپ رک کیوں گئیں؟'' اس آدمی نے بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔

شیری نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے برابر سے گزرتی ہوئی ایک ایئر ہوسٹس کو آواز دے کر روک لیا۔ وہ ایئر ہوسٹس سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''معاف کیجئے۔ میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ یہ گاڑی گرانڈ ہوٹل ہی کی ہے؟'' شیری نے اسٹیشن ویگن کی طرف اشارہ کیا۔

''سو فی صد۔'' ایئر ہوسٹس مسکرا دی۔ ''میں اس آدمی کو پہچانتی ہوں۔''

شیری نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ ایئر ہوسٹس مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد یہ دونوں اسٹیشن ویگن میں آ کر بیٹھ گئے۔

اب ہانگ کانگ کا فلمی شہر ان کے سامنے تھا۔ دونوں طرف اونچے اونچے مکان۔ مکانوں کی بالکونیوں پر لہراتے ہوئے رنگ برنگے کپڑے۔ چینی طرز کی چھوٹی چھوٹی دکانیں اور فٹ پاتھوں پر آتی جاتی ہوئی چینی عورتیں۔ رکشاؤں کا ہجوم اور ان کے علاوہ فضا میں پھیلی ہوئی ایک ایسی بو جو صرف ہانگ ہی سے مخصوص ہو سکتی ہے۔

ہوٹل کے کاؤنٹر پر اسے ایک لفافہ دے دیا گیا۔ یہ لفافہ اس کے انکل ڈین نے بھیجا تھا اور اس کے ہانگ کانگ آنے سے پہلے وہ لفافہ یہاں پہنچ چکا تھا۔ شیری اس لفافے کو لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ان دونوں کے لیے تیسری منزل کا ایک کمرہ مخصوص کیا گیا تھا۔ اس کمرے کی کھڑکی ہانگ کانگ کی فلک بوس عمارتیں صاف دکھائی دیتی تھیں۔

نہانے کے بعد ان کی سفری تھکن اتر گئی تھی۔ کافی پی لینے کے بعد شیری نے لفافہ چاک کیا۔ اس کی اندر انکل ڈین نے ایک خط کے ساتھ سو ڈالر کا ایک نوٹ بھی رکھ دیا تھا تاکہ شیری ہانگ کانگ میں کچھ خریداری کر سکے۔ شیری کو اس لمحے انکل ڈین کا خلوص بہت بھلا محسوس ہوا تھا۔

ڈیوٹی کو بستر پر لٹانے کے بعد شیری کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہوئی اس کے پاس ہانگ کانگ کا ایک مکمل نقشہ بھی موجود تھا۔ جس کے مطابق گرانڈ ہوٹل کولون سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ناتھن، روڈ پر ہر قسم کی خریداری کی جا سکتی تھی۔ شیری کو معلوم تھا کہ ہانگ کانگ کا یہ علاقہ دنیا بھر کے سیاحوں سے ہر وقت بھرا رہتا تھا۔

وہ رات آرام سے گزر گئی۔ دوسری صبح وہ دونوں تیار ہو کر ہوٹل سے باہر آ گئے۔ جہاں رکشہ اسٹینڈ پر بے شمار رکشہ کھڑے تھے۔ ان رکشاؤں پر سرخ رنگ کے پردے لہرا رہے تھے اور ان کو کھینچنے والے دبلے پتلے چینی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹیں سجائے سواریوں کا انتظار کر رہے تھے۔ ان دونوں نے بھی اپنے لیے ایک رکشہ منتخب کر لی۔ ڈیوٹی کو

رکشے کی سواری میں بہت لطف آ رہا تھا۔ لیکن شیری جانتی تھی کہ اس بوجھ نے اس شخص کو اندر سے کس قدر کھوکھلا کر دیا ہوگا۔

ناتھن روڈ بہت ہی بارونق جگہ ثابت ہوئی تھی۔ خوب صورت درخت، جدید طرز کی دکانیں، روسی ریستوران، دو منزلہ بسیں، پھولوں کی مارکیٹ، چینی ٹریفک افسران، دکانوں پر فروخت ہوتی ہوئی کشمیری شالیں اور ہندوستانی ساڑھیاں۔ یہاں شیری نے اپنے اور ڈیوٹی کے لیے ایک ایک سوٹ بھی خریدا۔

یہاں کی فٹ پاتھ پر انتارش تھا کہ کندھے سے کندھا چھل رہا تھا۔ خریداری کرنے والوں میں زیادہ تر یورپی مرد اور عورتیں تھیں۔ چینی دکاندار اپنی اشیاء کے بارے میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے اور مہنگے داموں چیزیں فروخت کر دیتے۔ ان دونوں کے سامنے عجائبات کی ایک رنگین دنیا آباد تھی۔

پھر اچانک شیری کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے دھکا دیا ہو۔ وہ ابھی سنبھلنے بھی نہیں پائی تھی کہ اس کے ہاتھ سے اس کا پرس چھین لیا گیا۔ اس نے پرس چھیننے والے کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک جوان العمر چینی لڑکا تھا جو پرس چھیننے کے بعد تیزی سے ایک طرف دوڑا جا رہا تھا۔ شیری نے بھی ڈیوٹی کا ہاتھ پکڑا اور اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ شیری کو احساس تھا کہ وہ نوجوان دوڑتا ہوا اس دکان میں داخل ہوا ہے۔ وہ بھی اس دکان میں داخل ہوگئی۔

اس دکان میں روشنی زیادہ نہیں تھی۔ اس کے علاوہ کچھ گھٹن بھی ہو رہی تھی۔ شیری اور ڈیوٹی کو دیکھ کر ایک بوڑھا چینی کسی طرف سے نکل کر سامنے آ گیا اور چندھی چندھی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''ایک نوجوان میرا پرس چھین کر اس دکان میں داخل ہوا ہے۔'' شیری نے بتایا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ محترم خاتون کیا کہہ رہی ہیں۔'' بوڑھے چینی نے کہا۔ ''لیکن اتنا ضروری جانتا ہوں کہ جیسے قالین میں فروخت کرتا ہوں۔ ویسے قالین آپ کو پورے ہانگ کانگ میں نہیں ملیں گے۔ آپ دیکھ سکتی ہیں۔ دیواروں پر ہر قسم کے قالین لٹکے ہوئے ہیں۔''

''مجھے قالین نہیں خریدنے، میں یہ کہہ رہی ہوں کہ ایک آدمی میرا پرس چھین کر فرار ہو گیا ہے اور میں نے اسے اس دکان کی طرف آتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''اچھا اچھا۔'' بوڑھے دکاندار نے اپنی گردن ہلائی۔ ''اس قسم کے واقعات ہانگ کانگ میں بہت عام ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ چور کسی اور طرف نکل گیا ہو۔ خیر آپ بیٹھیں، میں آپ کے لیے ابھی پولیس کو بلا کر لاتا ہوں۔ حالانکہ یہ میرا کام نہیں ہے۔ لیکن مجھے یہ سن کر دکھ ہوا ہے۔''

شیری قالینوں کے انبار پر نڈھال ہو کر بیٹھ گئی۔

پرس چھین جانے کے بعد وہ حواس باختہ ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس پرس میں رقم تو زیادہ نہیں تھی لیکن ان کے پاسپورٹ اور ٹکٹ دونوں اسی پرس میں موجود تھے۔ ان کے علاوہ ایک مہر بند لفافہ بھی تھا۔ یہ لفافہ اسے پاکستان میں اپنی تعمیراتی فرم کو پہنچانے کے لیے دیا گیا تھا۔ یقیناً اس لفافے میں ایسے کاغذات تھے جن کی بناء پر اس لفافے کو ڈاک سے بھیجنے کے بجائے انتہائی تاکید کے ساتھ شیری کے حوالے کیا گیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ اس لفافے کے غائب ہو جانے کے بعد اس کی فرم کا ٹھیکا ہی منسوخ ہو جاتا۔ یا اس قسم کے کوئی اور بات بھی ہو سکتی تھی۔

چینی دکاندار کچھ دیر میں پولیس والوں کو لے کر آ گیا اور وہ لوگ رسمی سوال کر کے اور اسے تسلی دے کر واپس چلے گئے۔ وہ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔

ہوٹل واپس آ کر اس نے امریکی قونصل خانے میں فون کر کے انہیں صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ اس نے مائیکل کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ لیکن مائیکل ہانگ کانگ میں نہیں تھا اس سے کہا گیا کہ جب تک ہانگ کانگ کے حکام ان

پاسپورٹوں کی گمشدگی کی تصدیق نہ کیے جا سکتے۔ دشواری یہ بھی کہ یہ نہیں بتایا جا سکتا تھا کہ اس کام میں کتنی دیر لگ سکتی ہے۔ شاید ایک دن یا شاید ایک ہفتہ۔

ایئرلائن کے ٹکٹ کا مرحلہ دشوار نہیں تھا۔ انہوں نے شیری کو بتایا کہ دوسرے ٹکٹ جاری کرنا ان کے لیے بہت آسان ہے۔ وہ بس اپنے شکاگو آفس سے معلوم کریں گے اور دوسرے ٹکٹ جاری کر دیں گے اور یہ کام چوبیس گھنٹوں میں بھی ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں کام تو ہو سکتے تھے۔ لیکن اس لفافے کا کیا کیا جاتا۔ شیری کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا۔

شیری کے لیے وہ رات بہت پریشان کن تھی۔ اسے سائیگان کا رے یاد آ رہا تھا۔ اسے کرائس یاد آ رہا تھا۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی بھی اس کے قریب ہوتا تو وہ کتنا حوصلہ محسوس کرتی۔ اگر سہارا اور حوصلہ دینے والا کوئی قریب ہو تو پریشانیوں کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ پریشانیاں تو اپنی جگہ رہتی ہیں لیکن انہیں برداشت کرنے کی ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس نے ڈیوٹی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بستر پر گہری نیند سو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر شیری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی نہ جانے کیوں اسے اس بچے سے بے پناہ محبت ہو گئی تھی۔ ایسی محبت جو کسی ماں کو اپنی اولاد سے ہوا کرتی ہے۔ نہ جانے یہ محبت کیسا جذبہ ہوا کرتا ہے جو اجنبیوں کو بھی ایک دوسرے کی دھڑکنوں کے قریب کر دیتا ہے۔

اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ذہن پر جب بوجھ مسلط ہو تو آنکھوں سے نیند کا وہ طلسم ٹوٹ جایا کرتا ہے۔ پھر بھی اس نے بستر پر لیٹ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن ٹھیک اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے دیکھا کہ گھنٹی کی آواز سن کر ڈیوٹی نے نیند میں کروٹ بدل لی تھی۔ اس نے جلدی سے ریسیور اٹھا لیا۔

''ہیلو کون؟'' اس نے پوچھا۔

''جی میں شیری جونز سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' دوسری طرف سے کسی کی آواز آئی۔ یہ آواز زیادہ عمر والے شخص کی معلوم ہوتی تھی اور اس کا لہجہ بھی صاف نہیں تھا۔

''ہاں میں شیری جونز ہی بات کر رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیا تمہارا کوئی پرس گم ہوا ہے؟'' اس آواز نے پوچھا۔

''گم نہیں ہوا بلکہ چھین لیا گیا ہے۔ ایک چور اسے چھین کر بھاگ گیا ہے۔''

''ایک ہی بات ہے۔ بہرحال وہ پرس مجھے ملا ہے۔ اس کے اندر رقم نہیں تھی۔ کیا تم نے اس میں رقم رکھی تھی؟''

''اس کے اندر پاسپورٹ تھے۔ ایئرلائن کے ٹکٹ تھے اور۔''

''ہاں ہاں۔'' اس آدمی نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ''اس کی اندر دو پاسپورٹ ہیں۔ دو ٹکٹ ہیں اور ایک لفافہ ہے۔ کیا تم کچھ انعام دینا چاہتی ہو؟''

''انعام۔'' شیری نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے۔ انعام بھی مل جائے گا۔ بتاؤ کتنا چاہیے۔''

''تم بتاؤ۔''

''دس ڈالر۔''

''دس ڈالر ہرگز نہیں۔ میں اگر تمہارے دونوں پاسپورٹ بھیج دوں تو اچھی خاصی رقم مل جائے۔''

''دو سو ڈالر ہیں۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''فی پاسپورٹ سو ڈالر، ٹکٹ اور لفافہ مفت دے دوں گا۔''

دو سو ڈالر شیری نے دل ہی دل میں حساب لگانا شروع کر دیا۔ دو سو ہانگ کانگ ڈالر کا مطلب تھا۔ تیس ڈالر امریکی وہ یہ رقم ادا کر سکتی تھی۔

''ٹھیک ہے میں تمہیں دو سو ڈالر دے دوں گی۔'' اس نے فیصلہ کر لینے کے بعد کہا۔ ''تم میرے ہوٹل آ جانا۔''

''نہیں، نہیں ہوٹل نہیں تمہیں دانچائی پہنچنا ہو

گا۔ کسی سے معلوم کر لینا وہ تمہیں دانچائی بتا دے گا۔ تم یہاں پہنچ کر ٹن ہانگ اسٹریٹ پر چلنا شروع کر دینا۔ کل رات دس بجے کا وقت مناسب رہے گا۔ میں خود تم سے آملوں گا اور تمہارا پرس واپس کر دوں گا۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں ایک اجنبی اور ویران جگہ پر اکیلی چلتی رہوں گی۔''

''وہ کوئی ویران جگہ نہیں ہے۔ رات گئے تک وہاں لوگوں کا رش لگا رہتا ہے۔ ہزاروں آدمی ہوتے ہیں۔ اتنی روشنی ہوتی ہے جیسے دن کا وقت ہو۔ تمہارے لیے وہاں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ تم بڑے اطمینان سے وہاں آ سکتی ہو۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وقت یاد رکھنا۔ کل رات نو بجے اور ہاں تمہیں ایک بات سے آگاہ کر دوں۔ اگر تم پولیس کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں تو میرے آدمی تمہیں اور تمہارے ساتھ جو بچہ ہے اسے ہلاک کر دیں گے۔ سمجھ گئیں۔ تم دونوں کو گولی مار دیں گے۔ اسی لیے کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس دو سو ڈالر اپنے ساتھ لیتی آنا۔''

اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ شیری نے بھی ریسیور رکھ دیا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور ہانگ کانگ کا موسم سرد ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح اس نے پھر قونصل خانے فون کیا۔ اس بار مائیکل سے اس کی بات ہو گئی تھی۔ مائیکل نے اسے ناتھن روڈ پر ایک دکان کا پتا بتاتے ہوئے وہاں پہنچنے کی ہدایت کر دی۔ شیری ٹھیک دس بجے ڈیوٹی کے ساتھ اس دکان میں پہنچ گئی۔ یہ سجاوٹ کے سامان فروخت کرنے والی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ یہاں کاغذ کی جھنڈیوں سے لے کر کاغذ کے بنے ہوئے اژدہے تک فروخت ہوتے تھے۔ یہاں کے کاؤنٹر پر ایک چینی لڑکا بیٹھا تھا جو شیری کو دیکھتے ہی کاؤنٹر سے نکل کر اس کے پاس آ گیا۔

''اگر آپ مس شیری ہیں تو آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔'' اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔

شیری اور ڈیوٹی اس دکان کے عقبی کمرے میں آ گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اور یہاں ایک خستہ حال میز اور کچھ کرسیاں رکھی تھیں۔ مائیکل اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

''معاف کرنا مس شیری کہ میں نے آپ کو یہاں آنے کی زحمت دی۔'' مائیکل مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں نے احتیاطاً ایسا کیا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' شیری نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ڈیوٹی بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

مائیکل نے اس لڑکے کو بلا کر کافی لانے کے لیے کہہ دیا اور خود بھی ایک کرسی سنبھال لی۔

''ہاں اب بتائیں کیا بات ہے؟'' اس نے شیری کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

شیری نے اسے صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ مائیکل بڑی توجہ سے اس کی بات سنتا رہا تھا۔

''ہوں۔'' شیری کے خاموش ہو جانے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ تو عجیب بات بتائی آپ نے بہرحال میں ٹن ہانگ اسٹریٹ سے واقف ہوں۔ وہ واقعی بہت بارونق جگہ ہے۔ اس لیے جہاں تک اس جگہ کا سوال ہے تو وہاں آپ کو واقعی کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔'' شیری نے کہا۔ ''پرس بھی چھینا گیا تو میرا ہی چھینا گیا۔''

''یہ کوئی عام لوٹ مار والی واردات نہیں ہے مس شیری۔ یہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا اور کیوں ہوا ہے۔ یہ آپ ہی بہتر جان سکتی ہیں۔''

''میں کیا بتا سکتی ہوں۔'' شیری نے ایک گہری سانس لی۔

''کبھی کبھی میں یہ سوچتی ہوں کہ شاید میرے ساتھ یہ سارا چکر کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شیری جونز نامی کوئی اور عورت ہو جس کے لیے یہ سب

ہو رہا ہے۔ لیکن غلطی سے انہوں نے مجھے وہی شیری جونز سمجھ لیا ہو۔''

''ہوسکتا ہے۔'' مائیکل نے اپنی گردن ہلائی۔

''ممکن ہے کہ آپ اور وہ دوسری شیری جونز ایک ہی وقت میں ٹوکیو آئی ہوں۔ اس شیری جونز کی کسی مجرم نے خدمات حاصل کرلی ہوں۔ اور وہ غلطی سے آپ کے پیچھے پڑ گیا ہو۔ کیا آپ شکاگو کی کسی دوسری شیری جونز سے واقف ہیں۔''

''نہیں۔'' شیری نے جواب دیا۔ ''آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں ہر سوال کا جواب انکار میں دیتی ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں کسی دوسری شیری جونز کو نہیں جانتی۔''

''ہوسکتا ہے کہ یہ سب کچھ محض اتفاق ہو اور یہاں آپ کے برس جھپٹنے کا واقعہ بھی اتفاق ہی ہو۔''

''لیکن اس شخص کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں گرانڈ ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں۔'' شیری نے کہا۔ ''جب کہ میرے پرس میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے یہ پتا چل سکے کہ میں کہاں ٹھہری ہوں۔''

''ہوں۔'' مائیکل نے ایک گہری سانس لے کر اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے اپنی نگاہیں اٹھائیں اور دھیرے سے بولا۔ ''ایک امکان اور بھی ہے مس شیری..... دونوں واقعات کا انداز ایک جیسا ہے۔ ٹوکیو میں آپ کو ایک فون ملتا ہے اور ایک خاص جگہ پہنچنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی آپ کو کر کے ایک جگہ بلایا گیا ہے ہوسکتا ہے کہ ٹوکیو کی طرح یہاں بھی آپ مایوس ہوکر واپس آجائیں۔ یعنی کوئی بات نہ ہو۔ لیکن یہ سب کچھ کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہو۔ آپ کے گرد کوئی بڑا جال بنا جا رہا ہو اور کوئی اذیت پسند شخص آپ کو ذہنی اذیتیں دینا چاہتا ہو۔''

شیری لرز کر رہ گئی۔ مائیکل نے ایک امکان کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ایسے معلوم تھا کہ اس قسم کی ذہنی اذیتیں اپنی انتہا پر پہنچ کر قتل کے معاملات میں تبدیل ہو جاتے لیکن سوال وہی تھا کہ کوئی شخص ایسا کیوں کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ کسی کو ایسی دشمنی ہوگئی تھی۔

''اگر آج رات آپ وہاں جانا چاہتی ہیں تو آپ کی حفاظت کے لیے پولیس کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔'' مائیکل نے کہا۔ ''خطرہ تو بہرحال آپ ہی کو برداشت کرنا ہوگا۔ لیکن اس خطرے کی نوعیت ہو سکتا ہے کہ کچھ کم ہو جائے۔''

''مجھے وہاں جانا تو ہوگا۔'' شیری کرسی سے کھڑی ہوگئی۔ ''مجھے دونوں پاسپورٹ اور ٹکٹ واپس لینے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک خط بھی پرس میں موجود ہے۔ پھر میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ قصہ اپنے انجام تک پہنچ ہی جائے۔ میں ہر وقت کے اندیشوں اور خوف سے اپنے اوسان کھونے لگی ہوں۔ اگر کوئی شخص مجھے نقصان پہنچانا ہی چاہتا ہے تو وہ ہندوستان اور پاکستان تک میرا پیچھا کرسکتا ہے اسی لیے بہتر ہے کہ یہ معاملہ کھل کر سامنے آہی جائے۔''

''ٹھیک ہے۔'' مائیکل بھی کھڑا ہوگیا۔ ''ایسی صورت کچھ لوگ آپ کی حفاظت کرتے رہیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔''

شیری مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی کہ ایسے موقعوں پر پولیس کی حفاظت کس قسم کی ہوا کرتی ہے۔ پولیس کی تفتیش واردات ہو جانے کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔

''میں ایک بات اور بھی کہنا چاہتا ہوں۔'' مائیکل نے اس کی طرف دیکھا۔ ''امید ہے آپ میری نصیحت سمجھ سکتی ہیں اور وہ بات یہ ہے کہ کبھی کسی کو اپنا راز نہ بتائیں۔''

☆☆☆

وہ دن بہت مصروفیت کا تھا۔ اسی شام کو کرائس فارموسا سے آنے والا تھا اور اس سے پہلے دوپہر کے وقت مائیکل نے اسے ہوٹل پہنچنے کی تاکید کی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق اس ہوٹل کے بنکوئٹ ہال میں مقامی پولیس کے کچھ لوگ ٹھیک دو بجے اس سے ملنے کے لیے پہنچنے والے تھے۔

ان دونوں نے دوپہر کا کھانا اسی ہوٹل میں کھایا

تھا۔ ان کی میز کے اردگرد دوسری میزوں پر مقامی باشندے کم اور غیر ملکی زیادہ دکھائی دے رہے تھے۔ میزوں کے درمیان چینی ملازمائیں ٹرے ہاتھ میں لیے تتلیوں کی طرح گردش کرتی پھر رہی تھیں۔

ٹھیک دو بجے شیری اور ڈیوٹی اس ہوٹل کے بنکوئٹ ہال میں آ گئے۔ یہاں پانچ آدمی اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ وہ سب اسے دیکھ کر کرسیوں سے کھڑے ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک برطانوی معلوم ہوتا تھا۔ اس آدمی کے بال اڑے ہوئے تھے اور جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ اس نے شیری کو مخاطب کیا تھا۔

''تشریف لائیں مس شیری۔'' اس نے کہا۔

''میں انسپکٹر لینڈ ہوں۔'' پھر اس نے اپنے برابر کھڑی ہوئی ایک چینی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور یہ مس چن ہیں۔ ان کا تعلق مقامی پولیس سے ہے۔''

چن، شیری کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ اس کے چہرے کے نقوش کی طرح بہت نرم اور دل آویز تھی۔ شیری نے اس پر سے دھیان ہٹا کر دیگر آدمیوں پر نگاہ ڈالی۔ ان میں سے ایک سارجنٹ بون تھا۔ جس سے ایئرپورٹ پر ملاقات ہو چکی تھی۔

''آپ نے سارجنٹ بون کو تو پہچان لیا ہوگا۔'' لینڈ کی آواز ابھری۔ ''اور یہ ہیں سارجنٹ لنگ اور یہ سارجنٹ واہ ہیں۔ آج رات یہ تینوں آپ کے ساتھ ہوں گے۔''

شیری نے باری باری ان لوگوں سے مصافحہ کیا اور خود ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ڈیوٹی اس سے پہلے ہی بیٹھ چکا تھا۔

''یہ نقشہ دیکھیں۔'' انسپکٹر لینڈ نے ہانگ کانگ کا ایک نقشہ اسی کی طرف بڑھا دیا۔ ''اس نقشے میں ٹن ہانگ اسٹریٹ پر نشان لگا دیا گیا ہے۔''

شیری نے اس کے ہاتھ سے نقشہ لے کر اس پر ایک نگاہ ڈالی پھر ان لوگوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ مقامی پولیس نے اس کا معلوم شخص کے گرد جال بچھانے کا منصوبہ بنا لیا ہے۔ لیکن لائحہ عمل طے ہونا باقی تھا۔

''اب میں آپ کو یہ بتاتا ہوں کہ آپ کیا کریں گی؟'' انسپکٹر لینڈ نے کہنا شروع کیا۔ ''آپ ٹھیک نو بجے اپنے ہوٹل سے نکلیں گی۔ اس کا ڈرائیور ہمارا ہی آدمی ہوگا۔ اس کی پہچان یہ ہوگی کہ اس کے ہاتھ میں ساؤتھ چائنا اخبار ہوگا۔ وہ ٹیکسی آپ کو اسٹار فیری تک لے جائے گی۔ وہاں سے آپ بندرگاہ عبور کریں گی۔ وہاں تک پہنچنے میں آپ کو کل سات منٹ لگیں گے۔ فیری سے اترنے کے بعد آپ کناٹ روڈ تک چلتی چلی جائیں گی۔ پھر آپ آئس ہاؤس اسٹریٹ کے کارنر تک پہنچیں گی۔ یہاں آپ کو ایک دوسری ٹیکسی ملے گی۔ اس ٹیکسی کے ڈرائیور کے ہاتھ میں بھی ساؤتھ چائنا مارننگ اخبار دبا ہوا ہوگا۔ آپ اس ٹیکسی میں بیٹھ جائیں گی۔''

شیری نے اس موقع پر مداخلت کی۔ ''یہ سب کچھ تو ٹھیک ہے انسپکٹر لینڈ۔ لیکن میں اس بچے کی طرف سے پریشان رہوں گی میں نہیں چاہتی کہ اسے ہوٹل میں اکیلا چھوڑ کر چلی جاؤں۔''

''آپ بچے کی طرف سے بے فکر رہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ہمارا ایک آدمی اس کی حفاظت کرتا رہے گا اور وہاں میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ انسپکٹر مائیکل ہانگ کانگ سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ رات تک واپس آ جائیں گے۔ اب میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ یہ لوگ آپ کو اس وقت تک دکھائی نہیں دیں گے جب تک وہ چور آپ کے قریب نہ آ جائے۔ یہ آپ کے اردگرد ہی رہیں گے اور جیسے ہی وہ شخص آپ کے پاس آئے اپنا بایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر گرا دیں۔ یہ گویا ہمارے لیے ایک اشارہ ہوگا اور اس اشارے کے ملتے ہی ہمارے آدمی اس شخص کو گھیرے میں لے لیں گے۔ ان انتظامات کے علاوہ ہمارے کچھ آدمی ریڈیو کار میں بھی موجود رہیں گے اسی لیے اس نے اور آپ سے ملاقات کی تو اس کے بچ نکلنے کا

امکان بہت کم ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے سب کچھ سمجھ لیا ہوگا۔''

''ہاں میں نے سمجھ لیا ہے۔'' شیری نے اپنی گردن ہلائی۔ ''آپ لوگ واقعی بڑی محنت سے کام کرتے ہیں۔''

''یہ تو ہمارا فرض ہے مس شیری۔'' انسپکٹر لینڈ نے کہا۔ ''ہم اگر یہ سب نہ کریں تو ہانگ کانگ میں آپ لوگوں کا آنا ہی ختم ہو جائے۔''

یہ ملاقات ختم ہوگئی تھی۔ اس لیے شیری نے ان سے اجازت طلب کی اور ڈیوٹی کے ساتھ باہر آ گئی۔ اب ان لوگوں کو ایئرپورٹ جانا تھا۔ کرائس کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ اور کرائس کو دوبارہ دیکھنے کی امید نے شیری کو پھر سے حوصلہ دینا شروع کر دیا تھا۔

کرائس کو طیارے سے اترتا دیکھ کر شیری کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے چاہا کہ وہ دوڑتی ہوئی جائے اور اپنی گرفت میں لے کر جلدی جلدی خود پر گزرنے والے سب واقعات سے آگاہ کر دی۔ لیکن وہ خود کو سنبھالے ہوئے باوقار انداز سے کھڑی رہی۔ کرائس خود ہی اپنا اٹیچی کیس اٹھائے ان دونوں کے پاس آ گیا۔ وہ بھی ان دونوں سے مل کر بہت خوش معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن اپنے جذبات کے اظہار میں اس نے بھی بہت احتیاط برتی تھی۔

ٹیکسی میں ڈیوٹی ڈرائیور کے برابر بیٹھا تھا۔ جبکہ شیری اور کرائس پچھلی نشست پر تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ شیری گفتگو کا آغاز کرتی کرائس نے خود ہی کہنا شروع کیا۔

''جانتی ہو فارموسا میں میرے ساتھ کیا ہوا۔ وہاں کی پولیس نے مجھے روک لیا تھا۔ تم ٹوکیو میں جس لڑکی سے ملنے گئی تھیں وہ قتل ہوگئی تھی۔ بس تو پولیس نے یہ سمجھا کہ شاید یہ قتل میں نے کیا ہوگا۔'' وہ اتنا کہہ کر ہنس پڑا۔ ''پوری دنیا میں پولیس والے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔''

''ہاں مجھے معلوم ہے۔'' شیری نے کہا۔ ''مجھ سے بھی پوچھ گچھ کی گئی تھی۔''

''اس بے چاری کے قتل سے ہم لوگوں کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔''

شیری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے پاس تو اب کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''سنو۔'' کرائس نے کچھ دیر سرگوشی کی۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم آج پہاڑی کی چوٹی سے میرے ساتھ ہی سورج کو غروب ہوتے ہوئے دیکھو۔ ہانگ کانگ کا یہ دلفریب منظر پوری دنیا میں اپنی مثال آپ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر صرف ہم دونوں ہوں۔ نہ جانے کیوں کبھی کبھی میری یہ خواہش ہوتی ہے کہ میں جس خوب صورت منظر کو دیکھنا چاہتا ہوں اسے میرے اور اس کے علاوہ اور کوئی نہ دیکھ سکے جسے میں۔ جسے میں.....''

کرائس کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی یہ ادھوری بات اپنے اندر پورا مفہوم رکھتی تھی۔

''کل ڈیوٹی مجھ سے اسی منظر کو دیکھنے کی ضد کر رہا تھا۔'' شیری نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے بتایا۔

''لیکن میں نے اس منظر کو صرف تمہارے لیے بچا کر رکھا ہے۔''

کرائس نے بڑی نرمی سی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ شیری نے بھی بہت کچھ بتا دیا تھا۔ اس وقت ان کی ٹیکسی بندرگاہ کے قریب سے گزر رہی تھی اور شیری یہ سوچ رہی تھی کہ اب سے ٹھیک تین گھنٹوں کے بعد اسے پھر اسی راستے سے گزرنا ہوگا۔ اس کا یہ سفر بھی اجنبی ہوگا اور اس کا انجام بھی اسے معلوم نہیں تھا۔ اسے اس سفر کے اختتام پر ایک ایسے اجنبی سے ملنا تھا۔ جس کے چاروں طرف پولیس نے گھیرا ڈال رکھا ہوگا۔

''کیا بات ہے شیری۔'' کرائس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کچھ پریشان معلوم ہو رہی ہو۔''

شیری نے چاہا کہ وہ کرائس کو صورت حال سے آگاہ کر دے لیکن نہ جانے کیوں وہ خاموش رہی تھی۔

پھر اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ ٹیکسی کا رخ اس جگہ کردے جہاں وکٹوریہ پیک کے لیے کیبل کار کا اسٹیشن بنا ہوا تھا۔ وکٹوریہ پیک پر پہنچ کر اس نے کرائس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ماضی میں سفر کر رہی ہو۔ اس کے سامنے حد نظر تک سرسبز وادی پھیلی ہو اور وہ اس وادی میں کسی محبت بھری آواز کی طرف دوڑی چلی جا رہی ہو۔ اس وادی کی ہوائیں بہت خوشگوار ہوں اور آنکھیں ایسے مناظر دیکھ رہی ہوں جو کسی بھی عورت کے لیے سرمایہ جان ہوسکتا ہے۔

بلندی پر پہنچ کر انہوں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی ان کے اوپر نیلا آسمان پھیلا ہوا تھا اور چوٹی سے نیچے ہانگ کانگ کی سربلند عمارتیں تھیں اور یہ سب کچھ کرائس کی وجہ سے اور بھی خوب صورت اور دلفریب ہوگیا تھا۔ اس کے ہاتھ کا لمس زندگی کے مفہوم بدل دیتا تھا۔

پھر اس لمحے کرائس نے ایک ایسی بات کہہ دی جسے وہ شاید بہت دنوں سے اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھا۔ اس نے شیری کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

''شیری میں تمہارے سامنے ایک حقیقت کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

شیری کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دل دھڑکتے دھڑکتے رک گیا ہو۔ پھر اس کی دھڑکن اچانک تیز ہوگئی۔ اتنی تیز کہ اس کا پورا جسم لرزنے لگا۔ اس کے کانوں کی لویں سرخ ہوگئیں اور اس کے چہرے پر پسینہ آ گیا۔ کرائس نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔

''میں تم سے شادی کے بعد تمہیں پوری دنیا کی سیر کراؤں گا۔'' کرائس جذباتی لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''ہم دونوں خوب صورت مقامات کی سیر کرتے پھریں گے۔ نیلے پانیوں، سرسبز و شاداب وادیوں، ہرے بھرے جنگلوں اور آباد شہروں کی سیر کریں گے ہماری زندگی ایسی دلکش ہوجائے گی جیسے کوئی اچھا سا خواب دیکھتا ہو ساری مسرتیں ہماری ہوں گی۔''

وہ نہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا اور شیری نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اسے کچھ یاد آ رہا تھا۔ کوئی ایسا شخص جس نے بالکل اسی قسم کی باتیں کی تھیں۔

''تم میری بات کا جواب تو دو۔'' کرائس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میں کیا جواب دوں۔'' شیری نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ''شاید میں محبت سے خوف زدہ ہوں۔ یہ جذبہ بہت تکلیف دیا کرتا ہے۔ مجھے ایک اور شخص یاد آ رہا ہے۔ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ اس کی خواہشات بھی تمہاری خواہشات کی طرح تھیں۔ اس کے جذبات بھی بہت صاف تھرے اور اجلے تھے۔ اس آدمی کا نام ریے تھا۔ میرے اس سے سائیگان میں ملاقات ہوئی تھی ہم ایک ساتھ تفریح کے لیے جایا کرتے تھے۔ رقص کیا کرتے اور خوب صورت نظارے اپنی آنکھوں میں بھرلیا کرتے پھر جب ایک رات میں اسے رخصت کرکے اپنے فلیٹ واپس پہنچی تو ایک خوب صورت سی ویت نامی لڑکی اپنے چھوٹے سے بچے کو گود میں لیے میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ ریے کی بیوی تھی اور مجھ سے یہ درخواست کرنے آئی تھی کہ میں اس کی محبت واپس لوٹا دوں پھر۔'' وہ خاموش ہوگئی۔

''ہم میں سے ہر شخص اپنے سینے میں کوئی زخم لیے گھوم رہا ہے شیری۔'' کرائس دھیرے سے بولا۔ ''لیکن کسی غم کو مستقل روگ نہیں بنا لیا جاتا ہے۔''

''کرائس اب تم یہ بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی محبت کی ہے۔''

''ہاں میں دس دن سے ایک ایسی لڑکی سے محبت کرنے لگا ہوں۔ جس کا نام شیری ہے۔'' کرائس اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

شیری نے پہاڑی سے نیچے دیکھا۔ اب سورج ڈوب چکا تھا اور شام ہوتے ہی ہانگ کانگ کی

روشنیاں ستاروں کی طرح جھلملانے لگی تھیں۔

☆☆☆

نو بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ دروازے پر دستک ہوئی، شیری اس وقت تیار تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ایک دبلا پتلا چینی وردی پہنے اس کے سامنے کھڑا تھا اس کا اپنا نام کارپورل بتایا تھا۔ ڈیوٹی کو ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ شیری کہیں جانے کا ارادہ کر رہی ہے اس نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن شیری نے اسے خاموش کرا دیا اور دروازہ بند رکھنے کی ہدایت کر کے کمرے سے باہر آ گئی۔ لی نامی وہ چینی ڈیوٹی کی محافظت کے لیے دروازے کے باہر ہی کھڑا رہا تھا۔

وہ سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آئی جہاں ایک ٹیکسی اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس نے ڈرائیور کی طرف دیکھا اس کے ہاتھ میں چائنا مارننگ پوسٹ دبا ہوا تھا۔ شیری بڑے اطمینان کے ساتھ پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی یہ وہی ٹیکسی تھی جس کے بارے میں اسے بتایا گیا تھا۔

ٹیکسی والے سے آنکھ کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس سوار کو کہاں لے جانا ہے۔ وہ اسے سیدھے بندرگاہ لے آیا۔ جہاں ایک اسٹار فیری تیار کھڑی تھی۔ فیری کے ذریعے سات منٹ کا سفر طے کرنے کے بعد شیری پیدل چلتی ہوئی آئس ہاؤس کے نکڑ پر پہنچی جہاں ایک دوسرا ٹیکسی ڈرائیور چائنا مارننگ پوسٹ اپنے ہاتھ میں لیے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

یہ سفر بھی طویل ثابت نہیں ہوا۔ ڈرائیور کو کرایہ ادا کرنے کے بعد وہ ٹیکسی سے باہر آ گئی۔ اس کے سامنے جگمگاتی ہوئی لوگوں سے بھری ہوئی ایک سڑک تھی، یہ سڑک بھی ہانگ کانگ کی دوسری بڑی سڑکوں کی طرح بارونق تھی۔ جلتی بجھتی ہوئی روشنیاں، سینما ہال لوگوں کا ہجوم، خوانچے والوں کی آوازیں، یہ سب کچھ دوسری سڑکوں کی طرح تھیں۔ لیکن اس سڑک پر شیری کو ایک اجنبی سے ملنا تھا ہو سکتا تھا کہ اس سے ملاقات کوئی خاص بات نہ ہو۔ وہ سامنے آئے، اس کا پرس اسے واپس کرے اور لوگوں کے ہجوم میں غائب ہو جائے یا پھر یہ ملاقات کسی اور طوفان کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ اسے کچھ بھی اندازہ نہیں تھا۔

وہ اجنبی لوگوں کے درمیان سے گزرتی چلی گئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا اگلا قدم اس کے لیے کیا لے کر آنے والا ہے۔ یا تو وہ اس طرح اس سڑک پر ٹہلتی رہے گی یا پھر کوئی نہ کوئی واقعہ رونما ہو جائے گا۔ پھر ایک انجانے سے خوف نے اسے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ پولیس والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہو۔ کیا ضروری تھا کہ وہ اس بھیڑ میں اس کو دیکھتے ہی رہیں۔ وہ خود بھی تو لوگوں کے ریلے میں بہہ کر نہ جانے کہاں سے کہاں آ گئی تھی اور اگر ایسا ہوا تو پھر۔

پھر اچانک کوئی آدمی اس سے آ ٹکرایا۔ وہ اس کے اس قدر قریب آ گیا تھا کہ شیری کو اس کے جسم کی گرمجوشی محسوس ہونے لگی تھی اس کے ساتھ ہی کوئی ٹھنڈی نوکیلی چیز اس کے پہلو سے آ لگی۔ اس نے چونک کر اس آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ پچاس پچپن برس کا ایک دبلا پتلا چینی تھا جس کے گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور اس کا لباس بہت بوسیدہ ہو رہا تھا۔

"بس چپ چاپ چلتی رہو۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کھانسنے بھی لگا تھا۔

شیری اس کی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ ابھی تک کوئی پولیس والا دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس آدمی کے ساتھ چلتے ہوئے اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگے تھے پھر بھی وہ خود کو سنبھالے ہوئے اس آدمی کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ کچھ دور چلنے کے بعد اس آدمی نے دائیں طرف والی گلی میں مڑنے کا اشارہ کیا۔ یہ گلی نیم تاریک تھی اور یہاں ویرانی بھی چھائی ہوئی تھی۔ شیری کا دل زور زور سے دھڑک اٹھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ رک جائے۔ اس گلی میں داخل ہونے سے انکار کر دے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی۔

پھر اچانک ایک عورت کسی طرف سے نکل کر ان کے سامنے آ گئی۔ اس عورت کو دیکھ کر شیری کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ یہ پولیس کی وہی عورت تھی جس سے تعارف کرایا گیا تھا۔ ''امریکی لڑکیاں اچھی نہیں ہوتیں۔'' پولیس والی نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔ ''تم میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں دوسری لڑکی دیتی ہوں۔''

''بھاگ جاؤ یہاں سے۔'' اس چینی نے غصے سے اپنا ہاتھ ہلایا۔

پولیس والی ایک طرف ہوگئی چینی نے شیری کو پھر آگے بڑھنے کا حکم دیا اور اسی وقت کچھ لوگ اس آدمی پر ٹوٹ پڑے۔ شیری بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکی تھی کہ وہ لوگ کہاں چھپے ہوئے تھے بس وہ اس طرح نمودار ہوگئے تھے جیسے جادو کے ذریعے سامنے آ گئے ہوں۔ انہوں نے اس آدمی کو پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ کسی زخمی اور بپھرے ہوئے درندے کی طرح جدوجہد کیے جا رہا تھا۔ شیری جلدی سے ایک طرف ہوگئی۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا اس نے دیکھا کہ اس آدمی کے ایک ہاتھ کو پولیس والوں نے اپنے قابو میں کرلیا تھا۔ جبکہ دوسرا ہاتھ ابھی تک آزاد تھا۔ پھر شیری کے دیکھتے دیکھتے اس آدمی نے دوسرے ہاتھ سے ایک چمکتا ہوا خنجر نکال لیا۔

شیری نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اسی لمحے ایک چیخ سنائی دی۔ اس نے گھبرا کر اپنی آنکھیں کھول لیں۔ اس شخص نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا خنجر اپنے ہی پیٹ میں اتار لیا تھا اور اب زمین پر پڑا ہوا تڑپ رہا تھا۔ شیری بوکھلا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی دوسری رات اور دوسری موت۔ ٹوکیو میں بھی اسے فون کر کے بلایا گیا ایک اور عورت مر گئی اور یہاں بھی اس کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ وہ آدمی زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا اور پولیس گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔

پھر ان میں ہی سے کوئی اسے سہارا دے کر اسے گلی سے باہر لے آیا جہاں ایک پولیس کار کھڑی ہوئی تھی۔ اور یہاں مائیکل بھی موجود تھا۔ جو اسے دیکھ کر فوراً اس کے پاس آ گیا تھا اسی دوران ایک پولیس آفیسر نے اس کے ہاتھ میں گرم گرم چائے کا ایک کپ پکڑا دیا۔ اس چائے نے اس کے اعصاب کو سنبھلنے میں بہت مدد دی تھی۔ چائے پینے کے دوران اس نے ریڈیو پر بیٹھے ہوئے آفیسر کی آواز سنی جو کسی کو اطلاع دے رہا تھا کہ مرنے والے کی ابھی تک شناخت نہیں ہوسکی ہے۔

مائیکل نے اس کی طرف ایک اخبار میں لپٹا ہوا چھوٹا پیکٹ بڑھا دیا۔ ''یہ لو ایسا لگتا ہے کہ اس نے تمہارا پرس کہیں پھینک دیا ہے۔ بہرحال اس میں دونوں ٹکٹ، پاسپورٹ اور ایک مہر بند لفافہ موجود ہے۔ تمہاری ساری چیزیں تمہیں واپس مل گئی ہیں۔''

شیری نے اس کے ہاتھ سے وہ پیکٹ لے لیا۔ اس کی ساری چیزیں اسے واپس تو مل گئی تھیں۔ لیکن ان کی قیمت ایک زندگی کے برابر ہوگئی تھی۔ ان ہی چیزوں کے لیے ایک ایسا آدمی اس کی نگاہوں کے سامنے مر گیا تھا۔ جسے وہ جانتی نہیں تھی زندگی کو اتنی تیزی سے جاتے ہوئے اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''تم نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس پرس میں کوئی ایسا لفافہ بھی موجود ہے جس میں مہر لگی ہوئی ہے۔'' مائیکل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں اس لفافے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ یہ میری فرم والوں نے پاکستان پہنچانے کے لیے دیا تھا۔ میرے لیے تو ویسے بھی میرے پاسپورٹ اور ٹکٹوں کی اہمیت زیادہ تھی۔''

''بہرحال جو ہوا بہت برا ہوا۔'' مائیکل بڑبڑایا۔

''میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ صرف میری وجہ سے اس آدمی کی جان گئی ہے۔''

''تم ایسا مت سوچو۔ وہ اگر آج نہیں مرتا تو بہت جلد مر جاتا تم نے اس کے چہرے کی طرف غور نہیں کیا۔ وہ بے چارہ ٹی بی کا مریض تھا۔ اس کے

علاوہ اس کی خودکشی بھی کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے۔ ان علاقوں میں لوگ بڑی آسانی سے خودکشی کر لیا کرتے ہیں۔ جاپان میں تو یہ ایک باقاعدہ مذہبی رسم ہے۔''

شیری ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ ایمبولینس گاڑیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بہت سے راستہ چلنے والے لوگ اس گلی میں جمع ہو گئے تھے اور پولیس والے انہیں ہٹانے میں مصروف تھے۔ ایک عجیب انداز کی افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ شیری کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ اس ڈرامے کا انجام اتنا المناک بھی ہو سکتا ہے۔

''سنو۔'' مائیکل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اس کے اور قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ''تم اگر میرا مشورہ مانو تو جتنی جلدی ممکن ہو ہانگ کانگ سے چلی جاؤ۔ نہ جانے مجھے کیوں تمہارے اردگرد انجانا سا خطرہ منڈلاتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ اسی لیے جتنی جلدی یہاں سے چلی جاؤ اتنا ہی اچھا ہوگا۔ صبح سوا سات بجے ایک طیارہ بنکاک کے لیے روانہ ہو رہا ہے۔ میں تمہارے لیے اس میں سیٹ محفوظ کروا سکتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ کچھ ہو جائے تم چلی جاؤ۔ یہ میری درخواست ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو انسپکٹر؟'' شیری نے پوچھا۔

''بتاؤ نا مجھے کس قسم کا خطرہ لاحق ہے۔''

''ابھی نہیں۔ میں ابھی نہیں بتا سکتا۔'' مائیکل نے کہا۔ ''لیکن میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کس قسم کا خطرہ ہو سکتا ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں یوں ہی اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں۔'' مائیکل غصے سے بولا۔ ''تم جانتی ہو کہ میں ایک ذمے دار عہدے پر فائز ہوں۔ اسی لیے کبھی غیر ذمے دارانہ مشورہ نہیں دے سکتا اور یہ میں تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ ویسے تم اپنا ہوٹل جانا چاہو تو چلی جاؤ۔ وہ سامنے والی گاڑی تمہیں ہوٹل تک پہنچا دے گی۔''

مائیکل ایک طرف جانے لگا تھا کہ شیری نے اسے آواز دے کر روک لیا۔

''معاف کرنا انسپکٹر میں اس وقت بہت الجھی ہوئی ہوں، اس لیے میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی۔''

''اور میں یہ مشورہ بھی تمہیں اس لیے دے رہا ہوں کہ تم اس وقت سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہو۔'' مائیکل نے کہا۔ ''بہرحال اس مسئلے پر مسٹر کرائس سے بھی بات کر لوں گا۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' شیری دھیرے سے بولی۔

''یہ ہمارا فرض ہے۔ اس کے علاوہ ابھی تمہارے ساتھ مس چن تمہارے ہوٹل تک جائے گی۔ یہ رات بھر تمہارے ساتھ ہی رہے گی۔ ٹھیک ہے تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟''

''نہیں۔'' شیری نے اپنی گردن ہلا دی۔ ''جب یہ سب کچھ ہماری حفاظت کے لیے ہو رہا ہے تو پھر اعتراض کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے؟''

''یہ بات ہوئی نا عقلمندی کی۔'' مائیکل مسکرایا۔ ''انسپکٹر لینڈ تمہارے دروازے کے باہر ایک پولیس والے کی ڈیوٹی لگا دے گا۔ اور صبح ٹھیک چھ بجے ایک پولیس کار تمہیں ایئرپورٹ تک لے جانے کے لیے آ جائے گی۔ اس دوران تم ہوٹل سے باہر نہیں نکلو گی اور میں تمہارے لیے بنکاک کے اورینٹل ہوٹل میں ایک کمرہ بک کروا دوں گا سمجھیں۔''

''سمجھ گئی۔ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ ہانگ کانگ سے نکلنے کے بعد وہ خطرہ دور ہو جائے گا۔''

''ہماری اطلاعات کے مطابق تمہیں بس ہانگ کانگ ہی تک خطرہ لاحق ہے۔'' مائیکل نے کہا۔ ''یہاں سے نکلنے کے بعد حالات بہتر ہو جائیں گے اور ہاں بنکاک ایئرپورٹ پر میری بیوی میرین تمہیں لینے کے لیے موجود ہوگی۔ تم اسے یقیناً پسند کرو گی

کیونکہ بہت سی باتوں میں تم دونوں ایک ہی جیسی ہو اور ہاں۔ ہانگ کانگ کے ایئرپورٹ پر مس چن اور وہ آفیسر اس وقت تک موجود رہیں گے جب تک تم بحفاظت طیاری میں سوار نہیں ہو جاتی اور تمہارے طیارے کا دروازہ بند نہیں ہو جاتا سمجھ گئیں۔''

مائیکل کی باتوں اور اس کی ہدایات نے اسے اور الجھا کر رکھ دیا۔ آخر وہ کون سا خطرہ تھا۔ جس سے بچنے کے لیے اتنے وسیع پیمانے پر اس کی حفاظت کا بندوبست کیا جا رہا تھا۔ آخر کیوں؟ اس میں ایسی کون سی خاص بات ہو گئی تھی کہ اس قسم کے آسیب اس کے گرد منڈلانے لگے تھے۔

☆☆☆

ڈیوٹی اسے دیکھتے ہی دوڑ کر لپٹ گئی۔

شیری بہت دیر تک اس کو اپنے سینے سے لگائے کھڑی رہی گرچہ اس نے اس بچے کو ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن شاید ڈیوٹی کی حیثیت نے اسے یہ احساس دلا دیا تھا کہ شیری کسی مشکل میں مبتلا ہو کر واپس آئی ہے۔ اس لمحے شیری کو پھر یہ احساس ہونے لگا کہ محبت جغرافیائی حدود سے بالا ہوا کرتی ہے۔ اس لڑکے سے اس کا کیا تعلق تھا۔ کچھ بھی نہیں لیکن اسے سینے سے لگا کر عجیب سی تسکین ہوتی تھی جیسے ایک ماں بچے کو پیار کر کے محسوس کیا کرتی ہے۔

شیری سے الگ ہو کر ڈیوٹی مس چن کی طرف متوجہ ہو گیا جو شیری کے ساتھ ہی آئی تھی۔ مس چن کے علاوہ پولیس کا ایک آفیسر دروازے کے باہر بھی کھڑا کر دیا گیا تھا۔ مس چن کو ڈیوٹی سے باتیں کرتا دیکھ کر شیری فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اسے کرائس کو صورت حال سے آگاہ کرنا تھا۔

کرائس اپنے کمرے میں ہی مل گیا تھا۔ شیری نے جب اسے اب تک کی ساری کہانی سنائی تو وہ حیران ہو کر رہ گیا۔

''خدا کی پناہ تمہارے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال اگر کل تم ہانگ کانگ سے جا رہی ہو تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔ بشرطیکہ اس طیارے میں مجھے بھی سیٹ مل جائے۔''

''نہیں، نہیں تم میرے ساتھ جا کر کیا کرو گے۔ تم نے ابھی تو ہانگ کانگ کی سیر بھی نہیں کی ہے۔''

''میں نے تم سے کہہ دیا ہے نا کہ میرے لیے دنیا کے سارے مناظر صرف تمہاری وجہ سے خوب صورت ہیں۔ اگر تم ساتھ ہو تو سب کچھ دیکھنے کو دل چاہتا ہے اور اگر تم نہیں ہو تو کوئی بھی چیز مجھے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔''

''میرے لیے تو اب کسی چیز میں کوئی دلچسپی نہیں رہی کرائس۔'' شیری نے کہا۔ ''مجھے رہ رہ کر اس شخص کا خیال آ رہا ہے ایسا لگتا ہے جیسے میں ہی اس کی موت کی ذمے دار ہوں۔''

''بے وقوفی کی بات مت کرو۔ تمہارا اس میں کیا قصور ہے وہ ایک مجرم تھا اور اس کی موت اسی انداز سے ہونے والی تھی۔ بہرحال میں تم سے کہاں ملوں؟''

''سات بجے پرواز ہے۔'' شیری نے بتایا۔ ''تم اس سے پہلے آ جانا۔'' ریسیور رکھ کر شیری نے ڈیوٹی کی طرف دیکھا۔ وہ سونے سے پہلے معمول کے مطابق دونوں آنکھیں بند کیے دعا مانگنے میں مصروف تھا۔ شیری اسے دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انسان جب بچہ ہوتا ہے تو خدا کو خود سے قریب کیوں محسوس کرتا ہے۔ پھر جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جاتا ہے خدا سے دور ہوتا جاتا ہے۔ پھر خدا اسی وقت یاد آتا ہے جب یا تو اس پر کوئی آفت نازل ہونی ہو یا اس کی موت آنے والی ہو۔

صبح پروگرام کے مطابق ان دونوں کو حفاظتی پہرے میں ایئرپورٹ تک پہنچا دیا گیا۔ مس چن اور پولیس کا ایک آفیسر ان کے ساتھ تھا۔ کرائس ایئرپورٹ پر پہلے سے موجود تھا۔ اسے اس وقت تک شیری سے ملنے سے روک دیا گیا جب تک شیری طیارے میں سوار نہ ہو جاتی۔ کرائس بے بسی سے گہری سانس لے کر ایک طرف ہٹ گیا تھا۔ مائیکل بھی

یہاں ان لوگوں سے آملا تھا۔ وہ بہت چوکنا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اس کے ہولسٹر پر جما ہوا تھا جبکہ وہ بار بار اس انداز سے چاروں طرف دیکھنے لگتا جیسے اسے کسی خطرے کا امکان ہو۔

''میں اور مس چن طیارے تک تمہارے ساتھ چلیں گے۔'' اس نے شیری سے کہا۔ ''پھر تمام مسافروں کے سوار ہونے کے بعد تم اور ڈیوٹی طیارے میں داخل ہو گے۔ تمہارے جاتے ہی طیارے کا دروازہ بند کر دیا جائے گا وہ طیارہ پرواز کر جائے گا۔''

''تم نے مجھ سے کچھ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔'' شیری اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''خدا کے لیے اب تو بتا دو۔ میں بہت پریشان ہو گئی ہوں۔''

''کیا تم نے کبھی ٹرائڈ کا نام سنا ہے؟'' مائیکل نے پوچھا۔

''نہیں یہ کیا چیز ہے؟''

''یہ مجرموں کی ایک خطرناک تنظیم کا نام ہے۔'' مائیکل نے بتایا۔ ''ویسی ہی تنظیم جیسی سنڈیکیٹ کے نام سے شکاگو میں قائم ہے۔ دونوں کا طریقہ کار بھی ایک ہی جیسا ہے۔ ٹرائڈ نے یہاں اتنی وارداتیں کی ہیں کہ یہاں پولیس میں اسی کے نام پر ایک خاص ڈویژن قائم کی گئی ہے۔ بہرحال میں آج کل ایک کیس پر کام کر رہا ہوں اس میں ٹرائڈ ملوث ہے۔ وہ کیس ہمارے بین الاقوامی امداد میں فراڈ کا ہے اور اس سلسلے میں تمہارا نام بھی شامل کیا گیا ہے۔''

''میرا نام۔'' شیری کے ہونٹ لرزنے لگے۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے میں نے تو اس تنظیم کا نام ہی پہلی بار سنا ہے۔''

''ہمارے مخبر کی اطلاع کے مطابق ٹرائڈ والوں نے ایک دوسرے کو یہ پیغام بھیجا ہے کہ ہم نے مس شیری جونز کی شناخت کر لی ہے جو ایک امریکی شہری ہے اور کام مکمل ہونے تک اسے زندہ رکھا جائے۔''

''شیری اب پورے بدن سے لرزنے لگی تھی۔'' ''کون سا کام.....؟'' اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''یہ میں نہیں جانتا۔ اس سے زیادہ ہمیں کچھ نہیں معلوم ہو سکا ہے۔''

''خدا کی پناہ آخر کیا ہونے والا ہے۔ کیا ہو گا اس خاص کام کا مجھ سے کیا تعلق ہے۔''

''میں نے کہا نا کہ میں اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا خدا ہی جانے کیا چکر ہے؟''

''تمہارے خیال کے مطابق میں اگر یہاں سے چلی جاؤں تو خطرہ ٹل سکتا ہے۔''

''شاید۔'' مائیکل نے اپنی گردن ہلائی۔ ''اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹرائڈ کا دائرہ کار ہانگ کانگ تک محدود ہے۔''

''وہ لوگ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ میرے پاس تو دولت بھی نہیں ہے اور نہ ہی میں نے کوئی جرم کیا ہے میرا تعلق بھی کسی سے نہیں ہے۔''

''ہوں۔'' مائیکل نے ایک گہری سانس لی۔ ''کیا تم ہانگ کانگ میں کسی کو جانتی ہو؟ کیا تمہارا کوئی کاروباری مفاد کہیں موجود ہے؟''

''میں نے کہا نا کہ میں ہانگ کانگ پہلی بار آئی ہوں۔ اسی لیے کسی کو جاننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پھر میں ایک معمولی سیکریٹری ہوں۔ میرا کاروباری مفاد کیا ہو سکتا ہے میری بساط ہی کیا ہے۔''

''تم کراس سے کس طرح ملی تھیں؟ میرا مطلب ہے کہ وہ خود ہی تم سے آملا تھا یا تم نے اس سے ملاقات کی تھی؟''

مائیکل کے اس سوال پر شیری کچھ بے چینی محسوس کرنے لگی۔ پھر اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ''دیکھو انسپکٹر، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور۔''

''خیر، خیر۔'' مائیکل نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تم نے اپنی کمپنی کا وہ خط پڑھا ہے جسے تم پاکستان لے جا رہی ہو۔''

''نہیں وہ ایک خفیہ خط ہے اور ہو سکتا ہے کہ اسے پڑھنے کی صورت میں میری نوکری چلی جائے۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے نہ پڑھنے کی

صورت میں تمہاری زندگی چلی جائے۔'' مائیکل نے کہا۔ ''اس لیے بہتر ہے کہ تم وہ خط ابھی پڑھ لو۔''

شیری نے ہچکچاتے ہوئے وہ لفافہ کھول لیا۔ لیکن اس کے اندر رکھے ہوئے خط میں بھی کچھ نہیں تھا۔ وہ انتظامی امور سے متعلق ایک ایسا خط تھا جو فرم کے ہیڈ آفس سے پاکستان کی شاخ کو بھیجا گیا تھا۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد مائیکل کی مایوسی اور بڑھ گئی تھی۔

''اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''بہرحال پچھلے دنوں امریکہ سے کوئی عورت سیاٹیگان گئی تھی۔ جو اپنے ساتھ ایسی دوائیں لے گئی تھی۔ جس کی وجہ سے اٹھارہ بچے ہلاک ہوگئے تھے۔ کہیں تم میرا مطلب ہے کہ شاید یہ بات تمہیں کچھ یاد دلا دے۔''

شیری یہ سن کر بھڑک اٹھی۔ ''تم کیسی بات کر رہے ہو انسپکٹر ایسا لگتا ہے جیسے تم زبردستی مجھے کسی نہ کسی الزام میں ملوث کرنا چاہتے ہو۔ گویا تمہارے خیال کے مطابق میں ایک ایسی مجرمہ ہوں۔ جس نے اٹھارہ بچوں کو ہلاک کر دیا ہوگا۔ میں سمجھتی تھی کہ تم شاید میری مدد کر رہے ہوگے۔ لیکن یہاں یہ حال ہے کہ مجھ ہی کو مجرم قرار دیے جا رہے ہو۔''

اس کو غصے میں دیکھ کر مائیکل مسکرا دیا۔ ''معاف کرنا شیری میں نے جان بوجھ کر ایسی بات کی تھی۔ کبھی کبھی غصے کی حالت میں انسان کو ایسی باتیں بھی یاد آجاتی ہیں جنہیں وہ فراموش کر چکا ہوتا ہے۔ میں نے اسی لیے یہ کہا تھا کہ شاید تمہیں کچھ یاد آجائے۔ خیر اب تمہارے طیارے کی روانگی کا وقت ہو چکا ہے۔'' اتنا کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر شیری کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ لو میں نے میرین کے نام خط لکھ دیا ہے۔ وہ تمہارا ہر ممکن خیال رکھے گی۔ اب آؤ طیارے کی طرف چلتے ہیں۔''

شیری جب طیارے میں داخل ہوئی تو کرائس کو دیکھ کر بے ساختہ چونک اٹھی۔ وہ ایک سیٹ پر بیٹھا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

''تم۔'' شیری جلدی سے اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی جبکہ ڈیوٹی پہلے ہی اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ ''تم کیسے؟''

''ہاں میں بھی تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔'' کرائس نے کہا۔ ''تمہارے اس انسپکٹر مائیکل کی مہربانی سے مجھے بھی سیٹ مل گئی ہے۔''

شیری کو یوں محسوس ہوا جیسے اچانک اس کا حوصلہ بڑھ گیا ہو۔ اس نے کرائس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کے ہاتھ کی حرارت نے اسے یہ احساس دلا دیا کہ اگر یہ ہاتھ اسی طرح اس کے ہاتھ میں رہا تو پھر کبھی کوئی خطرہ اس کے قریب نہیں آسکتا وہ بالکل محفوظ رہے گی۔

☆☆☆

بنکاک کے ڈون مونگ ایئرپورٹ سے ہوٹل اورینٹل کی طرف جاتے ہوئے شیری کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ہانگ کانگ میں گزرے ہوئے لمحے خواب تھے۔ وہ کوئی اور تھی جس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا تھا۔ کسی اور کا پرس چوری ہوا تھا۔ اور وہ کوئی دوسری لڑکی تھی جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک آدمی کو خودکشی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ سے اس طرح محفوظ رہی تھی۔ جس طرح اس وقت جب وہ اپنے ہوٹل کی طرف جا رہی ہے اور کرائس کے ساتھ ہے۔

دوسری صبح سات ہی بجے شیری اور ڈیوٹی دریائے چاؤ پھریا کے کنارے پہنچ گئے۔ انہیں یہاں سے دوسرے سیاحوں کے ساتھ بڑے مندر تک جانا تھا اور وہاں سے گاڑی کے ذریعے مہاتما بدھ کے اس عظیم الشان مجسمے تک پہنچنا تھا۔ جس میں ہیرے اور سونے کا استعمال کیا گیا تھا۔ ڈیوٹی اس سفر کے خیال سے بہت خوش ہو رہا تھا۔ شیری کے اردگرد ایسے خوش باش سیاحوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ جن کی زندگی کا مقصد ہی یہی تھا کہ وہ نئے نئے مقامات کی سیر کرتے پھریں۔ ان سیاحوں میں یورپی بھی تھے اور جاپانی بھی ان کے علاوہ مشرقی وسطیٰ کے بھی سیاح

تھے۔ اوران ہی کے درمیان کرائس بھی کھڑا تھا۔

کرائس نے کسی اور ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ لیکن گزشتہ رات ہی ان کے درمیان طے پا گیا تھا کہ وہ لوگ ایک دوسرے سے کہاں ملیں گے۔ کرائس اور شیری ایک دوسرے کے قریب آ گئے جبکہ ڈیوٹی اس دوران ایک اور امریکن سیاح کی طرف متوجہ ہو گیا تھا اور اس نے اس سیاح سے دوستی گانٹھ لی تھی۔

ان کو لے جانے کے لیے جب سجی سجائی لانچ کنارے پر لگی تو سب سے پہلے ڈیوٹی ہی اس میں سوار ہوا۔ شیری اس کی دلچسپی دیکھ کر مسکرا دی تھی۔ وہ اور کرائس ایک ساتھ سوار ہوئے تھے۔ دوسرے سیاح کے آ جانے کے بعد لانچ نے اپنا سفر شروع کر دیا۔ کرائس اور شیری ریلنگ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے جب کہ ڈیوٹی اس امریکی سے گپ شپ میں لگا رہا تھا۔

لانچ سبک خرامی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی اور بنکاک کی مربوط فضا، سورج کی تپش اور دریا کی لہروں سے ٹکرا کر اٹھتی ہوئی ہوائیں بہت اچھی معلوم ہو رہی تھیں۔

''ہمیں کل ایک دوسرے سے الگ ہو جانا ہے شیری۔'' کرائس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے میں تم سے آج ہی یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے میری پیش کش پر کیا فیصلہ کیا؟''

''ابھی نہیں۔'' شیری نے ایک گہری سانس لی۔

''مجھے غلط مت سمجھنا کرائس۔ میں ابھی بھی تمہیں ایک مضبوط سہارا خیال کر رہی ہوں۔ لیکن میرے اور تمہارے درمیان دو سال کا عرصہ حائل ہے۔ مجھے ان دو برسوں تک پاکستان میں ملازمت کرنی ہے۔ اس کے بعد میں کوئی فیصلہ کر سکوں گی۔''

''یہ انتظار تو میرے لیے جان لیوا ثابت ہوگا۔ تم ہاں یا نہ میں جواب دو۔''

شیری نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ گائڈ کی آواز لانچ میں گونج اٹھی۔ وہ سیاحوں کو بنکاک کی مشہور چیزوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اب ان کی لانچ ایک ایسی جگہ پہنچ چکی تھی جہاں بے شمار کشتیاں پانی کی سطح پر تیرتی پھر رہی تھیں۔ ان کشتیوں پر کھانے پینے کی چیزیں فروخت ہو رہی تھیں۔ یہ ایک متحرک بازار تھا۔ جہاں کافی، اناناس، آلو، آم، ناریل وغیرہ فروخت ہو رہے تھے۔ ایک کشتی میں تلی ہوئی مچھلیاں بھی بیچی جا رہی تھیں۔ دکاندار عورتیں تھیں۔ جنہوں نے دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لیے تنکوں سے بنے ہوئے بڑے بڑے ہیٹ پہن رکھے تھے۔ کنارے پر اسکول کے کچھ بچے اپنی یونی فارم پہنے کسی ایسی کشتی کے منتظر تھے جو انہیں ان کے اسکول تک پہنچا سکے۔

ان کی لانچ اس ہجوم سے راستہ بناتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔ پھر وہ لانچ ایک کنارے آ لگی۔ یہاں سے ان لوگوں کو پیدل سنہرے مینار کی طرف جانا تھا۔ جو خاصی بلندی پر واقع تھا۔ جس کی آنکھیں سمندر کے پانی کی طرح نیلی تھیں۔ ڈیوٹی اس کی ہمراہی میں بہت خوش معلوم ہو رہا تھا۔

یہ لوگ مختلف ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ ڈیوٹی اور ارنو ایک ساتھ تھے۔ جبکہ کرائس ایک بوڑھی عورت کی مدد کرنے کے لیے اس کے ساتھ رک گیا تھا اور شیری اوپر چڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اب وہ ایک ایسی جگہ آ گئی تھی جہاں دوسرے سیاح پیچھے رہ گئے تھے۔ شیری نے آواز دے کر ڈیوٹی کو روکنا چاہا لیکن وہ ارنو کے ساتھ بہت مگن معلوم ہو رہا تھا پھر اس نے دیکھا کہ ارنو اور ڈیوٹی ایک طرف مڑ گئے تھے۔ یہ اس پہاڑی کا عقبی حصہ تھا جس پر سنہرا مندر بنا ہوا تھا۔ اس نے ڈیوٹی کو آواز بھی دی لیکن اس نے شاید آواز نہیں سنی تھی۔ شیری بھی جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی اس طرف پہنچ گئی جس طرف وہ دونوں گئے تھے۔

یہ ایک ویران جگہ تھی۔ یہاں سیاحوں کی آمد و رفت نہیں ہوا کرتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ امریکی ڈیوٹی کو اس طرف کیوں لے جا رہا ہے۔ اس نے دوبارہ ڈیوٹی کو آواز دی اور اسی وقت

ارنو ڈیوٹی کو چھوڑ کر تیزی سے اس کے پاس آ گیا۔ اب اس کے چہرے کے تاثرات بدلے ہوئے تھے۔

''میری جیب میں ایک پستول ہے مس۔'' وہ پھنکارتے ہوئے بولا۔ ''اور اس پستول کا رخ اس بچے کی طرف ہے۔ اپنی زبان بند رکھو اور کسی قسم کی گڑبڑ مت کرو سمجھی ورنہ میں اس بچے کو گولی مار دوں گا۔ میں اس سے پہلے بھی ایک بچے کو ہلاک کر چکا ہوں اس لیے میرے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں ہو گی۔ لیکن میں اپنی طرف سے ایسا نہیں چاہتا اس لیے خاموشی سے میرے ساتھ چلتی رہو اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس نے دیکھا کہ ڈیوٹی بھی ارنو کو اس کے پاس دیکھ کر دوڑتا ہوا قریب آ گیا۔ اس کے قریب آتے ہی ارنو نے جھپٹ کر اس کا ایک بازو پکڑ لیا اور اپنی جیب سے ایک پستول نکال کر اس کے سر پر رکھ دیا۔ ڈیوٹی کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ جبکہ خود شیری کا یہ حال تھا جیسے یہ پہاڑی غائب ہو گئی ہو اور وہ خلا میں تیر رہی ہو۔ پہاڑی کے عقب سے سیاحوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ان ہی میں شاید کرائس بھی شامل ہو لیکن وہ کرائس کو آواز بھی نہیں دے سکتی تھی۔

''چلو آگے بڑھو۔'' ارنو غرایا۔ ''پہاڑی سے نیچے اترنا ہے۔''

شیری کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دونوں پیر بے حد وزنی ہو گئے ہوں۔ اس کا پورا جسم بوجھل ہو گیا تھا۔ پہاڑی کے عقب میں سیاحوں کی آوازیں پھر ابھریں اور اس بار ڈیوٹی حلق پھاڑ کر چیخ اٹھا۔ ''کرائس کرائس۔''

اس کے ساتھ ہی ارنو نے پستول کا دستہ ڈیوٹی کے سر پر دے مارا۔ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ ڈیوٹی ایک طرف گرا اور تکلیف سے تڑپنے لگا۔ شیری بے تاب ہو کر دوڑتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔ ڈیوٹی کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے بدن پر ہلکا ہلکا لرزہ طاری تھا۔

''تم بے رحم ذلیل انسان۔'' شیری نے ارنو کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں ایک بچے پر ہاتھ اٹھاتے شرم نہیں آئی۔ میں اب تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ چاہے تم کچھ ہی کر لو۔ تم نے اس بچے کو زخمی کر دیا ہے۔ میں اب نہیں جاؤں گی سمجھے۔''

ارنو کے پتلے پتلے ہونٹ کچھ اور بھنچ گئے۔ وہ آگے بڑھا اور ڈیوٹی کے گالوں پر تھپڑ مارنے شروع کر دیے۔ ڈیوٹی کی گھٹی گھٹی چیخ بلند ہوئی پھر وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے ساتھ ہی ارنو نے اسے سہارا دے کر کھڑا کر دیا تھا۔

''میں کہتا ہوں چلتی رہو۔'' اس نے کہا۔ ''ورنہ میں اس بچے کو جان سے مار دوں گا۔''

شیری نے غصے اور بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے ذہن میں جھماکے ہونے لگے۔ یہ آواز وہ پہلے بھی کہیں سن چکی تھیں۔ یہ لہجہ اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ پھر اسے ٹوکیو کی وہ رات یاد آ گئی جب وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھی تھی اور ایک آدمی اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس آدمی نے چلتی ٹیکسی میں اس پر تشدد کیا تھا۔ یہ وہی آدمی تھا۔ سو فیصد وہی۔ اس کا مطلب تھا کہ جو آسیب اس پر ٹوکیو میں مسلط تھا وہ ابھی تک اس کے تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔

''تم چلتی ہو یا نہیں۔'' ارنو پھر غرایا۔ ''میں کہتا ہوں جلدی سے چلو۔''

''تم نے اس بچے کو زخمی کر دیا ہے۔ اگر تم نے اسے پھر ہاتھ لگایا تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''

''اب تم چلتی ہو یا میں تم دونوں کو یہیں ڈھیر کر دوں۔'' ارنو نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ڈیوٹی کو گھسیٹنا شروع کر دیا۔

شیری کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرتی رہے۔ وہ نیم غنودگی کے عالم میں چلتی رہی اس کے ذہن پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ جو خوف کئی دنوں سے کہیں پوشیدہ رہ کر اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ اب اچانک اس کے

سامنے آ گیا تھا۔

''چلو اس لانچ میں بیٹھ جاؤ۔'' ارنو نے لانچ کی طرف اشارہ کیا۔

لانچ چلانے والے نے مسکرا کر ارنو کی طرف دیکھا اور پھر ہاتھ بڑھا کر ڈیوٹی کو لانچ میں کھینچ لیا۔

☆☆☆

کیبن میں بیٹھتے ہی لانچ کا انجن غرایا اور دھیرے دھیرے لانچ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔

کیبن میں پہنچ کر ارنو نے ڈیوٹی کو ایک طرف بٹھا دیا تھا۔ شیری لپک کر اس کے پاس پہنچ گئی جبکہ ارنو نے ان دونوں کے سامنے رکھی ہوئی لکڑی کی ایک بنچ سنبھال لی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ اس نے اپنا پستول ابھی تک اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اور وہ بڑی طنزیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شیری کے لیے خطرے کی نوعیت بتدریج بڑھتی گئی تھی۔ ٹوکیو میں ایک معمولی سا واقعہ ہوا تھا۔ ہانگ کانگ میں اس کی نوعیت کچھ شدید ہو گئی تھی۔ اب یہاں بنکاک میں یہ خطرہ اپنے عروج کو پہنچ گیا تھا اسے توقع بھی نہیں تھی کہ اس کے ساتھ آگے چل کر کیا ہونے والا ہے۔

اس نے ڈیوٹی کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اس کے دونوں گال آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔ وہ کبھی کبھی تکلیف کی وجہ سے کراہنے لگتا تھا۔

''ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔'' شیری نے اس امریکی کی طرف دیکھا۔ جس نے اپنا نام ارنو بتایا تھا۔ ''اگر تمہیں رقم کی ضرورت ہے تو جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ لے لو۔''

ارنو کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ جیسے وہ شیری کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔

شیری نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس شخص سے کہنا بے کار ہی معلوم ہوتا تھا۔ پھر اس کی نگاہ ڈیوٹی پر گئی۔ وہ کسی چیز کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ شیری نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور اسے پتا چل گیا کہ ڈیوٹی اپنے پیروں کے پاس پڑی ہوئی ایک زنجیر کو دیکھ رہا تھا۔ شیری نے محسوس کیا کہ اسے زنجیر کو دیکھ کر ڈیوٹی کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ جیسے وہ کسی بات کا ارادہ کر چکا ہو۔ یہ صورت حال ڈیوٹی کے لیے خطرناک ہو سکتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ڈیوٹی اس خطرناک اور بے رحم شخص سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اس نے ڈیوٹی کو آہستہ آہستہ اس زنجیر کی طرف جھکتے ہوئے دیکھا اور اسی وقت وہ چیخ اٹھی۔

''نہیں نہیں ایسا مت کرو۔''

اس کی چیخ کے ساتھ ہی ڈیوٹی نے بوکھلا کر اس طرح شیری کی طرف دیکھا جیسے اسے شیری کی اس حرکت سے دکھ پہنچا ہو۔ دوسری طرف ارنو نے جھپٹ کر وہ زنجیر اٹھا لی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے وہ زنجیر ڈیوٹی کی گردن کے گرد اس طرح لپیٹ دی کہ اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ وہ بے بسی سے اپنے ہاتھ پاؤں چلانے لگا تھا۔

''خدا کے لیے اسے چھوڑ دو۔'' شیری نے ارنو کا بازو پکڑ لیا۔ ''یہ مر جائے گا چھوڑ دو۔''

''اب اگر اس کی کوئی حرکت کی تو مار ہی دوں گا سمجھے۔'' ارنو نے شیری کی طرف دھیان دیے بغیر اس زنجیر کو جھٹکے دیے پھر ڈیوٹی کی گردن کے گرد لپٹی ہوئی زنجیر کھول کر ایک طرف پھینک دی اس کے بعد وہ اتنے اطمینان کے ساتھ اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

ڈیوٹی اس صدمے سے نڈھال ہو کر ایک لڑھک گیا تھا۔ وہ بے ہوش تو نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس کی حالت غیر ہو رہی تھی شیری نے دھیرے دھیرے اس کی گردن اور سر کو سہلانا شروع کر دیا۔ اس دوران وہ لانچ ایک تنگ سے سنہری راستے میں داخل ہو چکی تھی۔ اس راستے کے دونوں طرف دلدلی زمین تھی جس پر سرکنڈے اگے ہوئے تھے۔

ڈیوٹی کی حالت اب سنبھل چکی تھی۔ لیکن وہ ابھی تک اپنی گردن کو سہلا رہا تھا۔

''میں بہت چھوٹا ہوں شیری۔'' اس نے شیری

کی طرف دیکھتے ہوئے اپینی میں کہا۔ ''میں اس سے مقابلہ تو نہیں کرسکتا لیکن کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔''

''نہیں، نہیں خدا کے لیے تم ایسی کوئی حرکت مت کرنا۔'' شیری نے بھی اپینی میں جواب دیا۔ ''یہ آدمی بہت کمینہ معلوم ہوتا ہے۔''

''اے تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو۔'' ارنو دہاڑا۔ ''خاموش ہوجاؤ۔''

''اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔'' شیری نے کہا۔ ''اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔ ورنہ یہ مرجائے گا۔''

''کچھ بھی نہیں ہوگا اسے۔'' ارنو نے اپنا ہاتھ ہلایا۔ ''اسے باہر عرشے پر لے جاؤ۔ ٹھنڈی ہوا کھا کر اس کی طبیعت ٹھیک ہوجائے گی۔''

ڈیوٹی نے پھر اپنی گردن ڈال دی تھی۔ شیری اسے سہارا دے کر کیبن سے باہر لے آئی۔ ارنو بھی ان دونوں کے ساتھ ہی باہر آ گیا تھا۔ جہاں لانچ چلانے والا اس انہماک کے ساتھ لانچ چلانے میں مصروف تھا جیسے اسے اس کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہ ہو۔ یا اسے اپنے گردوپیش کی کوئی پرواہ ہی نہ ہو۔

ڈیوٹی ریلنگ کا سہارا لے کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے دو چار گہری گہری سانسیں لیں اور اچانک پانی میں چھلانگ لگادی اس کی یہ حرکت اتنی غیر متوقع تھی کہ ارنو کے ساتھ ساتھ خود شیری بھی حیران رہ گئی۔ ارنو نے پستول ہاتھ میں لے کر زور زور سے چلانا شروع کردیا۔ ڈیوٹی کچھ دیر تک سطح آب پر دکھائی دیتا رہا پھر اس نے پانی میں غوطہ لگادیا۔

''پکڑو اسے۔'' ارنو نے لانچ چلانے والے سے کہا۔ ''اسے جانا نہیں چاہیے۔''

''یہ میرا کام نہیں ہے صاحب۔'' لانچ چلانے والے نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''آپ نے یہ نہیں بولا تھا۔''

شیری کو ایسا محسوس ہوا جیسے ارنو غصے میں آ کر لانچ چلانے والے کو گولی مار دے گا۔ پھر نہ جانے کیوں اس نے اپنا رخ بدل دیا اور اپنا پستول والا ہاتھ اوپر اٹھایا۔

''نہیں ایسا مت کرو۔'' شیری چیخ پڑی۔ اس نے دوڑ کر ارنو کے ہاتھ سے پستول چھیننے کی کوشش کی۔

ارنو نے اسے قریب آتے دیکھ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر رسید کردیا۔ شیری اس تھپڑ کی شدت سے لڑکھڑاتی ہوئی کئی قدم پیچھے گئی ارنو نے اسی وقت اس جگہ گولیاں چلانی شروع کردیں۔ جہاں دائرے سے بنتے دکھائی دے رہے تھے۔ شیری پھر سنبھل کر کھڑی ہوگئی۔ وہ جھول گئی تھی کہ اس کے گال پر زوردار تھپڑ مارا گیا ہے۔ اس کی ساری توجہ ان دائروں کی طرف تھی۔

''اگر تم نے کسی کو بتایا تو میں اس لڑکی کو جان سے ماردوں گا۔'' ارنو چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ''تم واپس آجاؤ ورنہ اس لڑکی کے لیے بہت برا ہوگا۔''

لیکن ڈیوٹی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شیری کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دل ڈوبتا جارہا ہو۔

☆☆☆

ارنو کی جنونی کیفیت ختم ہوگئی۔ وہ شیری کو دھکیلتا ہوا کیبن میں لے آیا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

شیری ابھی تک خود پر قابو نہیں پا سکی تھی۔ وہ یہ یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھی کہ ڈیوٹی مر چکا ہے۔ آخر کیوں..... اس بچے کا کیا قصور تھا۔ اسے تو موت نہیں آنی چاہیے تھی۔ اس نے زندگی میں دیکھا ہی کیا تھا کچھ بھی تو نہیں۔ پھر..... پھر وہ کہاں چلا گیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ڈوب گیا ہو۔ وہ اتنا زبردست تیراک بھی تو نہیں تھا کہ اس قسم کی کسی جھیل یا نہر میں تیراکی کرسکے۔ اس کے علاوہ یہ جگہ اس کے لیے اجنبی تھی۔ یہ شہر اجنبی تھا۔ یہاں کے لوگ اجنبی تھے۔ اگر وہ کسی طرح بچ بھی نکلا تو پھر کہاں جائے گا۔ کس کے پاس جائے گا۔ نہیں اسے موت نہیں آئی ہوگی۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔

اس کے ہونٹ خشک ہونے لگے تھے۔ اسے بہت زوروں کی پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے

سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرنی شروع کر دی۔ ارنو نے یہ دیکھ کر اس کی طرف پانی سے بھرا ہوا ایک جگ بڑھ دیا۔ لیکن شیری نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ وہ اس بے رحم شخص سے کسی قسم کی رعایت نہیں چاہتی تھی۔ اس کے لیے یہ بہتر تھا کہ وہ پیاسی مر جائے۔

پھر اس نے اچانک اپنے ہاتھوں کو ارنو کی گرفت میں محسوس کیا۔ اس نے غیر محسوس طور پر اپنی جگہ سے جست لگا کر اس کے دونوں بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ شیری نے سنبھل کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن ارنو بہت پھرتیلا ثابت ہوا تھا۔ شیری کے سنبھلتے سنبھلتے اس نے اس کے ایک ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی۔ یہ عمل اتنی تیز رفتاری سے ہوا تھا کہ شیری بھونچکی رہ گئی۔ پھر جب اسے ہوش آیا تو وہ ارنو کی قیدی بن چکی تھی اور ایسی قیدی جو اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی بے بسی کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ارنو مسکراتا ہوا دوبارہ اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔

''میں اگر چاہوں تو اس حالت میں تمہیں مار مار کر بے حال بھی کر سکتا ہوں۔'' اس نے شیری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔ اسی لیے میں نے تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی ہے تاکہ تم زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہیں کرو۔''

شیری نے کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ کیبن کی دیوار میں بنی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ نہر کا پاٹ اب بہ دشوار ہو گیا تھا اور کنارے پر بانسوں سے بنی ہوئی جھونپڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ کنارے پر ناریل کے بہت سے درخت بھی لگے ہوئے تھے اور ان درختوں، کے درمیان تھائی عورتیں اور مرد ادھر ادھر آتے جاتے دکھائی دے رہا تھا۔ شیری نے محسوس کیا کہ لانچ آہستہ آہستہ کنارے ہی کی طرف جا رہی تھی۔

بالآخر وہ لانچ کنارے پر رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی لانچ چلانے والا کیبن میں داخل ہو گیا۔ وہ ارنو کو بتانے کے لیے آیا تھا کہ وہ یہاں سے لانچ چھوڑ کر جا رہا تھا۔ ارنو نے کچھ رقم دی اور وہ شیری کی طرف دھیان دیے بغیر لانچ سے اتر گیا۔ شیری کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لانچ چلانے والا کس قسم کا آدمی تھا۔ اسے گویا اپنے معاوضے کے علاوہ کسی اور بات کی پروا ہی نہیں تھی۔ لانچ چلانے والے کے جانے کے بعد ارنو بھی کیبن سے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کیلے کے بڑے پتوں میں ابلے ہوئے چاول اور اناس کی بھاجی رکھی ہوئی تھی یہ کھانا اس نے کنارے پر موجود کسی مقامی عورت سے خریدا تھا۔

''لو یہ کھالو'' اس نے کیلے کا ایک پتا شیری کی طرف بڑھا دیا۔ ''بھوکی پیاسی رہو گی تو توانائی زائل ہو جائے گی۔''

شیری کو اس کی یہ بات معقول معلوم ہوئی۔ اس کا ایک ہاتھ ابھی تک آزاد تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے ارنو سے کیلے کا پتا لیا اور جلدی جلدی کھانے لگی۔ ارنو اسے اس طرح کھاتے دیکھ کر مسکرائے جا رہا تھا۔ لیکن شیری نے اب اس کی سنگ دلانہ مسکراہٹ کی طرف دھیان دینا چھوڑ دیا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ارنو باہر چلا گیا۔ لانچ نے پھر آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ اس بار شاید ارنو ہی لانچ چلا رہا تھا اور اس نے بہت ہی سوچ سمجھ کر باقاعدہ منصوبے کے تحت شیری کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈالی تھی تاکہ وہ اس کے خلاف کچھ بھی نہ کر سکے۔

شیری کھڑکی سے باہر جھانکتی رہی۔ کنارا تیزی سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ پھر لانچ کی رفتار اپنے اعتدال پر آ گئی ارنو لانچ کو چلتا چھوڑ کر کیبن میں آ گیا اور اس نے بنچ کے نیچے سے کپڑے میں ڈھکی ہوئی کوئی چیز نکال لی۔ شیری بڑے دھیان سے اس کی حرکتیں دیکھتی رہی تھی۔ پھر جب ارنو نے وہ کپڑا ایک طرف ہٹایا تو یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ وہ ایک ٹرانسمیٹر تھا۔ ایسا ٹرانسمیٹر جس کے ذریعے کسی خاص فاصلے تک رابطہ قائم کیا جا سکتا تھا۔

ارنو نے اس کی طرف دھیان دیے بغیر اس ٹرانسمیٹر کا بٹن دبا کر کسی سے رابطہ قائم کرنا شروع کر دیا۔

''ہیلو ہیلو میں ارسن بول رہا ہوں۔ ہیلو میں ارسن ہوں۔''

''ہیلو ارسن۔'' دوسری طرف سے کسی کی آواز سنائی دی۔ ''بہت دیر میں تمہارا پیغام ملا ہے۔''

''ہاں ڈاکٹر ذرا دیر ہو گئی۔'' ارنو نے کہا۔ ''ویسے بے فکر رہو۔ جائیداد کے کاغذات میرے قبضے میں ہیں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہوئی۔'' دوسری طرف سے خوشی بھری آواز آئی۔ ''کوئی دشواری تو نہیں ہوئی۔''

''چھوٹی سی گڑبڑ ہو گئی۔ کاغذ کا ایک پرزہ پھسل کر دریا میں جا گرا تھا۔''

''اوہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''یہ اتفاقاً ہوا تھا ڈاکٹر تم تو جانتے ہی ہو کہ میں کتنی احتیاط سے کام کرنے کا عادی ہوں۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اصل کاغذات تو میرے قبضے میں ہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''کل رات کو تم سے ملاقات ہو گی اوور۔''

اس کے ساتھ ہی ان دونوں کی گفتگو ختم ہو گئی۔ ارنو نے ٹرانسمیٹر واپس رکھ دیا اور شیری پر ایک نظر ڈالتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شیری نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنا سر کیبن کی دیوار سے ٹکا لیا۔ وہ اس ڈاکٹر کی آواز کو دھیان میں لا رہی تھی۔ وہ آواز اس کے لیے اجنبی تو تھی لیکن اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ کوئی مہذب اور پڑھا لکھا آدمی ہے ایسا آدمی جو بہت سوچ سمجھ کر منصوبے بناتا ہے اور ان پر عمل کرنے کے لیے ارنو جیسے آدمی کی خدمات حاصل کیا کرتا ہے۔

☆☆☆

''تمہیں کیا ہو گیا ہے تم بتاتے کیوں نہیں؟'' کرائس نے بے تابی سے ڈیوٹی کو جھنجوڑ دیا۔ ''کہاں ہے شیری۔''

ڈیوٹی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا اس کے ذہن میں ارنو کی آواز کی بازگشت آ رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر پولیس کو یا کسی کو بتایا گیا تو وہ شیری کو جان سے مار دے گا اور ڈیوٹی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ذرا سی غلطی سے شیری کی جان چلی جائے جو اس کے لیے ماں کی طرح تھی جس نے ڈیوٹی کو بے انتہا محبت دی تھی۔

ڈیوٹی کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ اس کے اندر اتنا حوصلہ، اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ وہ لانچ سے چھلانگ لگانے کے بعد مسلسل تیرتا ہی رہا تھا۔ اور اس کی یہ جدوجہد اس وقت ختم تھی جب برابر سے گزرتی ہوئی ایک کشتی والوں نے اسے دیکھ لیا تھا اور اس کی جان بچالی تھی۔ وہ لوگ ایک لفظ بھی انگریزی کا نہیں جانتے تھے۔

لیکن جب ڈیوٹی نے اورینٹل ہوٹل کا نام لیا تو انہوں نے اسے اورینٹل ہوٹل تک پہنچا دیا تھا۔ ڈیوٹی نے ان کا شکریہ ادا کر کے بڑی تیزی سے ہوٹل کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ اور ہوٹل کے دروازے پر ہی کرائس نے اسے آواز دے کر روک لیا تھا اور شیری کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا تھا۔ کرائس بہت پریشان معلوم ہوتا تھا۔

''تم بتاتے کیوں نہیں کہاں ہے شیری۔'' کرائس نے پھر پوچھا۔

''میں نہیں جانتا وہ کہاں ہے۔'' ڈیوٹی نے بڑے کھوکھلے لہجے میں جواب دیا۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ تم کیسے نہیں جانتے تم اس کے ساتھ تھے اور تم یہ کہہ رہے ہو کہ تمہیں نہیں معلوم۔''

اسی دوران پولیس کا ایک آفیسر ان دونوں کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

''بچے اس طرح کوئی بات نہیں بتایا کرتے۔'' وہ کرائس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا پھر

ڈیوٹی سے مخاطب ہوا۔ ''بیٹے میرا نام تھارنگ ہے۔ میرا بیٹا بھی تمہاری عمر کا ہے اور اسے ٹی وی پر انگریزی فلمیں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ امریکی جاسوس بہت زبردست ہوتے ہیں۔ وہ ذرا سی دیر میں مجرم کو پکڑ لیتے ہیں۔ بشرطیکہ ہمیں صحیح بات معلوم ہو جائے کیوں ٹھیک ہے نا۔''

ڈیوٹی نے غیر ارادی طور پر اپنی گردن ہلا دی۔

''یہ بات ہوئی نا۔'' تھارنگ مسکرانے لگا۔ ''اب جیسے میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے سر پر چوٹ لگی ہوئی ہے اور یہ چوٹ لگی نہیں بلکہ لگائی گئی ہے کیوں۔''

ڈیوٹی کے لیے مزید برداشت کرنا ناممکن تھا۔ اس نے ڈبڈباتی ہوئی نگاہوں سے تھارنگ کی طرف دیکھا پھر سسکتے ہوئے اب تک کی کہانی سنانی شروع کر دی۔

☆☆☆

مائیکل آندھی کی رفتار سے گاڑی چلاتا ہوا قونصل خانے پہنچا تھا۔

وہ کچھ پہلے ایک ہوٹل میں بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا کہ اسے اطلاع دی گئی کہ قونصل خانے سے اس کے لیے ایک فون آیا ہے۔ فون پر ہیریسن تھا جس نے اسے فوراً ہی پہنچنے کی تاکید کی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق کوئی ہنگامی معاملہ پیش آ گیا تھا۔

قونصل خانے کی عمارت میں آتے ہی وہ سیدھا پریس اتاشی ہیریسن کے کمرے میں پہنچ گیا۔ ہیریسن نے اسے دیکھتے ہی اس کی طرف ایک لمبا چوڑا ٹیلی گرام بڑھا دیا۔

''یہ معاملہ اسی شیری جونز کا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ بدقسمت لڑکی اب بنکاک جا کر پھنس گئی ہے۔''

مائیکل کا دل دھڑک اٹھا۔ اسے نہ جانے کیوں اس لڑکی سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ حالانکہ ہانگ کانگ میں ہزاروں امریکی آیا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ جرائم بھی پیش آتے تھے۔ وہ مصیبت زدہ بھی ہوتے تھے لیکن اس سے پہلے اس نے بھی کسی کے لیے اتنی ہمدردی اور اتنی اپنائیت محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے جلدی جلدی ٹیلی گرام پڑھنا شروع کر دیا۔

اس میں لکھا تھا ''ایف بی آئی ہانگ کانگ پولیس سے درخواست کرتی ہے کہ وہ شیری جونز نامی ایک امریکی لڑکی کے اغوا کے سلسلے میں اس کی مدد کرے۔ اس لڑکی کو بنکاک میں اغوا کیا گیا ہے اور اغوا کرنے والے کا نام ارنو بتایا جاتا ہے۔ دریں اثناء یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ شیری کے انکل ڈان جونز کو امریکا میں ایک ٹیلی گرام موصول ہوا ہے جس میں شیری کے عوض بیس لاکھ ڈالر کا معاوضہ طلب کیا گیا ہے۔ اس ٹیلی گرام میں کہا گیا ہے کہ ڈان یہ رقم تین دنوں کے اندر ہانگ کانگ میں ادا کرے اور پولیس کو اطلاع دینے کی کوشش نہ کرے۔ ڈان جونز کل صبح گیارہ بجے والے طیارے سے ہانگ کانگ پہنچ رہا ہے درخواست کی جاتی ہے کہ ڈان جونز سے ہانگ کانگ ایئرپورٹ پر ملاقات کر لی جائے اور اس کے ساتھ تعاون کیا جائے۔''

مائیکل اس ٹیلی گرام کو پڑھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ اسے شیری کا خیال آنے لگا تھا۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی۔ باوقار اور باحوصلہ۔ لیکن وہ اب اتنی حوصلہ مند بھی نہیں تھی کہ کسی ظالم اور خوں خوار شخص سے مقابلہ کر سکتی۔ نہ جانے اس بے چاری پر کس قسم کا تشدد ہو رہا ہوگا۔

مائیکل نے فوری طور پر دو عدد ٹیلی گرام ٹوکیو اور واشنگٹن روانہ کر دیے۔ ٹوکیو والے ٹیلی گرام میں اس نے وہاں کی پولیس سے درخواست کی تھی کہ وہ مرنے والی لڑکی آئے ساکو کے بارے میں مکمل تفصیلات مہیا کر دے۔ اس کا خیال تھا کہ اس لڑکی کی موت کا شیری جونز کے اغوا سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے احتیاطاً معلوم کر لینا مناسب سمجھا تھا۔

واشنگٹن والے ٹیلی گرام میں اس نے حکام کو ان واقعات سے آگاہ کر دیا تھا جو شیری جونز کو ہانگ کانگ میں پیش آئے تھے اس نے لکھا تھا کہ پرس چھیننے والے کا نام پولیس کو معلوم ہو گیا تھا۔ اس کا نام

چن وانگ تھا اور وہ ایک آوارہ گرد آدمی تھا اور ہانگ کانگ کی پولیس کے مطابق اس آدمی نے یہ حرکت خود سے نہیں کی تھی۔ بلکہ کسی نے اسے معاوضہ ادا کر کے یہ حرکت کروائی ہو گی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ چن وانگ کی خودکشی کے بعد یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ایسی حرکت کرانے والا کون تھا۔

ٹیلی گرام روانہ کرنے کے بعد اس نے بنکاک کے لیے ایک کال بک کرائی۔ وہ وہاں کے پولیس میجر ینگودا سے بات کرنا چاہتا تھا۔

''وہ آدمی اس لڑکی کو اغوا کر کے ایک لانچ میں بٹھا کر جنوب کی طرف لے گیا تھا۔'' ینگودا نے بتایا۔ ''ہماری لانچیں اسے تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک دوسری خبر یہ ہے کہ کراس نامی ایک امریکی اس بچے کو لے کر ہوٹل سے غائب ہو گیا ہے۔ جو بچہ شیری جونز کے ساتھ رہتا ہے ہم نے اپنے آدمی ایئرپورٹ پر بھی لگا دیے ہیں تاکہ وہ شخص بنکاک سے فرار نہ ہو سکے۔ ہمیں بھی اس بچے کی فکر ہے۔''

گفتگو ختم ہونے کے بعد مائیکل سناٹے میں بیٹھا رہ گیا اسے پہلے تو شیری کی طرف سے پریشانی تھی اور اب ڈیوٹی بھی غائب ہو گیا تھا۔ مائیکل قونصل خانے سے نکل کر اسی وقت انسپکٹر لینڈ کے پاس آ گیا جہاں چینی پولیس آفیسر بون بھی موجود تھا۔ یہ دونوں بھی اسی کیس کے سلسلے میں باتیں کر رہے تھے۔ انسپکٹر لینڈ کی میز پر وہ خط رکھا ہوا تھا جو اغوا کرنے والوں نے شیری کے چچا ڈان جونز کو روانہ کیا تھا۔ مائیکل کو دیکھتے ہی انسپکٹر لینڈ نے وہ خط اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس میں لکھا تھا۔

''تمہاری بھتیجی کو ہم لوگوں نے اغوا کر لیا ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ہے اور اس وقت تک ٹھیک رہے گی جب تک تم ہماری ہدایت پر عمل کرتے رہو گے۔ تمہارے لیے ہدایت یہ ہے کہ تم بیس لاکھ امریکی ڈالر لے کر ہانگ کانگ پہنچ جاؤ اور یہاں تمہارا قیام پینن سولا ہوٹل میں ہونا چاہیے۔ یہیں تم سے فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا جائے گا۔ یہ پیغام ارسن کی طرف سے ہوگا۔ اگر تم نے ان ہدایات پر عمل نہیں کیا تو تین دنوں کے بعد تمہاری بھتیجی کو گولی ماردی جائے گی۔''

مائیکل نے یہ خط پڑھ کر واپس رکھ دیا۔ ان لوگوں کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اس شخص کی ہدایت پر عمل کرتے رہیں۔

اس رات مقررہ وقت پر ڈان جونز بھی ہانگ کانگ پہنچ گیا۔ ایئرپورٹ پر مائیکل، لینڈ اور بون تینوں ہی موجود تھے لیکن ان میں سے کسی نے اس سے ایئرپورٹ پر ملاقات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ تینوں دور رہ کر اس کی نگرانی کرتے رہے تھے۔ ڈان ہدایت کے مطابق امریکہ سے اپنے ساتھ بیس لاکھ ڈالر بھی لیتا آیا تھا۔ یہ کثیر رقم اس کے سوٹ کیس میں تھی جسے اس نے اپنے ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا۔ ایئرپورٹ سے وہ سیدھے پینن سولا ہوٹل آ گیا تھا۔ اس کے لیے پہلے سے ایک کمرہ مخصوص تھا۔

کچھ دیر بعد وہ تینوں بھی اس کے کمرے میں پہنچ گئے اور اپنا تعارف کروایا۔ ڈان ان تینوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

''مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ پولیس اس معاملے میں بہت مستعدی کا ثبوت دے رہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''چاہے وہ واشنگٹن کی پولیس ہو یا ہانگ کانگ کی ہر جگہ مجھ پر توجہ دی جا رہی ہے۔''

''یہ ہمارا فرض ہے جناب۔'' انسپکٹر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''واشنگٹن کی پولیس نے کچھ پوچھا تھا آپ سے۔''

''انہوں نے یہ دریافت کیا تھا کہ کتنے لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ میں بہت مختصر مدت میں بیس لاکھ ڈالر اکٹھا کر سکتا ہوں۔''

''پھر آپ نے کیا جواب دیا۔''

''یہ بات تو بہت سوں کو معلوم ہے۔ مثلاً میرے کاروباری دوست، میرا وکیل، بینک کے افسران اور فرم کے ڈائریکٹر وغیرہ میں نے وہاں کی

پولیس کو ان لوگوں کے نام لکھوا دیے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس قسم کی حرکت کر سکے۔ وہ سب ہی اچھے لوگ ہیں۔''

''انسان کو بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔'' بون نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''بہرحال آپ کو جب کوئی فون موصول ہو تو آپ فوراً ہمیں فون نمبر نو نو اور نو پر بتا دیں۔ ہمارا آدمی دوسری طرف آپ کے فون کا منتظر رہے گا۔ نمبر تو آپ کو یاد ہو گیا ہوگا نو نو اور نو۔''

☆☆☆

وہ رات بہت ہی بے رحم تھی۔ اذیت ناک اور صبر آزما ہوتی جا رہی تھی۔

شیری کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص اسے کہاں لے جا رہا ہے۔ یہ دریائی سفر کتنی دیر تک جاری رہے گا۔ اس کی کوئی انتہا بھی ہوگی یا اسی طرح دریا کے سینے پر سفر کرتے کرتے اسے موت آ جائے گی۔ موت کا تصور اس آدمی کے رویے سے بار بار جاگ اٹھتا تھا۔ وہ آدمی اسی قسم کا معلوم ہوتا تھا جو ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر دوسروں کو قتل کر دیا کرتے ہیں جس طرح اس نے ڈیوٹی کے ساتھ کیا تھا۔ اس پر گولیاں چلائی تھیں اور اسے دریا کی موجوں کے حوالے کر کے اپنی لانچ آگے بڑھا دی تھی۔

وہ رات ان دونوں کے درمیان بڑی خاموشی سے گزر گئی تھی۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی بات نہیں کی تھی ارنو لانچ چلاتا رہا تھا اور شیری اپنے خیالوں میں الجھی رہی تھی۔

اس وقت اس کے اندازے کے مطابق صبح کے تین یا ساڑھے تین بج رہے ہوں گے۔ جب ارنو نے لانچ روک لی۔

شیری نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہ لانچ ایک ویران کنارے کے پاس آ کر رک گئی تھی اور کنارے پر ایک چھوٹی کشتی کھڑی تھی جسے سمپان کہا جاتا ہے شیری نے محسوس کیا اس سمپان میں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس میں لالٹین تک روشن نہیں تھی اور نہ ہی کسی کے بولنے یا کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔

''چلو۔'' ارنو نے اس سمپان کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہمیں یہاں سے اس سمپان میں بیٹھنا ہے۔''

''کیا۔'' شیری جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو۔''

''جو کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو سمجھیں۔'' اس نے اپنے ہاتھوں میں ٹرانسمیٹر اور دوسری چیزیں اٹھا لیں۔ ''پہلے تم جاؤ میں آ رہا ہوں۔''

شیری نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا پھر لانچ سے سمپان میں چھلانگ لگا دی۔ ارنو بھی اس کے ساتھ ہی سمپان میں آ گیا تھا۔ اس نے دھکا دے کر شیری کو ایک طرف بٹھایا اور سمپان چلانا شروع کر دیا۔ اس کی ہر حرکت سے بہت ہی اطمینان ظاہر ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے معلوم ہو کہ اسے کہاں کہاں جانا ہے کیا کرنا ہے۔ یہ سمپان طے شدہ منصوبے کے تحت یہاں کھڑی کی گئی تھی۔

صبح کے وقت ارنو نے ایک اور حرکت کی۔ اس نے شیری کے احتجاج اور اس کی تکلیف کی پروا کیے بغیر اس کے منہ میں کپڑے کا ایک ٹکڑا ٹھونس دیا۔ پھر اس کی پیشانی سے ایک رسی گزار کر اس کے دونوں سرے سمپان کے ایک ستون سے باندھ دیے وہ اب پوری طرح بے بس ہو چکی تھی۔ وہ اس ظالم شخص کے رحم و کرم پر تھی۔ جس کا مزاج پل پل بدلتا رہتا تھا۔ اس حرکت کے بعد وہ شیری کے سامنے آ کر بیٹھ گیا اور اس طرح اس کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا جیسے اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔

''ڈاکٹر تو بے وقوف ہے۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''جو لڑکیوں کو بے بس کرنے کے لیے لمبا چوڑا چکر چلاتا ہے جبکہ میں اس قسم کا کوئی کام نہیں کرتا۔ میرا اصول یہ ہے کہ مار پیٹ کر برابر کر دو۔ لڑکی خود ہی سیدھی ہو جائے گی۔ جیسا میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں نے اگر تمہیں ذرا بھی ڈھیل دی تو تم مصیبت کھڑی کر دو گی۔ اسی لیے میں نے تمہیں اس طرح باندھ دیا ہے۔ اب تو تم کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ ہاں اس کے باوجود اگر تم نے بدمعاشی

دکھانے کی کوشش کی تو میں ڈاکٹر کی پروا نہیں کروں گا۔ تمہیں جان سے مار کر اسی دریا میں پھینک دوں گا سمجھیں۔''

شیری نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ شدید بے بسی اور شدید توہین کے احساس سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

یہ سفر دوپہر تک جاری رہا۔ شیری کو دھمکی دینے کے بعد ارنو نے پھر چپ سادھ لی تھی وہ سمپان چلاتا رہا تھا جبکہ اس دوران شیری کی آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ سونا نہیں چاہتی تھی لیکن اس کی آنکھیں بوجھل ہوتی چلی گئی تھیں اور اسے نیند آ گئی تھی۔ پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو رات دور ہو چکی تھی۔ سورج کی دھوپ براہ راست اس کے جسم پر پڑ رہی تھی۔ لیکن وہ اس سے بچنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سمپان کو پھر کسی کنارے پر لا کر روک دیا گیا تھا۔ یہ کنارہ بھی ویران تھا۔ البتہ دور چاولوں کے کھیت کے درمیان بانسوں سے بنی ہوئی جھونپڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ ارنو ٹرانسمیٹر اٹھا کر اس کے پاس لے آیا تھا اور ٹرانسمیٹر اس کے قریب رکھ کر اس نے شیری کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال لیا۔

''یہ دیکھ لو۔'' وہ شیری کی طرف کاغذ کا ایک پرزہ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اس میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ تمہیں اس ٹرانسمیٹر میں بولنا ہے۔'' اس نے شیری کا ایک ہاتھ کھول دیا۔

شیری نے کاغذ کا وہ پرزہ اس کے ہاتھ سے لے لیا، ارنو نے اس میں لکھا تھا۔ ''میں شیری جونز بول رہی ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جا رہا ہے اور میرے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، میرا یہ پیغام انکل ڈان کے لیے ہے۔ انہیں یہ بتا دیا جائے کہ وہ میرے لیے رقم کا بندوبست کریں۔ میں شیری جونز ہی بول رہی ہوں اور حوالے کے لیے یہ بتانا چاہتی ہوں کہ انکل نے ایک بار مجھے ایک ڈائری تحفے میں دی تھی اور ایک بار میری چابی گم ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے بہت پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔''

شیری نے چونک کر ارنو کی طرف دیکھا۔ ان لوگوں کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ انکل ڈان نے اسے ایک ڈائری تحفے میں دی تھی اور اس کی چابی گم ہو گئی تھی۔ یہ تو ایسی بات تھی جو اس کے اور انکل کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا پھر اس کا کیا مطلب ہو سکتا تھا۔

ارنو ٹرانسمیٹر پر ڈاکٹر سے باتیں کرنے لگا۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ ابھی تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ دوسری طرف سے ڈاکٹر نے بھی یہی خبر دی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق اس کی بھی کارروائی بڑی کامیابی سے جاری تھی۔ ڈاکٹر سے باتیں کرنے کے بعد ارنو نے ٹرانسمیٹر پر ایک دوسری فریکوئنسی سیٹ کی اور مائک شیری کی طرف بڑھا دیا۔

''چلو جو کچھ لکھا ہے وہ بولنا شروع کر دو اور ہاں اپنی آواز کنٹرول میں رکھنا۔ اگر مجھے ذرا بھی یہ احساس ہوا کہ تم کسی قسم کا اشارہ دینے کی کوشش کر رہی ہو تو اس وقت میں تمہیں مارنا شروع کر دوں گا۔ سمجھیں..... چلو شروع ہو جاؤ۔''

شیری اس وقت انسان سے زیادہ کسی ایسے جانور کی طرح تھی جو اپنے آقا کے اشارے پر عمل کر رہا ہو۔ مجبوریوں کا ایسا لمحہ اس کے پاس کبھی نہیں آیا تھا۔ اس نے ارنو کے کہنے کے مطابق اس مائک پر وہی بولنا شروع کر دیا جو اس کاغذ پر لکھا گیا تھا۔

پیغام پڑھ لینے کے بعد وہ سسکتی ہوئی ایک طرف بیٹھ گئی۔ جبکہ ارنو نے مسکراتے ہوئے ٹرانسمیٹر بند کیا اور دوبارہ سمپان کی پتواریں سنبھال لیں۔

ایک اور رات ان کے سروں پر مسلط ہو گئی۔ اس دوران سفر جاری رہا تھا۔ شیری کو ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ بنکاک سے کتنی دور نکل آئی ہے۔ لیکن ارنو ان نہروں کے جال سے اچھی طرح واقف معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ پہلے ہی ان آبی شاہراہوں سے گزر چکا ہے۔

اب وہ سمپان ایک ایسی جگہ کھڑا تھا۔ جس کے دونوں ہی کناروں پر دور دور تک کیچڑ پھیلی ہوئی تھی۔

چاند تو نہیں نکلا تھا۔ لیکن ستاروں کی روشنی میں سوائے جھاڑیوں اور سرکنڈوں کی جھاڑیوں کے اور کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ارنو پتوار ہاتھ میں لیے لیے اونگھنے لگا تھا۔ اس پر نیند اور تھکن مسلط ہو رہی تھی۔ اس وقت شیری کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہیں تھیں جبکہ اس کے جسم کے گرد بندھی ہوئی رسی کھول دی گئی تھی، ارنو نے یہ اس لیے کیا تھا کہ وہ کچھ دیر لیٹ کر آرام کر سکے۔ اس کے علاوہ اسے یہ اطمینان تھا کہ وہ کہیں بھی نہیں جا سکتی۔ بے پناہ خوف نے اس کو بے حوصلہ کر دیا ہے۔ لیکن شیری نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اسے اپنے بچاؤ کے لیے ایک کوشش کرنی چاہیے اس کا انجام کچھ بھی ہو۔ وہ دھیرے سے کھڑی ہوئی۔ اس کے اٹھنے سے سمپان ڈگمگ کرنے لگا تھا۔ اس نے خوف زدہ ہو کر ارنو کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح اونگھ رہا تھا۔ شیری نے ایک قدم آگے بڑھایا اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے پھیلائے تھے۔ وہ اسی طرح آگے آئی، ارنو کے پاس پہنچی پھر اس نے اپنی پوری طاقت سے ارنو کو دھکا دے دیا۔ ارنو نے گرتے گرتے بھی سنبھلنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ جھپاک سے پانی میں جا گرا۔ اس کے گرتے ہی شیری نے بھی چھلانگ لگا دی۔ اس کے دونوں پاؤں کیچڑ میں دھنس گئے تھے۔ لیکن وہ دوڑی چلی جا رہی تھی۔ سرکنڈوں اور دریاؤں کی جھاڑیوں کے درمیان دوڑتی چلی گئی۔ اس نے پیچھے ارنو کی آواز سنی جو زور زور سے اسے پکار بھی رہا تھا اور اسے برا بھلا بھی کہے جا رہا تھا۔ لیکن اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ہر طرف کیچڑ پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے دوڑا نہیں جا رہا تھا۔ لیکن جان کا خوف اسے دوڑائے جا رہا تھا۔ اس کی سانس بری طرح پھولنے لگی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ لیکن وہ رک نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنے پیچھے ارنو کے قدموں کی آہٹیں سن رہی تھی۔ وہ اس کی طرح بدحواس ہو کر نہیں دوڑ رہا تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ وہ جب چاہے اسے پکڑ سکتا ہے۔

پھر اس اندھیرے اور دھندلکے میں شیری کے سامنے کسی عمارت کے آثار ابھر آئے۔ یہ عمارت بہت بڑی تھی۔ قدیم طرز کی بنی ہوئی یہ عمارت اپنی بناوٹ کے لحاظ سے کوئی عبادت گاہ معلوم ہوتی تھی۔ شیری دوڑتی ہوئی اس عمارت میں داخل ہو گئی۔ یہ واقعی ایک عبادت گاہ ہی تھی۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ایک عرصے سے ویران پڑی ہو۔ اس طرف کوئی نہ آتا ہو۔ عمارت کے ہال کے اندر بھی اندھیرا تھا۔ شیری دوڑتے دوڑتے کسی چیز سے ٹکرا گئی۔ یہ ٹکر اتنی شدید تھی کہ وہ کچھ دیر کے لیے اپنے حواس گم کر بیٹھی تھی۔ پھر جب اس کے اعصاب سنبھلے تو اس نے ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کر دیا۔ وہ پتھر کے کسی مجسمے سے ٹکرائی تھی۔ اور یہ مجسمہ یقیناً گوتم بدھ کا ہو سکتا تھا۔ سکون اور آشتی کی تلقین دیتی ہوئی مہاتما بدھ کی ذات کے تصور نے اسے بھی تسکین پہنچا دی۔ وہ اس مجسمے کے بازو کو پکڑ کر کھڑی ہو گئی دور عمارت کے باہر سے ابھی تک ارنو کے دوڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

☆☆☆

''میں نے اس سے پہلے کسی کیس میں تمہیں اتنا پریشان نہیں دیکھا۔'' انسپکٹر لینڈ نے مسکراتے ہوئے مائیکل سے کہا۔ ''اس لڑکی میں کوئی خاص بات ہے کیا۔''

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' مائیکل نے ایک گہری سانس لی۔ ''مجھے نہ جانے کیوں وہ لڑکی بہت اچھی لگی ہے۔ تم میری بات کو غلط مت سمجھنا۔ یہ مسئلہ کچھ اور ہے۔''

انسپکٹر لینڈ مسکراتے ہوئے میز پر رکھی ہوئی فائلوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مائیکل اسے کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ شیری ہی کے سلسلے میں انسپکٹر لینڈ کے پاس آیا تھا۔ لیکن ابھی تک حالات بدستور تھے۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔

میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انسپکٹر لینڈ نے بے دھیانی سے ریسیور اٹھایا۔ پھر کچھ سن کر ریسیور مائیکل کی طرف بڑھا دیا۔

''ہیلو۔'' مائیکل نے کہا۔ ''میں مائیکل بول رہا ہوں۔''

''انسپکٹر مائیکل میں کرائس ہوں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''کیا۔'' مائیکل سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''تم کہاں سے بول رہے ہو؟ کہاں ہو اس وقت، کیا وہ بچہ تمہارے ساتھ ہے؟''

''میں یہیں ہانگ کانگ کے کامارا ہوٹل سے بول رہا ہوں۔'' کرائس نے کہا۔ ''ڈیوٹی میرے ساتھ ہے۔ میں ابھی تمہارے پاس آرہا ہوں۔''

دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا تھا۔ مائیکل نے ریسیور رکھتے ہوئے لینڈ کو صورت حال بتا دی۔

''خدا کی پناہ۔'' لینڈ نے ایک گہری سانس لی۔ ''تو وہ آدمی ہانگ کانگ پہنچ گیا۔ وہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ رقم لینے آیا ہو۔''

انسپکٹر لینڈ کے خدشات کا مائیکل کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ انسپکٹر لینڈ نے فوری کارروائی کرتے ہوئے اسی وقت اپنے دو آدمی کو مارا ہوٹل روانہ کر دیے۔ انہیں تاکید کی گئی کہ وہ کرائس پر نگاہ رکھیں۔ انسپکٹر لینڈ اپنے آدمیوں کو کرائس کی نگرانی کی ہدایت دے کر فارغ ہوا ہی تھا کہ بنکاک سے پولیس جنرل ینگودا کا فون آ گیا۔ ینگودا نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ لانچ تو ان لوگوں کو لے گئی ہے جس میں ارنولڑ کی کو لے کر سفر کر رہا تھا۔ لیکن ان دونوں کا ابھی تک کوئی پتا نہیں چل سکا ہے۔ وہ لانچ ایک غیر آباد کنارے پر کھڑی ہوئی ملی تھی۔ انسپکٹر لینڈ نے بھی اسے یہ بتا دیا کہ کرائس اس بچے ڈیوٹی کو لے کر ہانگ کانگ پہنچ چکا ہے۔ اس کے بعد وہ دونوں بہت دیر تک شیری کے معاملے پر گفتگو کرتے رہے ان دونوں کا موقف یہی تھا کہ اس کی بازیابی کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں نقصان کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ اگر شیری کی ہلاکت کے بعد ارنو گرفتار بھی ہو گیا تو اس سے کیا حاصل ہوسکتا تھا۔ اس گفتگو کے بعد انسپکٹر لینڈ نے ریسیور رکھ دیا تھا۔

''ایسا لگتا ہے کہ تم آج سارا دن فون پر باتیں ہی کرتے رہو گے۔'' مائیکل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں صورت حال ہنگامی ہو گئی ہے۔'' انسپکٹر لینڈ نے اپنی گردن ہلائی۔ ''مسئلہ یہ ہے کہ اس ایک کیس کی جڑیں کئی شہروں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ لڑکی امریکا سے چلتی ہے۔ ٹوکیو آتی ہے، ٹوکیو میں اس کے ساتھ ایک حادثہ پیش آتا ہے۔ وہ ٹوکیو سے ہانگ کانگ آ جاتی ہے۔ یہاں بھی ایک واقعہ ہوتا ہے۔ وہ بنکاک جاتی ہے، وہاں اسے اغوا کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح کئی شہر اس ایک کیس میں ملوث ہو گئے ہیں۔ بہرحال ہمارے پاس ٹوکیو پولیس کی رپورٹ آ گئی ہے۔ اگر تم دیکھنا چاہو تو میں تمہیں دے سکتا ہوں۔''

''ضرور ضرور۔'' مائیکل جلدی سے بول پڑا۔ ''مجھے بھی ٹوکیو والے معاملے نے الجھا دیا ہے۔''

انسپکٹر لینڈ نے اس کی طرف ایک فائل بڑھا دی۔ اس فائل میں ٹوکیو پولیس کی پوری رپورٹ موجود تھی۔ اس رپوٹ کے مطابق اس ٹیکسی ڈرائیور کا پتا چلا لیا گیا تھا جو امپریل ہوٹل سے شیری کو رات کے وقت لے گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنی ٹیکسی میں بیٹھا کسی سواری کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک امریکی اس کے پاس آیا اور اس نے پانچ ہزار کی پیش کش کی، یہ پیش کش اس لیے تھی کہ شیری جونز کو اپنی ٹیکسی میں بٹھا لے۔ ڈرائیور کا یہ کہنا ہے کہ اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ آدمی اس لڑکی کو کہاں لے جا رہا ہے۔ اس امریکی کا یہ کہنا تھا کہ وہ راستے میں بتا دے گا لیکن کچھ بتانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کیونکہ اس سے پہلے ہی وہ لڑکی ٹیکسی سے خود کر فرار ہو چکی تھی۔ اس رات وہ ڈرائیور جب اپنی دوست مس آئی ساکو سے ملا تو وہ بہت خوف زدہ ہو رہا تھا۔ اس نے آئی ساکو کو ساری بات بتا دی۔ آئی ساکو بھی یہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔ پھر آئی ساکو کو یہ خوف محسوس ہوا کہ کہیں پولیس اس کے دوست ڈرائیور کو نہ پکڑ لے۔ کیونکہ وہ اس

معاملے میں خود بھی ملوث ہو گیا تھا۔ اس نے شیری جونز کو فون کرنے کی دھمکی دی۔ لیکن اس ڈرائیور نے کسی طرح اسے روک لیا۔ اس کے بعد وہ امریکی پھر اس ڈرائیور سے ملا اور پھر دونوں آئندہ کا پروگرام بنانے لگے۔ اس طرف آئی ساکو سے برداشت نہیں ہوا اور اس نے شیری کو فون کر کے بلا لیا لیکن یہ بات ارنو کو معلوم ہو گئی اور اس نے آئی ساکو کو دھمکی دی۔ اسی لیے جب شیری آئی ساکو سے ملی تو آئی ساکو نے اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اس کا یہ انکار بھی اس کی زندگی نہیں بچا سکا اور وہ بے چاری اسی رات ہلاک کر دی گئی۔

مائیکل نے فائل بند کر دی۔ اس رپورٹ نے آئی ساکو کی موت کا معمہ حل کر دیا تھا۔ وہ بے چاری بس یونہی ماری گئی تھی اور اس کا مطلب یہ تھا کہ ارنو ایک ایسا بے رحم آدمی تھا جس کے نزدیک انسانی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں تھی، وہ ایک قتل کر چکا تھا اور اس کے لیے شیری کو بھی ہلاک کر دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

اسی لمحے پولیس کے ایک آدمی نے کرائس کے آنے کی اطلاع دی۔ انسپکٹر لینڈ اور مائیکل نے چونک کر ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا پھر لینڈ نے اپنی گردن ہلا دی، پولیس کا آدمی کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی کرائس کمرے میں داخل ہو گیا تھا وہ کچھ الجھا الجھا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ان دونوں سے مصافحہ کیا اور لینڈ کے اشارے پر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر تک خاموشی سے ان لوگوں کو دیکھتا رہا پھر جھنکارتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ لوگوں کو شیری جونز کے اغوا کی خبر تو مل گئی ہو گی۔''

''شیری جونز کا اغوا۔'' لینڈ نے حیرت ظاہر کی۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ..... وہ کب اغوا ہوئی، کہاں اغوا ہوئی؟''

کرائس نے بے اعتباری سے لینڈ کی طرف دیکھا شاید اسے یقین نہیں آیا تھا کہ یہ بات لینڈ کو معلوم نہیں ہے۔

''میرا خیال تھا کہ یہ بات آپ لوگوں کو معلوم ہو گی۔'' اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''بہر حال اسے بنکاک سے اغوا کر لیا گیا ہے اور یہ حرکت ارنو نامی ایک امریکی نے کی ہے۔''

''پھر تم یہاں کیسے چلے آئے؟'' مائیکل نے پوچھا۔

''اگر اس کا اغواء بنکاک میں ہوا ہے تو تمہیں بھی وہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''میں بنکاک ہی میں تھا۔'' کرائس نے بتایا۔ ''لیکن پچھلی رات ہانگ کانگ سے مجھے ایک فون موصول ہوا۔ فون کرنے والا بہت اچھی انگریزی بول رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ان لوگوں نے شیری کو اغوا کر لیا ہے اور اس کے عوض بیس لاکھ ڈالر شیری کے انکل سے طلب کیا گیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ شیری کا انکل ہانگ کانگ پہنچنے ہی والا ہو گا۔''

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آدمی نے تمہیں کیوں فون کیا؟'' لینڈ نے پوچھا۔ ''اس معاملے سے تمہارا کیا تعلق؟''

''میرا تو کوئی تعلق نہیں لیکن اس نے مجھے درمیانی رابطے کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں رقم لینے اور ایک خاص جگہ پہنچانے کے انتظامات کر سکتا ہوں۔ اس نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ میں ایسا کروں گا یا نہیں اس نے بس مجھے اطلاع دی تھی۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ میں اگر شیری جونز کو زندہ دیکھنا چاہتا ہوں تو اسی وقت ہانگ کانگ پرواز کر جاؤں۔''

''کیوں اس آدمی نے تمہارا انتخاب کیوں کیا جبکہ شیری کا چچا بھی ہانگ کانگ میں موجود ہے تو پھر تمہیں اس معاملے میں کیوں ڈالا گیا؟''

''اس آدمی نے یہ بھی کہا تھا کہ چونکہ میں شیری سے محبت کرتا ہوں اسی لیے اس کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔''

''ہوں۔'' مائیکل نے ایک گہری سانس لی۔ ''تم نے بنکاک سے روانہ ہوتے وقت وہاں کے حکام کو صورت حال بتائی تھی۔''

”نہیں مجھے اتنا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔“ کرائس نے جواب دیا۔”اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں آنے کے لیے طیارے کی پرواز میں صرف آدھ گھنٹہ رہ گیا تھا۔ مجھے اسی دوران ایئرپورٹ پہنچنا، ضروری کاغذات کی جانچ پڑتال کے مرحلوں سے گزرنا اور طیارے کو پکڑنا تھا۔ اسی لیے میں وہاں کی پولیس کو بتا ہی نہیں سکا۔ بس اس آدمی کا فون ملتے ہی ایئرپورٹ کی طرف دوڑ لگادی۔“

”اور تم اس بچے کو بھی اپنے ساتھ بنکاک سے یہاں لے آئے کیوں؟“ یہ سوال لینڈ نے کیا تھا۔

”تو اور کیا کرتا...... میں اس بچے کو وہاں کس کے حوالے کرتا۔“ کرائس نے جواب دیا۔”شیری کی وجہ سے مجھے اس بچے سے بھی ہمدردی ہوگئی ہے۔“

”گویا تم یہاں اس لیے آئے ہو کہ شیری کے انکل سے بیس لاکھ ڈالر لے کر اس آدمی کے حوالے کر دو جس نے تمہیں فون کیا تھا۔“ مائیکل نے پوچھا۔

”ہاں میں اسی لیے آیا ہوں۔ کیونکہ مجھ سے یہی کہا گیا ہے۔“

”تمہاری بات تو معقول ہے لیکن ہمارے سامنے دو امکانات ہیں۔“ انسپکٹر لینڈ نے کہا۔”پہلا امکان تو یہ ہے کہ تم خود اس اغوا کرنے والے کے ساتھ ہو سکتے ہو اور چونکہ تمہاری پوزیشن ابھی تک صاف ہے۔ اسی لیے تمہیں بھیجا گیا ہے کہ تم اغوا کرنے والے کی طرف سے رقم وصول کرلو۔“

”اور دوسرا امکان کیا ہے۔“ کرائس نے پہلو بدلا۔ وہ اس وقت غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے اندر آتش فشاں ابلنے لگا ہو۔

”دوسرا امکان یہ ہے کہ تم نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خود ہی رقم وصول کرنے اور کہیں غائب ہو جانے کا منصوبہ بنا لیا ہو۔ بیس لاکھ ڈالر کی رقم معمولی نہیں ہوتی۔“

”تم دونوں جہنم میں جاؤ۔“ کرائس بھڑک اٹھا۔”اگر مجھے اس لڑکی سے محبت نہیں ہوتی تو میں تمہاری اتنی باتیں برداشت بھی نہیں کرتا۔ اور تم لوگ چاہے کچھ بھی کرتے رہو۔ میں شیری کے انکل سے ملنے جا رہا ہوں۔ میرے نزدیک تمہاری باتوں سے زیادہ شیری کی زندگی عزیز ہے سمجھے۔“

”ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا مسٹر کرائس۔“ مائیکل نے وارننگ دی۔”یہ معاملہ پولیس کا ہے اور تمہیں ایک حد میں رہنا ہے، تم ہماری اجازت کے بغیر کچھ بھی نہیں کرو گے۔“

کرائس نے غصے سے ان دونوں کی طرف دیکھا پھر جھلایا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مائیکل نے کہا۔

”لینڈ میں کا مارا جا کر اس بچے سے ملنا چاہتا ہوں اور دیکھتا ہوں وہ کیا کہانی سناتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس معاملے سے کرائس کا کوئی تعلق نہ ہو۔“

مائیکل نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی ایک بار پھر بول اٹھی۔ لینڈ نے جلدی سے ریسیور اٹھالیا تھا۔ مائیکل بھی جلدی سے میز کے پاس آگیا۔ انسپکٹر لینڈ نے کچھ سننے کے بعد اشارہ کیا اور مائیکل نے اپنا کان ریسیور سے لگا دیا۔ اس طرح وہ بھی فون پر ہونے والی گفتگو سن سکتا تھا۔ دوسری طرف سے کسی عورت کی آواز آرہی تھی۔

”میں للی سانگ بول رہی ہوں۔“ عورت نے کہا۔”تم شاید مجھے نہیں جانتے ہو گی میں ایک اداکارہ ہوں۔“

”ہاں مجھے یاد آگیا ہے۔“ لینڈ نے ایک گہری سانس لی۔

”مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ تم جیسی ایک مصروف سی اداکارہ کو ایک انسپکٹر سے بات کرنے کا خیال کیسے آگیا؟“

”بات ہی کچھ ایسی ہے کہ تمہیں فون کرنا ضروری ہوگیا تھا۔“ للی نے کہا۔”ابھی کچھ دیر پہلے میرے پاس ایک آدمی کا فون آیا تھا۔ اس نے اپنا نام تو نہیں بتایا لیکن اس نے یہ کہا ہے کہ میں اس کے کہنے کے مطابق عمل کرتی رہوں اور اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو وہ شیری جونز نامی ایک امریکی لڑکی کو ہلاک کر

دے گا جسے بنکاک میں اغوا کرلیا گیا ہے اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اگر اس لڑکی کے انکل نے رقم ادا نہیں کی تو اس لڑکی کو مرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ کیا چکر ہے۔ وہ کون لڑکی ہے اور اس آدمی نے یہ بات مجھے کیوں بتائی۔''

''تم اس وقت کہاں سے بول رہی ہو؟'' لینڈ نے پوچھا۔

''میڈرین اسٹوڈیو سے۔'' للی نے جواب دیا۔

''اس نے مجھے بھی دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے یہ بات پولیس کو بتائی تو وہ مجھے بھی مار سکتا ہے۔''

''ہم لوگ تمہارے پاس آ رہے ہیں۔'' لینڈ نے کہا۔ ''ہم دو آدمی ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ اخباری نمائندے بن کر آ جانا۔'' للی نے بتایا۔ ''میں تم لوگوں کا انتظار کر رہی ہوں۔''

لینڈ نے ریسیور واپس رکھ دیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو الجھی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اغوا کرنے والوں نے یہ حرکت کیوں کی تھی۔ اس نے ایک طرف تو ایسا ہی فون بنکاک میں مقیم کرائس کو کیا تھا اور دوسری طرف ہانگ کانگ کی ایک اداکارہ کو فون پر یہی بتایا گیا تھا۔ آخر کیوں اغوا کرنے والے آخر کیا چاہتے ہیں۔

☆☆☆

ڈیوٹی سے ملنے کے بعد بھی مائیکل کو کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔

اس کے بیان کے مطابق کرائس نے اب تک اس کا بہت خیال رکھا تھا اور وہ اسے اپنے ساتھ ہانگ کانگ اس لیے لے آیا تھا کہ کہیں وہ بھی مجرموں کے ہتھے نہ چڑھ جائے البتہ اس نے ایک بات یہ بتائی تھی کہ سوزن نامی ایک بوڑھی عورت ان دونوں کو ہر جگہ ملتی رہی تھی۔ شیری اور وہ جہاں بھی جاتے سوزن موجود ہوتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ ان دونوں کا تعاقب کر رہی ہو۔ لیکن یہ محض اتفاق بھی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک بوڑھی عورت تھی اور اس سے کسی قسم کی مجرمانہ سرگرمیوں کے سرزد ہونے کا امکان نہیں ہو سکتا تھا۔ بس اس کے علاوہ ڈیوٹی اور کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔

ڈیوٹی کو ہوٹل پہنچا کر مائیکل ایک بار پھر انسپکٹر لینڈ کے پاس آ گیا تھا اور یہاں سے یہ دونوں میڈرین اسٹوڈیو کی طرف روانہ ہو گئے تھے جہاں انہیں للی سانگ سے ملاقات کرنی تھی۔

وہ جس وقت اسٹوڈیو پہنچے، سانگ اس وقت ہال میں موجود تھی۔ ان دونوں کے آنے کی خبر سن کر اس نے ان دونوں کو ہال ہی میں بلوا لیا۔ وہ ایک خوب صورت عورت ثابت ہوئی تھی۔ جس کے چہرے پر ہر قسم کے تاثرات منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ مائیکل نے اسے دیکھ کر اندازہ لگایا کہ یہ عورت اپنی آنکھوں اور ہونٹوں سے کام لینا جانتی ہے۔

''آیئے میں آپ دونوں کو اپنے کمرے میں لے چلوں۔'' اس نے تعارف کے بعد کہا۔ ''وہ کمرہ گرچہ چھوٹا ہے لیکن وہاں اطمینان سے باتیں ہو سکتی ہیں۔''

وہ دونوں اس کے ساتھ ہو لیے۔ اس کا کمرہ زیادہ چھوٹا نہیں تھا۔ لیکن سانگ نے روایتی انکساری کا مظاہرہ کیا تھا وہ ان دونوں کو صوفوں پر بٹھا کر خود ایک الماری کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس نے الماری کی دراز سے ریشمی کپڑے کا ایک ٹکڑا نکال لیا اور وہ ٹکڑا ان دونوں کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ مجھے میرے فلیٹ کے دروازے پر ملا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''ابھی میں اس کپڑے کو دیکھ کر حیران ہی ہو رہی تھی کہ اس آدمی کا فون آ گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کپڑے کا یہ ٹکڑا اسی نے رکھا ہے اور یہ شیری جونز کے پسندیدہ لباس کا ایک حصہ ہے اور شیری کا چچا اس ٹکڑے کو فوراً پہچان لے گا اور وہ میرے ذریعے رقم دینے کے لیے تیار ہو جائے گا۔''

مائیکل اور لینڈ نے گہری نگاہوں سے کپڑے کے اس ٹکڑے کا جائزہ لیا۔ لیکن اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے کسی قسم کا سراغ لگایا جا سکتا۔

''تم یہ بتاؤ کہ اس آدمی نے تم سے کیا کہا تھا۔'' لینڈ نے پوچھا۔ ''اس کی پوری گفتگو دہرا دو۔''

''اس نے مجھے تھائی لینڈ میں اغوا ہونے والی ایک امریکی لڑکی شیری جونز کے متعلق بتایا تھا۔'' سانگ نے کہنا شروع کیا۔ ''اس نے یہ کہا تھا کہ اس لڑکی کا چچا مطلوبہ رقم لے کر ہانگ کانگ آنے والا ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ اس معاملے سے میرا کیا تعلق ہے؟ میں کیا کرسکتی ہوں۔ تو اس نے مجھے بتایا کہ مجھے کپڑے کا یہ ٹکڑا لے کر اس کے چچا کے پاس جانا ہے اور یہ دکھا کر رقم کے بارے میں بات کر لینی ہے۔ میں نے اس پر انکار کردیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس جھنجٹ میں نہیں پڑوں گی۔ کیونکہ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس پر اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو وہ مجھے تباہ کردے گا۔ اس دھمکی نے مجھے خوف زدہ کردیا ہے انسپکٹر۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مجھے اپنی زندگی سے بہت پیار ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے ان لوگوں سے بہت پیار ہے جن کو میرے ذریعے کھانے کو ملتا ہے، یہ ہم لوگوں کا بہت بڑا المیہ ہے۔ ہم بھوک سے ہر دم خوف زدہ رہتے ہیں۔''

انسپکٹر لینڈ نے اس سے اور بھی بہت سی باتیں دریافت کیں۔ مثلاً اس آدمی کا فون کس وقت آیا تھا۔ اس کا لہجہ کیسا تھا اس نے دوبارہ کب فون کرنے کے لیے کہا ہے۔

''اب آپ لوگ مشورہ دیں کہ میں کیا کروں؟'' سانگ نے پوچھا۔ ''اگر کہیں تو اس کی بات ماننے سے انکار کردوں۔''

''نہیں، نہیں تم وہی کرو جو تمہیں کہا گیا ہے۔'' مائیکل نے کہا۔ ''ہم لوگ حالات کی نگرانی کرتے رہیں گے اور تم پر کسی قسم کی آنچ نہیں آنے دیں گے۔''

یہ ملاقات ختم ہوگئی۔ ہال سے سانگ کو بلانے کے لیے ایک آدمی آ گیا اور سانگ سے اجازت لے کر یہ دونوں بھی اس کے کمرے سے باہر آ گئے۔

☆☆☆

اسی دن انکل ڈان جونز کا فون موصول ہوا اور مائیکل اور لینڈ اس سے ملنے پہنچ گئے۔

یہ ملاقات ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ہوئی تھی۔ انکل ڈان بہت گھبرایا ہوا اور پریشان ہو رہا تھا۔

''کچھ دیر پہلے میرے پاس کراس نامی ایک امریکی آیا تھا۔'' اس نے ان دونوں کو بتایا۔ ''اس نے ایک کیسٹ مجھے دیا ہے۔'' ڈان نے اپنی جیب سے ایک کیسٹ نکال کر میز پر رکھ دیا۔

مائیکل اور لینڈ نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا پھر ڈان کو دیکھنے لگے جو اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

''کراس کا یہ کہنا ہے کہ وہ بیچ کا آدمی ہے۔'' ڈان نے بتایا۔ ''اس کے بیان کے مطابق یہ کیسٹ ڈاک میں اسے موصول ہوا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ یہ کیسٹ فوراً ہی مجھ تک پہنچا دے۔ لہٰذا وہ پہلی فرصت میں یہ کیسٹ لے کر میرے پاس آ گیا ہے۔''

''کیا آپ نے کیسٹ سن لیا۔'' مائیکل نے پوچھا۔

''نہیں۔'' ڈان نے جواب دیا۔ ''میں اس کیسٹ کو لے کر سیدھے آپ لوگوں کے پاس چلا آیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے تو پھر آئیں چل کر پہلے یہ کیسٹ سنتے ہیں۔'' لینڈ نے کہا۔

وہ تینوں لینڈ کے دفتر گئے۔ یہاں آتے ہی لینڈ نے ایک ٹیپ ریکارڈر منگوایا اور دروازہ بند کرکے وہ کیسٹ اس میں لگا دیا۔ کیسٹ سے ابھرنے والی آواز شیری ہی کی تھی۔

''میں شیری جونز بول رہی ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میرا ہر طرح خیال رکھا جا رہا ہے۔ میرے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں شیری جونز ہوں اور یہ یقین دلانے کے لیے اس ڈائری کا حوالہ دیتی ہوں جو انکل ڈان نے مجھے تحفے میں دی تھی اس کے علاوہ میں انہیں اپنی چابی کے گم ہونے کا واقعہ بھی یاد دلانا چاہتی ہوں۔''

''ہاں یہ شیری ہی ہے۔'' ڈان نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ دونوں باتیں میرے اور اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے۔''

''ایسا لگتا ہے جیسے وہ لکھا ہوا پیغام بول رہی ہو۔''

مائیکل دھیرے سے بولا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ خیریت سے نہیں ہے اور زبردستی یہ پیغام پڑھوایا گیا ہے۔''

''اب میں آپ کو ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں۔'' لینڈ نے اپنی میز کی دراز سے کپڑے کا وہ ٹکڑا نکال کر میز پر رکھ دیا جو سانگ کو ملا تھا۔ وہ چلتے وقت یہ ٹکڑا اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ ''کیا آپ اس کپڑے کو پہچانتے ہیں۔ یہ بھی حوالے کے لیے ہانگ کانگ کی ایک اداکارہ کو دیا گیا ہے۔''

''میرے خدا۔'' ڈان نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے وہ ٹکڑا اٹھالیا۔ ''بہت اچھی طرح یہ بھی شیری کا ہے۔ یہ کپڑا میں نے ہی دلوایا تھا اسے..... مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔''

''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں میں سے کس کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔'' مائیکل نے کہا۔

''اس کیس میں درمیانی رابطے کے لیے دو آدمی سامنے آئے ہیں۔ اور دونوں کے پاس ثبوت موجود ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اغوا کرنے والوں نے بیک وقت دو آدمیوں کو کیوں مقرر کیا ہے۔ یا تو ان دونوں کا تعلق اغوا کرنے والوں سے ہے۔ یا ان دونوں کو صرف دکھاوے کے طور پر سامنے لایا جا رہا ہے۔ بہرحال جب تک یہ بات نہیں طے ہو جاتی اس وقت تک وہ رقم کسی کے حوالے بھی نہیں کی جا سکتی۔''

''اس الجھن سے بچنے کا حل ہے میرے ذہن میں۔'' لینڈ ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور وہ حل یہ ہے کہ ساؤتھ چائنا پوسٹ میں آرسن کو مخاطب کر کے ایک اشتہار دیا جائے کہ آرسن ہم تمہاری بات ماننے کو تیار ہیں براہ کرم اس آدمی کا نام بتاؤ جس سے رابطہ قائم کرنا ہے۔ کیوں کیسی ترکیب ہے۔''

''بہت اچھی۔'' مائیکل نے کہا۔ ''اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ تم ایک اشتہار لکھ کر اسی وقت بھجوا دو۔''

لینڈ نے اسی وقت اشتہار لکھ کر ایک آدمی کے ہاتھ اخبار کے دفتر کی طرف روانہ کر دیا۔ ان دونوں نے ڈان کو بھی جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے جانے کے بعد وہ دونوں اس کیسٹ کو لے کر انجینئرنگ روم میں آ گئے۔ جہاں اس کیسٹ کو الیکٹرونک کے ایک ماہر کے حوالے کر دیا گیا تھا کہ وہ اس کیسٹ کا تجزیہ بھی کر سکے۔

اس ماہر نے پندرہ منٹ کے بعد ہی انہیں رپورٹ لا کر دے دی تھی۔ اس کے تجزیے کے مطابق شیری کی آواز بھی براہ راست ریکارڈ نہیں کی گئی تھی بلکہ وہ آواز پہلے کسی طاقت ور ٹرانسمیٹر پر موصول ہوئی پھر اس ٹرانسمیٹر سے اسے ٹیپ کیا گیا تھا۔

''یہ لو اب یہ ایک نئی الجھن کھڑی ہو گئی ہے۔'' لینڈ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اب ہمیں ہانگ کانگ میں موجود غیر قانونی ٹرانسمیٹر کا پتا چلانا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا ٹرانسمیٹر کراس اور سانگ میں سے کسی کے پاس موجود ہو ہمیں ان دونوں پر نگاہ رکھنی ہے اور جیسے ہی یہ معلوم ہو جائے کہ ان دونوں میں سے کسی کے پاس ٹرانسمیٹر موجود ہے ہم اسے قابو میں کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' مائیکل نے اپنی گردن ہلائی۔ ''یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ دوستوں کے بھیس میں بھی دشمن چھپے ہوتے ہیں۔ کراس بظاہر شیری کا دوست ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ خود بھی اس معاملے میں ملوث ہو۔ اسی طرح سانگ دیکھنے میں سیدھی سادھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کسے معلوم کہ اس معصومیت کے عقب میں کیا چھپا ہوا ہے۔''

لینڈ نے اسی وقت اپنے آدمیوں کو ان دونوں پر نگاہ رکھنے کی ہدایت کر دی اور وہ ابھی ہدایت دے کر بیٹھا ہی تھا کہ سانگ کا فون آ گیا۔ وہ بہت پرجوش معلوم ہو رہی تھی۔

''اس آدمی نے مجھے فون کیا تھا۔'' سانگ نے بتایا۔ ''اس نے مجھے رات دس بجے ابرڈین پہنچ کر گوزنامی ایک سمپان کے بارے میں معلوم کرنے کی ہدایت کی ہے۔''

ابرڈین ہانگ کانگ کا ایک تفریحی مقام تھا۔ یہاں مچھلیوں کے شکاری دن بھر سمپان میں گھومتے رہتے تھے۔

''اس نے مجھ سے رقم لے کر آنے کے لیے کہا

ہے۔'' سانگ نے پھر بتایا۔ ''اس کا یہ کہنا ہے کہ میں گوزنامی سمپان تک اکیلی آؤں گی اور اگر انکل نے رقم دینے سے انکار کر دیا تو اس امریکی لڑکی کو ہلاک کر دیا جائے گا۔''

''وہ آدمی اپنے لہجے سے کیا امریکی معلوم ہوتا تھا۔'' لینڈ نے دریافت کیا۔

''ہو سکتا ہے۔'' سانگ نے جواب دیا۔ ''ویسے میں نے اس کے لہجے پر دھیان نہیں دیا تھا۔ اب یہ بتاؤ کہ میں کیا کروں؟''

''تم پنسین سولار ہوٹل جا کر اس کے چچا سے مل لو۔'' لینڈ نے کہا۔ ''ہم لوگ اس سے رقم کی بات کر لیتے ہیں۔''

''ہاں ایک بات اور اس نے کہا تھا کہ میں چچا کو یہ بتا دوں کہ اس رقم کے لیے ایک اور پیغام بھیجا جائے گا لیکن وہ اس پیغام کو نظر انداز کر دے گا۔ اس کے علاوہ اس آدمی نے شیری کے چچا کو کوئی پیغام روانہ کیا تھا وہ پیغام اسے نہیں ملا۔''

''کس قسم کا پیغام تھا۔'' لینڈ نے پوچھا۔

''یہ اس نے نہیں بتایا تو کیا میں آج رات آٹھ بجے تک اس کے چچا سے مل لوں۔''

''ضرور مل لو۔ ہم لوگ آس پاس ہی رہیں گے۔''

دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا تھا۔ لینڈ نے ساری گفتگو سے مائیکل کو آگاہ کر دیا۔ مائیکل نے یہ سن کر اطمینان کی ایک سانس لی تھی۔ تم از کم جمود تو ختم ہوا تھا۔ اغوا کرنے والے متحرک ہونے لگے تھے۔ ایسے معاملات میں انتظار کرتے رہنا زیادہ تکلیف دہ ہوا کرتا ہے اور اب انتظار کا مرحلہ ختم ہونے والا تھا۔

☆☆☆

شیری کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس وسیع و عریض کائنات میں بالکل اکیلی ہو۔

اندھیرا، سناٹا اور بے پناہ خوف، بس یہ تینوں چیزیں اس کے اعصاب پر مسلط تھیں۔ ان کے علاوہ اس کائنات میں کچھ بھی نہیں تھا۔ یا پھر اس کی اپنی سانسوں کی آوازیں تھیں جو اسے کسی طوفان کی طرح گونجتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ اگر حرکت بھی کرتی تو اس کے کپڑوں کی سرسراہٹیں اس کے کانوں میں دھماکوں کی طرح محسوس ہونے لگتیں۔ ارنو کے قدموں کی آہٹیں اب ختم ہو گئی تھیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ واپس جا چکا ہوگا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ خود ہی دم سادھے کہیں اس کے پاس ہی کھڑا ہوا ہو۔ اس کے لیے گزرنے والا ایک ایک پل قیامت کا ہوتا جا رہا تھا۔ ارنو کسی بھی لمحے اس کو پکڑ سکتا تھا۔ اس کے بعد اس ظالم شخص سے کسی ہمدردی یا رعایت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

پھر اس نے اندھیرے میں اچانک روشنی سی ہوتی ہوئی دیکھی۔ وہ خوف سے سمٹ کر رہ گئی۔ وہ روشنی ماچس کی تیلی کی تھی۔ ارنو نے اسے تلاش کرنے کے لیے ماچس کی تیلی جلائی تھی۔ لیکن شیری اس وقت مہاتما بدھ کے بڑے مجسمے کے عقب میں تھی اور ماچس کی وہ کمزور روشنی یہاں تک پہنچ نہیں پائی تھی۔

اس نے ارنو کے زور زور سے سانسیں لینے کی آوازیں سنیں۔ وہ غصے کے عالم میں کسی چوٹ کھائے ہوئے جانور کی طرح ہو رہا تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی تیلیاں جلائی تھیں ہر بار روشنی ہونے پر وہ کچھ اور دبک جاتی۔ بالکل کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح۔ ارنو نے اب تیلی کی روشنی سے آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس مجسمے کے قریب آتا جا رہا تھا۔ اس کی آہٹ شیری کے اعصاب کو منتشر کر رہی تھی۔ وہ اب کہیں بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اس مجسمے سے نکل کر کسی دوسری طرف جانے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس نے اپنی سانسیں تک روک لیں۔ جیسے خود ہی پتھر کا مجسمہ بن گئی ہو۔ ارنو کے قدموں کی آوازیں مجسمے کے پاس آ کر رک گئیں۔ اس کے ہاتھ کی جلتی ہوئی تیلی بھی بجھ گئی تھی پھر نہ جانے کیا ہوا۔ وہ واپس ہو گیا۔ شیری نے جاتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنی تھیں۔ ارنو مایوس ہو کر واپس جا رہا تھا۔ شیری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

وہ نہ جانے کتنی دیر تک اسی طرح بیٹھی رہی۔ اس کے لیے وقت کا احساس ہی ختم ہو گیا تھا۔ البتہ صرف یہ

احساس ہوا تھا کہ رات ختم ہو چکی ہے اور دن نکل آیا ہے۔ اس ہال سے باہر ہر طرف سورج کی نرم مہربان روشنی دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور اس روشنی میں زندگی بہت خوب صورت معلوم ہو رہی ہوگی۔ لیکن اس کے لیے باہر بھی موت کی بدصورتی چھپی ہوئی تھی اس ہال سے، اس عمارت سے باہر جانا بھی اس کے لیے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ارنو اسے دن کے اجالے میں صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ لیکن وہ اس طرح آخر کب تک چھپی رہ سکتی تھی۔ اسے باہر نکلنا تھا۔ اس مقام سے، اس ظالم شخص سے دور جانا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ دن کی روشنی میں آس پاس کوئی ایسا شخص دکھائی دے جائے جس سے وہ مدد لے سکے جو اس کی مدد کر سکے۔

یہ سوچ کر وہ دھیرے دھیرے کھڑی ہوگئی۔ ایک جگہ بیٹھے بیٹھے اس کے دونوں پاؤں اکڑ گئے تھے۔ اس نے زور زور سے اپنے پیروں کو جھٹکے دیے۔ پھر مجسمے کی آڑ سے سر نکال کر باہر دیکھا۔ ہال میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ دبے قدموں چلتی ہوئی ہال کے دروازے تک آ گئی جہاں نیچے اترنے کے لیے چار سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں اور ان سیڑھیوں کے بعد گھاس کا ایک قطعہ تھا اس کے بعد دور دور تک چاول کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ یہ منظر بہت خوب صورت تھا اگر اس کے اعصاب پر دہشت مسلط نہ ہوتی تو یہ منظر اور بھی خوب صورت ہوتا۔ لیکن ایک اچھی بات یہ تھی کہ ارنو کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے اوپر نگاہ کی۔ دور آسمان پر دو پتنگیں اڑ رہی تھیں۔ ان پتنگوں کو دیکھ کر اس کا دل دھڑک اٹھا۔ ان پتنگوں کو اڑانے والے کہیں آس پاس ہی ہو سکتے تھے گرچہ وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ لیکن وہ یقیناً قریب ہی تھے۔

وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر آئی۔ پھر اس نے ان پتنگوں کے رخ کی جانب دوڑ لگا دی۔ وہ بے تحاشا دوڑ رہی تھی۔ بس کسی طرح وہ پتنگ اڑانے والوں کے قریب پہنچ جائے۔ وہ لوگ یقیناً اس کی مدد کر سکتے تھے۔ وہ اسے کسی قریبی شہر تک پہنچا سکتے تھے۔

پھر اسے دو لڑکے دکھائی دے گئے۔ ان کی عمریں زیادہ تو نہیں تھیں لیکن وہ اس کی مدد کر سکتے تھے۔ اس کا ساتھ دے سکتے تھے۔ اس نے دیکھا کہ ان لڑکوں نے دور ہی سے اسے دیکھ لیا تھا اور شاید وہ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ اس لیے جلدی جلدی اپنی تنی ہوئی پتنگیں اتارنے لگے تھے۔ شیری کے پہنچتے پہنچتے ان دونوں لڑکوں نے اپنی پتنگیں اتار لیں اور وہ خوف زدہ ہو کر دوڑنے ہی والے تھے کہ شیری نے زور زور سے انہیں پکارنا شروع کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ بنکاک میں اسکول کے بچوں کو انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ اسی لیے وہ بچے بھی انگریزی جانتے ہوں گے۔ کم از کم اتنی انگریزی تو جانتے ہی ہوں گے کہ اس کی بات سمجھ سکیں۔

''میری مدد کرو۔'' وہ ان دونوں کے قریب پہنچ کر بولی۔ اس کی سانسیں بری طرح پھول رہی تھیں۔ ''میری مدد کرو پلیز پولیس کو بلاؤ۔''

''پولیس مدد۔'' ان میں سے ایک لڑکے نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا۔ ''تم کون ہو؟''

''میں ایک سیاح ہوں۔'' شیری نے بتایا۔ ''مجھے اغوا کر لیا گیا تھا۔ میری مدد کرو۔''

وہ لڑکے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ شاید ان کی سمجھ میں اس کی پوری بات نہیں آ سکی تھی۔ پھر بھی انہوں نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ اور ساتھ ہی اس طرف دوڑ بھی لگا دی اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ شیری کو بھی اسی جانب لے جانا چاہتے تھے شیری بھی ان کے پیچھے پیچھے دوڑ پڑی۔ کچھ دور دوڑنے کے بعد ایک مکان کے خدوخال ابھرنے لگے۔ پھر وہ جھونپڑی نما بڑا سا مکان واضح ہونے لگا۔ اس مکان کے باہر قدم آدم جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور اس کا دروازہ بند تھا۔

شیری اپنی جھونک میں دوڑتی ہوئی ان لڑکوں سے آگے بڑھ گئی۔ پھر وہ ایک دہاڑ سن کر اس طرح رک گئی جیسے اس کے پیروں کو زمین نے پکڑ لیا ہو۔ اس کا دل اتنی زور زور سے دھڑکنے لگا جیسے سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ درختوں کے درمیان سے ایک عظیم الجثہ ہاتھی نکل کر اس کی طرف دوڑا چلا آ رہا تھا۔ اس نے اپنی سونڈ اوپر اٹھا

رکھی تھی۔ شیری نے ادھر ادھر نگاہ کی۔ وہ دونوں لڑ کے کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ شاید ہاتھی کے خوف سے وہ بھی فرار ہو گئے تھے۔ شیری کے پاس وقت بہت کم تھا۔ اس کیبن میں داخل ہونا تھا۔ ورنہ یہ بپھرا ہوا ہاتھی اس کے پرخچے اڑا دیتا۔

اس نے اپنے حواس بحال کیے اور ایک بار پھر دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ ہاتھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا اس کے اور ہاتھی کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا تھا۔ دوسری طرف وہ دروازے تک بھی پہنچ چکی تھی۔ اس نے پاگلوں کی طرح دروازے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ ایک بار دو بار پھر وہ دروازہ کھل گیا۔ اس نے اپنی گردن اوپر اٹھائی۔ دروازہ کھولنے والا ارنو تھا۔ جو اپنی کمر پر ہاتھ رکھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

مائیکل اور انسپکٹر لینڈ بھاگ دوڑ کرتے کرتے بے حال ہو چکے تھے۔ لیکن ابھی تک اس کیس کا کوئی سرا ان کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ سانگ اور کرائس کی نگرانی سے بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ ان دونوں میں سے کسی کے پاس ٹرانسمیٹر کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔ اب ان لوگوں کی ساری امیدیں اس سمپان سے وابستہ تھیں جس پر سانگ کو بلایا گیا تھا۔

وہ دونوں کھانا کھاتے ہی انکل ڈان جونز کے پاس پہنچ گئے تھے۔ ڈان اپنے کمرے میں ہی بیٹھا تھا۔ وہ ان دونوں کو دیکھتے ہی جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''آپ دونوں کے لیے ایک خبر ہے میرے پاس۔'' اس نے دونوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے کرائس کا فون آیا تھا۔ وہ میرے پاس آنے والا ہے۔''

''وہ کیوں؟'' مائیکل نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

''کرائس کو آپ سے کچھ کام پڑ گیا۔''

''اس کا یہ کہنا ہے کہ اس کے پاس بھی اغوا کرنے والوں میں سے کسی کا فون آیا تھا اور ان لوگوں نے اسے مجھ سے رقم لینے کی ہدایت کی ہے۔''

مائیکل ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ معاملہ ابھی تک اسی طرح الجھا ہوا تھا۔ لٹی سانگ کو بھی رقم لینے کی ہدایت کی گئی تھی اور یہی بات کرائس سے بھی کہی گئی تھی۔ اگر وہ دونوں ٹھیک کہہ رہے تھے تو نہ جانے وہ لوگ کس قسم کا کھیل کھیل رہے تھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دو دو آدمیوں کو مقرر کرنے کا کیا مطلب تھا۔

''میرا خیال ہے کہ کرائس کو اس وقت ٹال دیا جائے۔'' لینڈ نے مشورہ دیا۔

''ظاہر ہے یہی ہو سکتا ہے۔ دونوں کو بیک وقت رقم تو نہیں دی جا سکتی۔'' مائیکل نے کہا۔

''میں تو پاگل ہو کر رہ گیا ہوں۔'' ڈان بڑبڑایا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس قسم کے اغوا کا کیس ہے۔ کئی شہروں میں اس کے ڈانڈے پھیلے ہوئے ہیں۔ پہلے شکاگو، پھر ٹوکیو، ہانگ کانگ پھر بنکاک، ایسا لگتا ہے جیسے کسی بہت بڑی سیاسی شخصیت کو اغوا کر لیا گیا ہو۔''

''اب ان شہروں کی فہرست میں کولمبو کا نام بھی شامل ہو گیا ہے۔'' مائیکل نے بتایا۔

''وہ کیوں۔'' ڈان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ڈان نے سوزن نامی ایک بوڑھی عورت پر شبہ ظاہر کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ عورت ہر جگہ ان دونوں کا پیچھا کرتی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اب وہ عورت کولمبو پہنچ گئی ہے۔ ہم نے وہاں کی پولیس سے رابطہ پیدا کر کے اس پر نگاہ رکھنے کی درخواست کر دی ہے۔''

مائیکل نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور کرائس اندر آ گیا۔ وہ مائیکل اور لینڈ کو کمرے میں دیکھ کر کچھ الجھ گیا تھا۔

''مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

اس نے ڈان سے کہا۔ ''لیکن یہ بات میں سب کے سامنے نہیں کہوں گا۔''

''اگر تم اس رقم کی بات کرنا چاہتے ہو تو ہمارے سامنے ہی کہہ دو۔'' مائیکل جلدی سے بول پڑا۔ ''کیونکہ مسٹر ڈان نے ہمیں بتا دیا ہے کہ تم رقم لینے کے لیے آنے والے ہو۔''

''ہاں یہی بات ہے۔'' کرائس نے کہا۔ ''مجھ سے یہی کہا گیا ہے۔''

''تو یہ رقم تمہیں کل ہی مل سکتی ہے۔'' اس دفعہ لینڈ بولا تھا۔ ''کیونکہ اتنی بڑی رقم پاس تو نہیں رکھی جا سکتی۔ یہ رقم بینک میں موجود ہے اور کل ہی بینک سے نکل سکتی ہے۔''

''یہ تو بہت بری بات ہوئی۔'' کرائس بڑبڑایا۔ ''اس نے تو کہا تھا کہ اگر رقم نہیں ملی تو۔''

''اب اس کا فون آئے تو اسے سمجھا دینا۔'' مائیکل نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میرا خیال ہے کہ اتنی سی بات وہ بھی سمجھتا ہوگا۔''

کرائس چند لمحوں تک ان تینوں کی طرف دیکھتا رہا پھر جلدی سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کمرے میں سناٹا ہو گیا تھا۔ ان تینوں میں سے کسی کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اب انہیں سانگ کا انتظار تھا۔ جو کرائس ہی کی طرح رقم لینے کے لیے آنے والی تھی۔ وہ کسی بھی وقت آنے والی تھی۔

یہ انتظار زیادہ دیر تک جاری نہیں رہا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور سانگ کمرے میں داخل ہو گئی اس نے رات کا خوب صورت لباس پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پرس تھا۔ وہ مائیکل اور لینڈ کو دیکھ کر خوش ہو گئی تھی اور مائیکل اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس کی خوشی کا یہ اظہار مصنوعی ہے یا حقیقی۔ وہ ایک اچھی اداکارہ تھی اور اپنے تاثرات کو بہ آسانی چھپا سکتی تھی۔ ایک دلنواز مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرتی ہوئی کمرے میں رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ مائیکل نے ڈان کا تعارف کروا دیا۔

''مجھے تو بہت خوف محسوس ہو رہا ہے۔'' اس نے ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے ساتھ اس سے پہلے ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔''

''ایسا کسی کے ساتھ نہیں ہوا کرتا۔'' مائیکل دھیرے سے بولا۔ ''لیکن تم فکر مت کرو۔ پولیس تمہاری حفاظت کے لیے موجود رہے گی۔''

''ایریڈین بہت بارونق جگہ ہے۔ وہاں ہزاروں لوگ ہوا کرتے ہیں۔'' سانگ نے کہا۔ ''پولیس میری حفاظت کرتی رہے گی اور کسی مقام سے کوئی شخص میرا نشانہ لے کر مجھے ہلاک کر دے گا۔ بہرحال اب میں تمہیں وہ پیغام پڑھ کر سناتی ہوں جو اس شخص نے فون پر دیا تھا۔'' اتنا کہہ کر اس نے اپنے پرس سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال لیا۔ ''میں نے یہ پیغام لکھ لیا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ شیری کے چچا سے کہو کہ وہ اگر آج رات مطلوبہ رقم دے دیتا ہے تو اس کی بھتیجی کو کل صبح رہا کر دیا جائے گا اور اس کے چچا سے کہہ دو اگر اس نے رقم نہیں دی تو کل اس کی بھتیجی ہلاک ہو جائے گی۔ چچا سے یہ بھی کہہ دو کہ وہ رقم لینے کے لیے آنے والے کسی اور آدمی کی طرف دھیان نہ دے اور نہ کسی دوسرے پیغام پر توجہ دے۔''

''ہوں۔'' مائیکل نے ایک گہری سانس لی۔ مسئلہ اپنی جگہ برقرار تھا۔ سانگ اور کرائس دونوں ہی باری باری رقم لینے کے لیے آئے تھے۔

''بات یہ ہے مس سانگ۔'' انسپکٹر لینڈ نے اسے مخاطب کیا ''مسٹر ڈان نے حفاظت کے خیال سے وہ رقم بینک میں رکھوا دی ہے اور وہ رقم کل سے پہلے نہیں نکل سکتی۔ اس لیے تم برائے مہربانی اس شخص سے مل کر اسے حالات سے آگاہ کر دینا وہ مجبوری سمجھ لے گا۔ وہ خود بھی جانتا ہوگا کہ اتنی بڑی رقم ہوٹل میں نہیں رکھی جا سکتی۔''

''یہ تو بہت گڑبڑ ہو گئی۔'' سانگ نے اپنے ہونٹ سکیڑے۔

''اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے مس سانگ۔'' لینڈ نے پھر کہا۔ ''یہ معاملہ چونکہ ایک لڑکی کی زندگی اور بہت بڑی رقم کا ہے اسی لیے فطری طور پر مسٹر ڈان کی یہ خواہش ہے کہ وہ رقم صحیح ہاتھوں میں جائے۔ اسی لیے ان کی یہ خواہش ہے کہ آپ اس شخص سے مل کر یہ پوچھیں کہ وہ شیری سے یہ معلوم کرے کہ ڈائنا کہاں ہے۔ اگر شیری نے اس سوال کا جواب دے دیا اور وہ جواب آپ کے ذریعے ہمیں معلوم ہو گیا تو ہم یہ سمجھ لیں گے کہ جس آدمی نے آپ کو اپنا آلہ کار بنا رکھا ہے وہ واقعی اغوا کرنے والوں سے تعلق رکھتا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔''

اس الجھن سے نکلنے کے لیے انہوں نے یہی ترکیب سوچی تھی۔ سانگ اور کرائس میں سے جو بھی اس سوال کا درست جواب لے آتا رقم اس کے حوالے کردی جاتی۔ ڈائنا شیری کی پالتو کتیا کا نام تھا۔ جو ایک عرصہ پہلے گم ہوچکی تھی اور شیری کتیا سے بہت محبت کرتی تھی۔

''ٹھیک ہے میں اس سے بات کر کے دیکھتی ہوں۔'' سانگ صوفے سے کھڑی ہوگئی۔ ''لیکن میں اپنا تحفظ بھی چاہتی ہوں۔''

''تم فکر مت کرو ہمارے آدمی تمہیں نگاہ میں رکھیں گے۔'' لینڈ نے اسے تسلی دی۔ ''اس کے علاوہ اس شخص کی تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔''

سانگ کے جانے کے بعد مائیکل اور لینڈ بھی ڈان سے اجازت لے کر ہوٹل سے باہر آگئے۔ انہیں بہت سے ضروری انتظامات کرنے تھے۔

☆☆☆

ارنو کو دیکھ کر شیری کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دم الٹ گیا ہو۔

اس کے عقب میں ایک بپھرا ہوا ہاتھی تھا اور سامنے اس کا دشمن کھڑا تھا۔ جس کے ہونٹوں پر بڑی طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔ لیکن اس کی یہ مسکراہٹ اس وقت معدوم ہوگئی جب اس نے ہاتھی کو بہت قریب محسوس کیا۔ وہ سانپ کی طرح پلٹا اور اس نے چیخ کر کسی کو آواز دی۔ اس کی آواز سنتے ہی ایک خوب صورت سی لڑکی دوڑتی ہوئی باہر آگئی۔ اس دوران ارنو نے اپنا ریوالور بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس نے وہ ریوالور بڑی پھرتی کے ساتھ اس کی کنپٹی پر رکھ دیا اور چلا چلا کر کچھ بولنے لگا۔

لڑکی نے اس کی بات سمجھ کر گردن ہلائی اور بپھرے ہوئے ہاتھی سے مخاطب ہوکر کچھ کہنے لگی۔ وہ زور زور سے اس ہاتھی کو ڈانٹ رہی تھی۔ شیری نے محسوس کیا کہ اس کے پیچھے ہاتھی کے وزنی پیروں کی گونجتی ہوئی دھمک اچانک رک گئی تھی۔ پھر اس کی چنگھاڑ بھی ختم ہوگئی۔

شیری نے دروازے سے ٹیک لگالی تھی۔ اس کا پورا بدن لرز رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ پھر اس عالم میں ارنو نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا۔ ساتھ ہی اس نے دروازہ بھی بند کرلیا تھا۔ شیری لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھی اور فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ ارنو نے اس دوسری لڑکی کو بھی دھکا دے کر ایک کرسی پر بٹھادیا تھا۔

''کہیں یہ بے ہوش تو نہیں ہوگئی۔'' لڑکی نے شیری کی طرف اشارہ کیا۔ جس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

''نہیں یہ بے ہوش نہیں ہوسکتی۔'' ارنو نے کہا۔ ''یہ بہت سخت جان ہے۔'' پھر اس نے شیری کی طرف دیکھا۔ ''چلو اٹھ کر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔'' وہ غرایا۔

شیری نے تھکے تھکے انداز میں اپنی آنکھیں کھول دیں، اس بے رحم آدمی سے کچھ بعید نہیں تھا۔ ہوسکتا تھا کہ وہ اسے ٹھوکریں مارنی شروع کردیتا۔ اسی لیے وہ اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی ایک کرسی کے پاس آئی اور ڈھیر ہوگئی اس کے اعصاب ابھی تک اس کے قابو میں نہیں آئے تھے۔

''تمہارا کیا خیال تھا کہ تم مجھ سے بچ کر چلی جاؤ گی۔'' ارنو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے میں نے تم جیسی سخت جان لڑکی کبھی نہیں دیکھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ تم نے مجھے پریشان کردیا تھا۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ تم میرے ہاتھ سے نکل گئی ہو۔ پھر مجھے یہ مکان دکھائی دیا۔ اس مکان کو دیکھ کر مجھے امید ہوگئی کہ تم اس کھنڈر سے نکل کر اسی طرف آؤ گی اسی لیے میں رات ہی سے اس پیاری لڑکی کا مہمان بنا ہوا ہوں۔''

''بکواس مت کرو۔'' وہ لڑکی بپھر اٹھی۔ ''تمہیں شرم نہیں آتی لڑکیوں پر ظلم کرتے ہوئے۔ میرا بوما اس وقت کہیں گیا ہوا تھا۔ ورنہ تم کبھی مکان میں داخل نہیں ہوسکتے تھے۔''

''کاش میرے پاس اس وقت اگر ایک رائفل ہوتی تو میں سب سے پہلے تمہارے بوما کی کھوپڑی پھاڑ دیتا۔'' ارنو نے کہا۔ ''اس ریوالور سے تم جیسی نازک لڑکیوں کو تو مارا جاسکتا ہے۔ لیکن اس سے کوئی ہاتھی نہیں

مرسکتا۔ پھر بھی ہی میرا آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔''

لڑکی نے برا سا منہ بنا کر اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔ شیری نے سمجھ لیا تھا کہ وہ لڑکی بھی اسی کی طرح ارنو کے رحم و کرم پر تھی۔ جس طرح اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا اور اسے سزا مل رہی تھی۔ اسی طرح اس لڑکی کا بھی کوئی قصور نہیں تھا دشواریاں شاید ہر ایک کے لیے ہوتی ہیں۔ چاہے کوئی جرم ہو یا نہ ہو۔

شیری کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ شاید کبھی اس جال سے نہیں نکل سکے گی۔ اسے ڈیوٹی کا خیال تھا۔ نہ جانے وہ کہاں ہوگا۔ ہوسکتا تھا کہ وہ زندہ ہی نہ ہو۔ دریا ہی میں ڈوب گیا ہو۔ ارنو نے اس بے دردی کے ساتھ اس پر گولیاں بھی تو چلائی تھیں۔ ہوسکتا تھا کہ ایک آدھی گولی اسے بھی لگی ہو اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہوگا۔ کیا وہ ڈیوٹی کو بھلا پائے گی۔ کیا وہ معصوم سا لڑکا اسے زندگی بھر یاد نہیں آئے گا۔ پھر دوسری طرف کرائس تھا۔ وہ بھی اسے یاد آرہا تھا اس کے انکل تھے یہ وہ لوگ تھے جن سے شیری کو محبت ملی تھی۔ انسان محبت کرنے والوں کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا اور شاید نفرت کرنے والے کبھی بھلائے نہیں جاتے۔ مثال کے طور پر ارنو..... اسے یقین تھا کہ وہ اگر زندہ بچ بھی گئی تو بھی وہ اس شخص کو کبھی نہیں بھلائے گی۔ یہ اندھیرے اور نفرتوں کا آدمی تھا۔ اس شخص نے اس کی چاندی جیسی صاف اور پرسکون زندگی کو اپنی سازشوں سے میلا کرڈالا تھا۔

''اب تم یہ بتاؤ کہ ڈائنا کہاں ہے؟'' ارنو نے شیری کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کی آواز نے شیری کی سوچوں کو منتشر کردیا تھا۔

''کون ڈائنا۔'' شیری نے حیرت ظاہر کی ''میں تو کسی ڈائنا کو نہیں جانتی۔''

''میرا خیال ہے کہ اگر تم پر تھوڑا سا تشدد کیا جائے تو تمہاری یادداشت ٹھیک ہوجائے گی۔'' ارنو نے کہا۔

''تمہیں یاد آجائے گا کہ ڈائنا کون ہے۔''

''میں سچ کہتی ہوں کہ میں کسی ڈائنا کو نہیں جانتی۔'' شیری نے بے بسی سے جواب دیا۔ ''میں یہ نام پہلی بار سن رہی ہوں۔''

مسکرائیے!

منیر صاحب کے گھر کا دروازہ زور سے بجا۔ وہ غصے سے دروازے پر گئے اور بولے۔ ''کون گدھے کا بچہ ہے؟''

باہر سے ان صاحب کے بیٹے کی آواز آئی۔ ''ابو! میں ہوں۔''

☆☆

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔

''کیوں بھئی تم نے گانے کی مشق کیوں چھوڑ دی؟''

''اپنے گلے کی وجہ سے۔'' دوست نے آہ بھر کر کہا۔

''تمہارے گلے کو کیا ہوگیا؟'' اس شخص نے حیرت سے پوچھا۔

دوست نے افسردہ ہوکر جواب دیا۔

''کچھ نہیں، بس پڑوسیوں نے دبانے کی دھمکی دی تھی۔''

☆☆

اسپتال میں ایک دل کے مریض سے مزاج پرسی کے لیے آنے والے دوست نے پوچھا۔

''یہاں دل کی دھڑکن کو کم کرنے کے لیے بھی تمہیں کچھ مل رہا ہے؟''

مریض نے جواب دیا۔ ''ہاں ایک بوڑھی نرس۔''

☆☆

کھانے کی ایک دعوت میں شریک خاتون نے دوسری سے پوچھا۔ ''تمہیں کون سی ڈش پسند آئی؟''

''اسٹیل کی۔'' دوسری نے جواب دیا۔

☆☆

''عاصم! تم اپنے مکان میں کیوں نہیں رہتے۔ دن رات ادھر ادھر مارے مارے پھرتے رہتے ہو۔''

کاشی۔ ''کیا کروں بھائی۔ میرے مکان کا کرایہ بہت زیادہ ہے۔''

☆☆

ارنو جھلا کر اپنی کرسی سے کھڑا ہوا اور شیری کے پاس پہنچ کر اس نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ شیری بری طرح سسکنے لگی۔ تھپڑ کی تکلیف سے زیادہ توہین کے اس احساس نے اسے کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ کسی نے اس کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا تھا۔

''میں کہتی ہوں یہ کیا پاگل پن ہے؟'' وہ لڑکی کرسی سے کھڑی ہوگئی۔ ''تم اس بے چاری پر میرے سامنے ظلم نہیں کر سکتے۔''

''خاموش رہو۔'' ارنو زور سے دہاڑا اور اس نے اس لڑکی کے چہرے پر بھی تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ کھا کر وہ لڑکی کرسی پر گر گئی تھی۔

اب اس کمرے میں دونوں لڑکیوں کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ ارنو چند لمحوں تک ان دونوں کی طرف دیکھتا رہا پھر زور زور سے اپنے پاؤں پٹختا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا، اس نے جاتے ہوئے دوسری طرف سے دروازہ بند کر دیا تھا جبکہ باہری دروازے پر خود ارنو نے شیری کو اندر کھینچ کر تالا لگا دیا تھا۔ جس کی چابی اسی کے پاس تھی۔ اور وہ دونوں اگر کوشش بھی کرتیں تو ارنو کی مرضی کے بغیر اس کمرے سے نہیں نکل سکتی تھیں۔ ان دونوں کی سسکیاں بہت دیر تک کمرے میں گونجتی رہیں پھر دونوں خاموش ہوگئیں۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے۔'' اس لڑکی نے شیری کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''میری تو سمجھ میں نہیں آیا میں تو خواہ مخواہ اس چکر میں پھنس گئی ہوں۔''

''میں بھی کچھ نہیں سمجھ سکتی۔'' شیری نے ایک گہری سانس لی۔ ''نہ جانے کون سے عذاب میری طرف بھیج دیے گئے ہیں۔ میں تو زندگی سے چھوٹی چھوٹی خوشیاں سمیٹتی پھر رہی تھی مجھے کیا معلوم تھا کہ اس قسم کے دکھ بھی میری قسمت میں ہیں۔ نہ جانے یہ کون ہے اور وہ شخص کون ہے جسے یہ ڈاکٹر کہہ کر مخاطب کرتا ہے اصل مسئلہ دولت کا ہے۔ اگر میرے انکل دولت مند نہ ہوتے تو کوئی بھی مجھے اغوا کرنے کی کوشش نہیں کرتا، میں نے زندگی میں یہی کوشش کی کہ انکل کا احسان نہ لوں۔ اپنی زندگی اپنے طور پر گزاروں لیکن اب ان ہی سے میری رہائی کے لیے رقم کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔''

''کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم اپنے اوپر گزرنے والی کہانی مجھے بتا دو۔'' اس لڑکی نے کہا۔ ''میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی لیکن اس طرح دکھ کا احساس کم ہو جائے گا۔''

شیری نے مختصر لفظوں میں اسے اب تک کی پوری کہانی سنا ڈالی۔ وہ لڑکی اس دوران بڑے دھیان سے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ شیری نے اپنے دکھوں میں اسے بھی شامل کر لیا تھا۔

''یہ واقعی بڑا پراسرار معاملہ ہے۔'' اس لڑکی نے شیری کے خاموش ہو جانے کے بعد کہا۔ ''اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو اب تک شاید پاگل ہوگئی ہوتی۔''

''تمہارے ساتھ کیا گزری۔'' شیری نے پوچھا۔ ''میں اگر زندہ رہی تو تمہیں کبھی ان لوگوں کے حوالے سے یاد رکھوں گی۔ جنہوں نے مجھ سے ہمدردی کی ہے۔''

''میرا نام ڈینگ پو ہے۔'' لڑکی نے بتایا۔ ''میں اس مکان میں اکیلی رہتی ہوں۔ میرا شوہر کہیں اور کام کرتا ہے وہ مہینے میں صرف دو تین دنوں کے لیے آپاتا ہے اور اسے بوما کی موجودگی میں میرے لیے کوئی فکر نہیں ہوتی۔ وہ جانتا ہے کہ بوما کتنی اچھی طرح میری حفاظت کر سکتا ہے۔ لیکن اسے کیا معلوم کہ میں بوما کے ہوتے ہوئے بھی پھنس گئی ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ ہنس پڑی۔

شیری کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ اسے یہ لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ یہ بے چاری صرف اسی کی وجہ سے ماری جا رہی تھی۔ حالانکہ وہ خود بھی شیری ہی کی طرح مجبور تھی۔ لیکن شیری کو ڈھارس دینے میں لگی ہوئی تھی۔ شاید ایک مجبور ہی دوسرے مجبور کی ڈھارس بندھا سکتا ہے۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ گئی۔ کھڑکی میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور سلاخوں کو توڑنا یا انہیں علیحدہ کرنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ یہی حال دروازوں کا تھا۔ وہ دروازے ٹوٹ نہیں سکتے تھے۔

کھڑکی سے باہر دور دور تک سرسبز میدان

دلھائی دے رہا تھا۔ پتنگ اڑانے والے لڑکے کہیں غائب ہو چکے تھے۔ شاید ہاتھی کے خوف سے وہ بھاگ گئے تھے۔ سناٹے پھیلے ہوئے پورے ماحول پر بنگال کی چھاپ لگی ہوئی تھی، ناریل کے درخت، گدلا پانی، دھان کے کھیت اور دور بنا ہوا وہ کھنڈر جہاں وہ پناہ لینے کے لیے چھپی تھی کوئی اور موقع ہوتا تو یہ سب اس کے لیے بہت دلنواز اور سکون پرور ہوتا۔ لیکن اس خوف کے عالم میں سب کچھ مزید دہشت زدہ کر رہا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے کوئی آسیب اس کے تعاقب میں ہو اور وہ آسیب اب کھڑکی سے باہر آ کر کھڑا ہو گیا ہو۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ارنوکس ڈائنا کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ وہ تو کسی ڈائنا کو نہیں جانتی تھی۔ یہ ڈائنا تو اس کے لیے ایک اجنبی نام تھا۔ ہوسکتا تھا کہ اس نام کا کوئی تعلق اس کے ماضی سے رہا ہو۔ اس نے اپنا سر کھڑکی کی سلاخوں سے لگا لیا۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر دور میدان میں کہیں سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی اور اس آواز کو سنتے ہی شیری کو ڈائنا کے بارے میں یاد آ گیا۔ ڈائنا اس کی پالتو کتیا کا نام تھا۔ ہاں اس کی زندگی میں اس کے علاوہ اور کوئی ڈائنا نہیں آئی تھی۔

لیکن ارنو کو ڈائنا کے بارے میں جاننے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی۔ ارنو کو یہ کیسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی زندگی میں ڈائنا نامی کسی ہستی کا وجود تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بات اسے اس ڈاکٹر نے بتائی ہو جس سے وہ ٹرانسمیٹر پر باتیں کیا کرتا تھا لیکن یہ ڈاکٹر کون تھا۔ ایک بار پھر یہ سوال اس کے ذہن کو پریشان کر گیا، اس نے سوچنا ترک کر دیا۔

ڈینگ پوبھی اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بے چاری بھی بہت پریشان تھی۔ شاید وہ شیری سے زیادہ پریشان تھی، شیری تو اپنے یرغمال بنائے جانے کا سبب بھی جانتی تھی لیکن یہ تو بلاوجہ اس عذاب میں مبتلا کر دی گئی تھی۔ اس کا قصور صرف یہ تھا کہ اس کا گھر اس ویرانے میں واقع تھا۔ بس اس کے علاوہ اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔

چٹکلے

☆

دلہن رخصت ہو رہی تھی۔ خواتین آنسو بہا رہی تھیں۔ ٹیپ ریکارڈر پر بلند آواز سے یہ گانا بج رہا تھا۔ ''چھوڑ بابل کا گھر' موہے پی کے نگر آج جانا پڑا۔'' مہمانوں میں ایک لڑکی ایسی بھی تھی جو غم زدہ نظر آنے کے بجائے ایک کونے میں کھڑی دانت پیس رہی تھی۔ لڑکی کی ایک سہیلی نے پوچھا۔ ''رخسانہ' تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔ تمہیں کرن کی رخصتی کا دکھ ہو رہا ہے۔''

لڑکی بولی۔ ''دکھ کرتی ہے میری جوتی! کرن نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کرتا۔ اس نے ہمیشہ مجھے یہ مشورہ دیا کہ عامر سے جتنی ترش روئی سے پیش آؤ گی' وہ تم سے اتنی ہی محبت کرے گا۔''

سہیلی نے پوچھا۔ ''یہ عامر کون ہے۔''

''وہ جو سہرا باندھے' پھولوں سے آراستہ کار کی طرف بڑھ رہا ہے۔''

☆

رئیل اسٹیٹ ایجنٹ مکان کے متوقع خریدار سے کہنے لگا۔ ''یہ گھر فوائد اور نقصان دونوں رکھتا ہے۔ میں ایک دیانتدار انسان ہوں' اس لیے پہلے آپ کو نقصان بتاتا ہوں۔ گھر کے مغرب میں ایک میل دور بھینسوں کا باڑہ ہے۔ مشرق کی جانب ربڑ بنانے والا ایک کارخانہ ہے۔ شمال کی طرف تھوڑے ہی فاصلے پر کوڑے کرکٹ سے کھاد بنانے والا پلانٹ ہے اور جنوب کی طرف سیمنٹ فیکٹری ہے۔''

متوقع خریدار نے کڑوا گھونٹ نگلتے ہوئے کہا۔ ''فوائد کیا ہیں۔''

''آپ ہمیشہ آسانی سے جان سکتے ہیں کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے۔''

''میرے ذہن میں اس آدمی سے چھٹکارا پانے کی ایک ترکیب آئی ہے۔'' ڈینگ پونے سرگوشی کی۔

''وہ کیا۔'' شیری نے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اس آدمی سے چھٹکارا پانا آسان نہیں ہے۔ اس نے ہم دونوں کو بے بس کردیا ہے۔''

''نہیں.....'' ڈینگ پونے اپنا سر ہلایا۔ ''میں بے بس نہیں ہوں۔ لیکن مجھے اپنے اس گھر کی قربانی دینی ہوگی۔ بس یہی سوچ کر میں پریشان ہورہی ہوں۔ ہم دونوں نے مل کر بڑی محبتوں سے اس گھر کو بنایا ہے۔ یہ ہمارے خوابوں کی تعبیر ہے، اگر یہ تباہ ہوگیا تو ہمارے خواب ادھورے رہ جائیں گے اور اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرا شوہر بھی مجھ پر ناراض نہیں ہوگا۔ گھر تو دوبارہ بھی بن سکتے ہیں لیکن زندگی ختم ہوجائے تو واپس نہیں آتی۔ عزت چلی جائے تو اسے لوٹایا نہیں جاسکتا۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔''

''میں تمہاری باتیں نہیں سمجھ سکی۔'' شیری کی حیرانی بڑھ گئی۔ ''تم کیا کرنا چاہتی ہو۔''

''دیکھو ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔'' ڈینگ پونے چور نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ ''یہ اچھا موقع ہے کہ وہ شخص ہم دونوں کو اس کمرے میں بند کرگیا ہے، اس نے اس طرح گویا ہم دونوں کو بے بس کردیا ہے۔ لیکن اس کی یہی حرکت اس کے لیے موت ثابت ہوگی۔ اب تم دیکھتی رہو کہ میں کیا کرتی ہوں۔'' ڈینگ پوکا چہرہ چمکنے لگا۔ جیسے اس نے کوئی پختہ عزم کرلیا ہو۔

شیری حیران حیران سی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ڈینگ نے لپک کر اس دروازے کو اندر سے بھی بند کردیا جس کے ذریعے ارنو دوسرے کمرے میں گیا تھا۔ اس طرح اب ارنو دروازہ کھول کر اندر نہیں آسکتا تھا۔ شیری کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس جیسا ہوشیار آدمی اتنی بڑی حماقت کس طرح کرگیا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی شیری کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ اس پر نگاہیں جمائے رکھتا تھا۔ لیکن اس وقت نہ جانے اسے کون سا ضروری کام پڑ گیا تھا کہ وہ ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔

اپنی اس غلطی کا احساس شاید ارنو کو بھی ہوگیا تھا۔ یا اس کا کام ختم ہوگیا تھا اسی لیے اس نے دوسری طرف سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور جب اس نے دروازے کو اندر سے بند پایا تو بری طرح شور کرنے لگا۔ وہ زور زور سے گالیاں بھی دے رہا تھا اور ان دونوں کو دھمکیاں بھی دیے جارہا تھا۔

''میں کہتا ہوں کھولو دروازہ۔'' اس نے دروازے کو پیٹتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ پورے مکان میں آگ لگادوں گا۔''

شیری بہت خوف زدہ ہوگئی تھی۔ لیکن ڈینگ پونے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تھپکی دی اور خود کھڑکی کے پاس جاکر زور زور سے چلانے لگی۔ شیری کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ لیکن اتنا ضرور اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اپنے ہاتھی کو متوجہ کررہی تھی۔

''کھولو دروازہ۔'' ارنو اور زور سے چلایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دروازے پر ایک گولی جھونک ماری تھی۔

وہ گولی دروازے کو توڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور سامنے والی دیوار سے اچٹ کر ایک طرف نکل گئی۔ شیری نے محسوس کیا جیسے اس کا دل سینے کی بندشیں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ شاید اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہونے والا تھا اور وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ہر ڈرامے کا ڈراپ سین خطرناک ہی ہوا کرتا ہے، اس میں بہت سے لوگ ہلاک بھی ہوجایا کرتے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ اس کھیل میں موت اس کے حصے میں آنے والی ہو۔ ڈینگ پوکا شور وغل جاری تھا اور اس کے ساتھ ہی ارنو کے جنون میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ وہ اب زور زور سے دروازے پر ٹھوکر مارنے لگا تھا۔ لگتا تھا کہ دروازہ بس کچھ ہی دیر کا مہمان ہے۔ وہ اتنا مضبوط نہیں تھا کہ ٹھوکریں برداشت کرسکے۔

بالآخر دروازہ چرچرا اٹھا۔ وہ کسی بھی لمحے ٹوٹ کر گرنے والا تھا۔ دوسری طرف ڈینگ پوشور کرتے کرتے تھک چکی تھی۔ اس کی آواز بیٹھنے لگی تھی۔ لیکن جواب میں

اسے کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ مکان کے باہر سناٹا تھا اور مکان کی اندر قیامت مچی ہوئی تھی۔ ارنو دروازے کو ٹوٹتا ہوا دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگا تھا۔ اس کی ہنسی اس وقت کسی درندے کے غراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ دروازہ کسی بھی لمحے گرنے والا تھا کہ ٹھیک اسی وقت ایک چنگھاڑ سنائی دی۔ یہ چنگھاڑ بوما کی تھی۔ اسی ہاتھی کی چنگھاڑ تھی جو ڈینگ پو کا محافظ تھا۔

ہاتھی کی چنگھاڑ سنتے ہی ڈینگ پو کے بدن میں جیسے بجلی بھر گئی۔ وہ تڑپ کر دوبارہ کھڑکی کے پاس آئی اور دوبارہ اسی جوش و خروش کے ساتھ کچھ کہنے لگی۔ ہاتھی کی چنگھاڑ سن کر ارنو کی طرف کچھ دیر کے لیے خاموشی طاری ہوگئی۔ جیسے وہ خوف زدہ ہو گیا ہو۔ اس کے بعد وہ پھر شیری اور ڈینگ پو کو گالیاں دینے لگا۔ اور دروازے پر زور زور سے ٹھوکریں مارنے لگا۔ اس کے جنون میں اچانک شدت پیدا ہوگئی تھی۔ شیری اس دوران دروازے کے برابر دیوار سے چپک کر کھڑی ہوگئی تھی۔ ارنو طیش میں آ کر پھر گولیاں چلا سکتا تھا۔

لیکن ارنو کو گولیاں چلانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ دروازہ اکھڑ کر اندر ہی گرا تھا۔ دروازے کے گرتے ہی دونوں لڑکیاں ایک دوسرے سے چمٹ گئیں۔ ڈراپ سین ہونے والا تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی ارنو بھی جیسے اڑتا ہوا اندر آ گرا تھا۔ اس نے مڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھا اور پستول والا ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں خون برسا رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ اٹھایا اور اسی وقت جیسے کمرے میں زلزلہ آ گیا ہو۔

وہ چنگھاڑ اتنی ہی خوف ناک تھی کہ شیری کا دل جیسے اچھل کر اس کے حلق میں آ گیا۔ سامنے والا دروازہ اور اس کی دیواریں یوں بیٹھ گئی تھیں جیسے گتے کی بنی ہوئی تھیں۔ ان سے کچھ ہی فاصلے پر اس لحیم شحیم ہاتھی کا مہیب وجود موجود تھا۔ اس کی سونڈ پھرے ہوئے اژدھے کی طرح لہرا رہی تھی۔ ڈینگ پو کی آواز پر وہ کسی طوفان کی طرح دوڑتا ہوا اس کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ دیواریں بیٹھتی چلی جا رہی تھیں اور اب چھت بھی کسی لمحے گرنے والی تھی۔

ارنو ہاتھی کو اپنے سر پر دیکھ کر سکتے میں رہ گیا۔ اس کا پستول والا ہاتھ اٹھارہ گیا تھا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے بدن سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ پھر اس نے ایک جھرجھری لی اور پستول کا رخ ہاتھی کی طرف کر دیا۔ شاید اس نے کوئی گولی بھی چلائی تھی۔ لیکن وہ گولی ہاتھی کے لیے ایسی ثابت ہوئی جیسے اس کے جسم پر کوئی مکھی آ کر بیٹھ گئی ہو۔ اس نے ایک بار پھر ایک مہیب چیخ بلند کی اور کوڑے کی طرح اپنی وزنی سونڈ ارنو پر دے ماری۔ ارنو نے ایک چیخ بلند کی اور شیری نے خوف سے کانپتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ڈراپ سین ہو گیا اور اس ڈرامے کا یہ ایسا انجام تھا جو ہر ایک کے لیے الجھنوں کا سبب بن گیا تھا۔

ہر طرف ٹوٹی ہوئی دیواریں، ہاتھی کی چنگھاڑ، سہمی ہوئی لڑکیاں اور ان کے درمیان ایک کچلی ہوئی لاش ارنو کے مرتے ہی یہ سارا طلسم ختم ہو گیا تھا۔ بوما نے اسے بہت بری طرح کچل کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے پستول کی گولیاں اس عظیم الشان ہاتھی کے لیے بے وقعت ثابت ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے وزنی پیروں سے اسے روند کر رکھ دیا تھا۔ ارنو کی موت کے بعد ڈینگ پو نے بڑی مشکلوں سے اس ہاتھی کو قابو میں کیا تھا۔ شیری اس سے شرمندہ تھی اس کی وجہ سے اس بے چاری کا گھر تباہ ہو گیا تھا۔ اس کے خواب ٹوٹ گئے تھے۔ لیکن ڈینگ پو کو اس کا غم نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ کیونکہ اس نے دور دیس کی ایک لڑکی کو بچا لیا تھا۔ اسے ایک درندے سے محفوظ کر دیا تھا۔

شیری کے لیے اب سب کچھ خواب کی طرح تھا۔ وہ جیسے خواب ہی کے عالم میں ڈونگی میں بیٹھ کر بنکاک پہنچی تھی۔ جہاں حکام اس کے منتظر تھے۔ اس کی کہانی ہر طرف پھیل چکی تھی۔ اس کی تلاش میں کئی ٹیمیں روانہ کی گئی تھیں۔ لیکن کسی کو اس کا سراغ

نہیں مل سکا تھا اور اب وہ خود ہی واپس آ گئی تھی۔

شیری کی بازیابی کی خبر اس وقت ہانگ کانگ میں مائیکل اور بون کو بھیج دی گئی۔ اسے فوراً ہی فوری پرواز کے ذریعے ہانگ کانگ روانہ کر دیا گیا۔ جہاں بہت سے لوگ اس کے منتظر تھے۔ ڈیوٹی تھا، کرائس تھا اور اس کے انکل تھے۔ ان لوگوں نے بڑے والہانہ طور پر اس کا استقبال کیا تھا۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی بھی تھیں اور ان میں خوشی کے رنگ بھی تھے۔ خود شیری جہاں ایک طرف نڈھال ہو رہی تھی، وہاں اسے نئی زندگی کی نوید نے خوشی سے بے حال کر دیا تھا۔

شیری کی واپسی ہو گئی تھی۔ ارنو مارا جا چکا تھا۔ لیکن یہ معمہ حل نہیں ہوا تھا کہ ارنو نے کس کے اشارے پر یہ سب کیا تھا۔ وہ ڈاکٹر کون تھا جس نے یہ جال بچھایا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ وہ پراسرار شخص اس ناکامی سے مایوس ہو کر وہیں واپس چلا گیا ہو جہاں سے وہ آیا تھا۔ یا پھر ہوسکتا تھا کہ وہ ایک نئے عزم اور نئی تیاریوں کے ساتھ شیری کا تعاقب کرے۔ ارنو مر گیا تھا تو کیا ہوا۔ ارنو جیسے ہزاروں مل سکتے تھے، ہوسکتا تھا کہ اس نے کسی اور مقام پر شیری کے لیے کسی اور ارنو کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اسی خدشے کا اظہار کرائس نے بھی کیا تھا۔ وہ ان دونوں کو ایئرپورٹ تک پہنچانے کے لیے آیا تھا۔ یہ دونوں اب دہلی جا رہے تھے۔ جہاں ڈیوٹی کو چھوڑنے کے بعد شیری کو پاکستان کے لیے روانہ ہو جانا تھا۔ کرائس نے اس وقت کہاں تھا۔

''خدا کا شکر ہے کہ تمہارے اردگرد منڈلاتے ہوئے سائے اب روشنی میں آ کر معدوم ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تم اپنا خیال رکھنا۔ اس دنیا میں جہاں ڈینگ پو جیسی لڑکیاں موجود ہیں۔ مجھ جیسے اور مائیکل جیسے لوگ موجود ہیں، وہاں ارنو اور ڈاکٹر جیسے لوگ بھی ہیں جو آسیب کی طرح تعاقب میں لگے رہتے ہیں ہوسکتا ہے کہ دہلی میں یا کراچی میں کوئی اور آسیب تمہارے انتظار میں ہو کیونکہ یہ معمہ ابھی حل نہیں ہوا ہے۔ وہ آدمی ارنو کی موت کے بعد غائب ہو گیا ہے۔ پولیس اس کا سراغ نہیں لگا سکی ہے۔ اس کی شخصیت اندھیرے میں ہے۔ اسی لیے تمہیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ یاد رکھو کہ زندگی میں صرف سکون ہی نہیں بلکہ بے سکونیاں بھی ہوتی ہیں اور بے سکونیاں زیادہ شدید ہوتی ہیں۔ یہ آدمی کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں۔''

''تو پھر میں کیا کروں کرائس۔'' شیری نے کہا۔

''کیا میں اپنی فرم سے استعفیٰ دے کر واپس چلی جاؤں۔''

''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس طرح اس آسیب سے تمہارا پیچھا چھوٹ جائے گا۔ نہیں شیری اس زندگی میں ہر قدم پر خطرے لگے ہوئے ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ آدمی کسی کے ہاتھ کو تھام کر، کسی کا سہارا لے کر اس الجھن سے نکلنے کی کوشش کرے۔ اس آسیب کا مقابلہ کرے۔ تنہائی تو کسی مکان کو بھی آسیب زدہ کر دیا کرتی ہے۔''

طیارے کی روانگی کے اعلانات ہونے لگے تھے۔ کرائس نے ایک بار پھر واضح اشارہ دے دیا تھا۔ وہ شاید ٹھیک ہی کہتا تھا کہ زندگی میں اگر آسیب سے بچنا ہو تو کسی کا سہارا لے لیا جائے پھر اس وقت پہلی بار اس نے خود کرائس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس ہاتھ میں محبت کی گرمی اور خلوص کی آنچ موجود تھی۔

''میں واپس آؤں گی کرائس۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''کیا تم میرا انتظار کرو گے؟''

''ہاں۔'' کرائس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''میں انتظار کروں گا۔''

کرائس سے رخصت ہو کر ڈیوٹی کے ساتھ جاتے ہوئے شیری کو جہاں ایک طرف احساس تھا کہ شاید وہ آسیب ابھی تک اس کے تعاقب میں ہو وہاں اس بات کا بھی اطمینان تھا کہ وہ آسیب اب اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا کیونکہ اس کی محبت اس کی حفاظت کے لیے اس کے پیچھے کھڑی ہوئی ہے۔

☆☆